سلسلۂ مطبوعات (۴۳)

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ

ارکانِ اربعہ

اسلامی عبادات
کتاب و سنت کی روشنی میں

- نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج کے اسرار و مقاصد کا بیان
- ان کے حقیقی فوائد و ثمرات کی تشریح
- انسانی زندگی پر ان کے اثرات و نتائج کا جائزہ
- اور — عیسائیت و یہودیت نیز ہندو مذہب کے ساتھ ان کا تقابلی مطالعہ!

★ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

ارکانِ اربعہ

اسلامی عبادات

کتاب وسنت

کی

روشنی میں

۱۔ عربی (بیروت) .. .. تیسرا ایڈیشن

۲۔ ترکی (انقرہ) .. .. دوسرا ایڈیشن

۳۔ اُردو (لکھنؤ) .. .. نواں ایڈیشن

۴۔ انگریزی (لکھنؤ) .. .. تیسرا ایڈیشن

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

اس کتاب میں اسلام کے چار بنیادی رکن نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج کی حقیقتوں اور حکمتوں سے بحث کی گئی ہے۔ اس میں ان کی تیح شرعی حیثیت، قانونی پہلو یعنی نظام اور انفرادی و اجتماعی زندگی میں ان کے مقام، اور اُن کے اُن مقاصد اور اسرار کی تشریح کی گئی ہے جو قرآن و حدیث سے ثابت ہیں، اور جن کو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں، دین کے حقیقت شناسوں اور تاریخ اسلام کے ممتاز اور معتبر علماء دین اور راسخین فی العلم نے عجمی تکلف و خیال آرائی، فلسفیانہ موشگافی اور شخصی انتہاپسندی اور مبالغہ آرائی کے بغیر اسکے اصل سرچشمہ سے ٹھیک ٹھیک اخذ کیا تھا، وہ نہ درآمد کئے ہوئے افکار و خیالات اور نہ اپنے زمانہ کے جدید رجحانات سے متاثر ہوئے تھے نہ ان ارکان کی حقیقتوں اور حکمتوں، ان کے مقاصد و اسرار اور ان کے اصول و طریقۂ کار کو اپنے اپنے زمانہ کے سیاسی فلسفوں اور معاشی و اجتماعی نظاموں کے پیمانہ سے ناپ رہے تھے۔

مصنف نے اس کتاب کی تالیف میں قرآن مجید کا از سرِ نو مطالعہ کیا، حدیث کے صحیح اور معتبر ماخذ کا دوبارہ جائزہ لیا، اور ان ارکان کے موضوع نیز ان کی تشریح و تفصیل اور ان کے مقاصد و اسرار کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر ایک نظر ڈالی اسے اس سلسلہ میں سب سے بڑی مدد ان ائمہ اسلام کی تحریروں اور تحقیقات سے ملی جن کو اللہ تعالےٰ نے اسلام کے فہم صحیح کا حصہ وافر عطا فرمایا تھا اور وہ افراط و تفریط اور تکلف و مبالغہ آرائی سے محفوظ رہ کر اس کی گہرائیوں تک پہونچ گئے تھے۔ اور جنھوں نے مقاصد شریعت رموز کتاب، اور اسرار احکام کے بیان اور تشریح میں وہی طریقہ اختیار کیا جو شریعت کو مطلوب ہے، اور جو ان اولین مسلمانوں کا شیوہ تھا جو اس کے براہِ راست مخاطب تھے اور جن کی زبان میں قرآن مجید نازل ہوا،

یہ لوگ دین کی گہری بصیرت، صحیح فہم، عمیق علم، مکمل عمل، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے قدم بہ قدم اتباع اور علم و عمل کے میدان میں جہد مسلسل کے جامع تھے، اس لئے اللہ تعالےٰ نے ان کے سامنے ہدایت کے تمام راستے کھول دئے اور دشوار چیزوں کو آسان بنا دیا۔ اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ[1] ۔

اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم انکو اپنے راستے ضرور دکھائیں گے اور بیشک اللہ خلوص والوں کیساتھ ہے۔

ایک طرف ان عبادات کی روح ان کے سارے وجود میں جاری وساری تھی اور وہ اس رنگ میں پوری طرح رنگ چکے تھے، دوسری طرف وہ ان علوم کے قلب و جگر میں اتر گئے تھے اور اس میں بھی ان کو مرتبہ کمال حاصل تھا جن کے بغیر ان اسرار و رموز تک رسائی ناممکن تھی، انھوں نے صدق و اخلاص سے اس پر عمل کیا تھا اور اعلیٰ درجہ کی بصیرت ذہانت، گہرائی اور دقت نظر کے ساتھ اس کی روح و حقیقت کو سمجھا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان عبادات کے مضامین و معانی، اسرار و رموز اور حقائق و مضمرات بے ساختہ

---

[1] العنکبوت - ۶۹

ان کی زبان سے ادا ہوئے۔

مصنف کو اس سلسلہ میں سب سے زیادہ فائدہ حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی مایۂ ناز کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" سے ہوا جو اپنے موضوع پر بے نظیر اور منفرد کتاب ہے، شاہ صاحب نے ان چاروں ارکان سے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کا جوہر اور عطر اس کتاب میں آگیا ہے،

اس کتاب میں سب سے پہلے قرآن و حدیث کو اپنے سامنے رکھا گیا، اور ان دونوں چیزوں میں ان ارکان کی روح اور حقیقت اور مقاصد و طریقۂ کار کے بارہ میں جو کچھ آیا ہے اس کا مطالعہ کیا گیا، پھر ائمۂ اسلام کی کتابوں میں ان کی جو تفسیر بیان کی گئی ہے اس سے استفادہ کیا گیا، اس کے بعد اپنی کم مائگی و بے بضاعتی کے باوجود اللہ تعالےٰ نے ان ارکان کی حقیقتوں اور حکمتوں کے جو پہلو اپنے لطف و کرم سے آشکارا فرمائے اور ان کے اسرار و معانی (جن کا زندگی سے گہرا تعلق ہے اور جن سے ذہن و دماغ کی بہت سی گرہیں کھلتی ہیں اور بڑے بڑے مسائل حل ہو جاتے ہیں) کے فہم کا جو حصہ عطا فرمایا گیا، اس کے پیش کر دینے میں بھی کوئی حرج نہیں سمجھا گیا، اسی طرح بعض متاخرین و معاصر اہلِ علم کے اقتباسات پیش کرنے میں بھی تامل نہیں ہوا، بایں ہمہ اس کی کوشش کی گئی کہ کتاب کے علمی، ادبی اور عصری اسلوب میں کوئی فرق نہ آئے اور طرز بیان میں کسی طرح کی خشکی اور ژولیدگی پیدا نہ ہونے پائے۔ خدا کا شکر ہے کہ محض اس کے فضل سے یہ کتاب قدیم و جدید دونوں فوائد کی حامل ہے، اور اس موضوع پر پورے اسلامی کتب خانہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے اسکی نمائندگی کر سکتی ہے، اس میں جدید اسلامی نسل کے سامنے ان حقائق کو نئے طریقہ سے پیش کیا گیا ہے جو متقدمین کی کتابوں اور ان کے قدیم اسلوب سے نامانوس اور متوحش ہونے کی وجہ سے انکے علمی فیوض اور رشحات قلم سے روز بروز محروم ہوتی چلی جارہی ہے یہ ہماری نئی نسل کیلئے بڑے خطرہ کی علامت، اسلاف کے حق میں سخت کوتاہی اور اس عظیم اسلامی کتبخانہ اور علمی ورثہ کی ناقدری کے مرادف ہے جس کا مقابلہ دنیا کی کسی قوم کا مذہبی کتبخانہ نہیں کر سکتا۔

اس امت نے جس طرح عبادات کے اشکال اور احکام و قوانین بحفاظت اپنی آئندہ نسلوں تک

پہونچائے ہیں اسی طرح اس نے انکی حقیقت اور روح اور ان کی کیفیات و اثرات بھی ورثہ کی طرح ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل کی ہیں، یہ دونوں چیزیں بغیر کسی وقفہ اور خلا کے مسلسل اور متواتر طریقہ پر ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتی رہیں اور آج بھی یہ میراث اسی طرح محفوظ، مکمل اور قابل عمل ہے، اب کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ ان ارکان میں سے کسی رکن کا کوئی ایسا اور نیا مفہوم ایجاد کرے جس سے یہ امت اپنی پوری تاریخ میں نا آشنا رہی، اس کو اس کی بھی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ باہر سے کوئی لباس درآمد کر کے یا مستعار لے کر ان کو زبردستی پہنانے کی کوشش کرے،

اس درمیان میں مصنف کو خیال آیا کہ وہ ان دوسرے مذاہب میں بھی ان عبادات کی نوعیت کا مطالعہ کرے . . . . جو تاریخ کے کسی نہ کسی دور میں اور کسی نہ کسی طریقہ سے آسمانی شریعت سے اپنا رشتہ جوڑتے ہیں اور جن کو موجودہ دنیا کی ایک کثیر آبادی اب بھی اپنا مذہب مانتی ہے چنانچہ ان مذاہب کی عبادتوں، طور طریقوں ان کے تاریخ و فلسفہ اور احکام و تعلیمات کا موازنہ اسلام اور شریعت اسلامی کے احکام اور اس کے فلسفہ اور اصول و قوانین سے کیا گیا، اور اس سلسلہ میں ان مذاہب کے مستند مراجع و مآخذ پر اعتماد کیا گیا، جو خود ان مذاہب کے علماء و مصنفین کی نظر میں حجت اور لائق شہادت ہیں، اسی طرح اسلام کے چاروں ارکان کے سلسلہ میں زیادہ تر قرآن و حدیث پر بھروسہ کیا گیا اور کہیں کہیں ائمہ اسلام کی کتابوں پر، اور یہ کوشش کی گئی کہ موازنہ غیر جانبدارانہ، غیر جذباتی، اور دیانت داری اور اصول علمی پر مبنی ہو اور اس کا وہ مغز اور جوہر ہاتھ آجائے جو ان مذاہب کے مقننین اور فقہاء کے نزدیک بھی لائق اعتبار ہو،

یہ ایک بڑا نازک اور دشوار کام تھا اس لئے کہ ان مذاہب کا دینی اور فقہی نظام مسلمانوں کے دینی اور فقہی نظام سے بہت مختلف ہے اور اس کا طرز آغاز کرنے سے بالکل جدا ہے۔ وہاں اس درجہ ابہام الجھاؤ، اضطراب، اور ایک ایسا زبردست اور ناقابل عبور علمی خلا نظر آتا ہے جس سے واسطہ شریعت اسلامی

کی تاریخ اور فقہ و شریعت کی کتابوں میں بالکل نہیں پڑتا، اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اس کتاب میں وہ تقابلی مطالعہ آگیا ہے جو کسی نہ کسی حد تک اس خلا کو پورا کرتا ہے، جو اس موضوع کی قدیم کتابوں میں عام طور پر پایا جاتا ہے،

اس موازنہ اور تقابلی مطالعہ کی ضرورت اس لئے بھی زیادہ تھی کہ ایک مسلمان اسلام کی دولت اور قرآن کی نعمت کا صحیح اندازہ اس وقت تک کرہی نہیں سکتا اور اس کا ٹھیک طور سے شکر ادا ہی نہیں کرسکتا جب تک اسلام اور دوسرے مذاہب کی عبادتوں کی شکلیں اس کی نظر کے سامنے نہ ہوں، ان عقائد اور اصول و مبادی کا یہاں ذکر ہی نہیں جن پر اسلام کے عقیدہ اور علم کلام کی پوری عمارت قائم ہے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یوشك أن ينقض الاسلام عروة عروة من نشأفي الاسلام لا يعرف الجاهلية (قریب ہے کہ وہ شخص اسلام کی ایک ایک کڑی علیحدہ کردے جس نے اسلام ہی میں آنکھیں کھولیں اور جاہلیت سے بالکل ناآشنا ہے)

اس میں شبہ نہیں کہ ایک بڑا وسیع اور ترقی پذیر موضوع ہے، اس میں بحث و نظر اور غور و فکر کی بڑی جولان گاہ ہے اور اس سلسلہ کے علمی ذخائر و تصنیفات اور معلومات میں برابر اضافہ ہو رہا ہے اور نئی نئی کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں، مصنف کتاب بھی ان کے مطالعہ و استفادہ کے لئے تیار ہے اور وہ آئندہ اشاعتوں میں (اگر زندگی نے وفا کی) ان سے فائدہ اٹھاتا رہے گا۔

ایک اور چیز جس نے مصنف کو مختلف امراض، گوناگوں مشغولیتوں، اور متنوع ذمہ داریوں کے باوجود اس کتاب کی تصنیف پر آمادہ کیا وہ یہ ہے کہ ان ارکان کی روح ان کی حکمتوں اور حقیقتوں، مصالح و فوائد اور ان کے مقاصد کو سمجھنے اور بیان کرنے میں عرصہ سے ایک عجیب قسم کا انتشار، اور بے راہ روی نظر آرہی ہے، ان کو بڑی جسارت، بے باکی اور بے تکلفی کے ساتھ عصر حاضر کے فلسفوں، اقتصادی اور سیاسی مکاتب خیال اور ان کی محدود اصطلاحات و تعبیرات کا پابند یا خوشہ چین بنایا جارہا ہے، اس کی وجہ سے اس کا

گہرے اور اہم حقائق و مقاصد، اس کی طاقت وجوہر اور باہمی مزاج اور روح کو پھر سے ابھارا جائے اور اسکے اہم پہلو لوگوں کی نگاہوں کے سامنے لائے جائیں۔

اسکے بعد مصنف کو دو سال رمضان سے متعلق "المسلمون" ہی کی فرمائش پر روزہ اور اسکے مقاصد پر دو مقالے لکھنے کا موقع ملا[1] اسوقت یہ تحریک پیدا ہوئی کہ رمضان اور حج کے ان مقالات کیساتھ نماز اور زکوٰۃ کا حصہ بھی شامل کر دیا جائے اسطرح رفتہ رفتہ اس کتاب کی پوری تصویر سامنے آئی اور مصنف کے دل و دماغ اور اعصاب پر اسطرح چھا گئی کہ اس نے کسی اور تصنیفی کام یا علمی تحقیق کا موقع ہی نہ دیا، پورا ایک سال اس طرح گزرا کہ اس موضوع پر مطالعہ و غور و فکر کرنے اور اس کے قدیم ماٰخذ پر نظر ڈالنے کے سوا اور کوئی مشغلہ نہ تھا جب متعلقہ ماٰخذ کا مطالعہ، اور نقل و اقتباس کا کام ختم ہو گیا تو پھر خدا کی توفیق اور مدد سے ناچیز مصنف نے اس کتاب کا مسودہ لکھوانا شروع کیا، اس زمانۂ تصنیف میں مصنف نے سارا وقت اسی کتاب کے موضوع، مضامین و مندرجات کے ماحول اور اسکی دنیا میں بسر کیا۔ یہ مصنف کی افتاد طبع اور شاید ایک غیبی انتظام ہے کہ اس کے ذہن و دماغ پر کتاب کا موضوع اس طرح طاری ہو جاتا ہے کہ وہ کسی اور مضمون و موضوع، اور فکر و خیال کی گنجائش نہیں چھوڑتا، یہ ذہنی استغراق و اعتکاف جہاں مصنف کیلئے جسمانی طور پر مکلف ہوتا ہے، کتاب کی تکمیل اور مرکزیت خیال میں بہت مدد معاون ثابت ہوا ہے،

مصنف خود لکھنے پڑھنے سے بڑی حد تک معذور ہے، اس لئے اس کتاب کے املا، احادیث کی تخریج دوسرے مذاہب کے سلسلہ میں معلومات کے حصول اور مواد کی تلاش میں اس کو اپنے دوسرے عزیزوں اور دوستوں سے مدد لینی پڑی، اس سلسلہ میں سب سے زیادہ شکریہ کے مستحق عزیزی نثار الحق ندوی، مولوی تقی الدین ندوی، مفتی محمد ظہور صاحب ندوی، عزیزی علی آدم افریقی، محمد سعید افریقی اور عزیزان نذر الحفیظ ندوی و غیاث الدین ندوی ہیں، انگریزی کتابوں کے طویل طویل اقتباسات کے ترجمہ میں سب سے زیادہ مدد محترمی شاہد علی صاحب ایم۔ اے (سابق وائس پرنسپل کالون کالج لکھنؤ و حال استاد دار العلوم ندوۃ العلماء) سے ملی اللہ تعالیٰ نے

---

[1] کتاب کی تالیف کے وقت "المسلمون" کے ان مضامین کو اصل میں شامل کرتے ہوئے بہت بڑا اضافہ کیا گیا ہے۔

ان سب کو مصنف اور ناظرین کتاب دونوں کی طرف سے بہترین صلہ عطا فرمائے۔

اس کتاب کا پہلا عربی ایڈیشن دارالفتح بیروت سے ۱۳۸۷ھ میں شائع ہوا تین ہی چار مہینے کے عرصہ میں یہ پہلا ایڈیشن ختم ہوگیا ناشر نے اطلاع دی کہ دوسرا ایڈیشن عنقریب شائع ہونے والا ہے۔ اگر مصنف کو نظرثانی کرنی ہو تو کرلی جائے کیونکہ پہلے ایڈیشن میں طباعت کی غلطیاں بہت تھیں، لیکن قبل اس کے کہ مصنف نظرثانی سے فارغ ہو، کتاب کی طلب کی بنا پر ناشر نے اسکو آفسٹ سے دوبارہ شائع کردیا۔ اور غلطیاں جوں کی توں رہیں، ممکن ہے کہ ان سطور کی تحریر کے وقت تک کتاب کا تیسرا ایڈیشن بھی شائع ہوگیا ہو۔ ایک سال کے عرصہ میں کتاب کا ترکی میں ترجمہ ہو کر قونیہ سے شائع ہوگیا۔ ہندوستان میں "معارف" "برہان" اور "صدق جدید" نے ایسے الفاظ میں کتاب پر تبصرہ کیا جو تصنیف و مصنف دونوں کی حیثیت سے بلند تھے۔

اردو ترجمہ کی خدمت مصنف نے اپنے عزیز برادرزادہ مولوی محمد الحسنی مدیر البعث الاسلامی کے سپرد کی جن کو مصنف کے طرز تحریر اور ذوق و فکر سے خداداد مناسبت ہے، اور ایک عرصہ سے اس کے عربی مضامین و تحریروں کا ترجمہ کرتے رہتے ہیں، انھوں نے حسب توقع یہ فرض بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا، مصنف نے نظرثانی کے وقت اس میں کہیں کہیں بعض جدید معلومات کا اضافہ کیا، اور بعض اغلاط کی تصحیح کی، اب وہ ترجمہ زیادہ مکمل اور قابل اعتماد شکل میں اردو داں طبقہ کیلئے شائع کیا جارہا ہے۔ آیات کا ترجمہ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کی تفسیر قرآن سے ماخوذ ہے۔ اگر کہیں کسی مسنون دعا کے ترجمہ کی ضرورت پیش آئی تو وہ بھی انھیں کے "ترجمہ مناجات مقبول" سے لیا گیا ہے۔

یہ کتاب ایک طویل مطالعہ کا نچوڑ اور مسلسل غور و فکر کا نتیجہ ہے اور اس سے کم از کم ایک عظیم الشان اور اہم موضوع پر غور و خوض اور فکر و نظر کا نیا دروازہ کھلتا ہے، والحمد للہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصالحات

ابوالحسن علی ندوی
دائرہ شاہ علم اللہ
رائے بریلی۔

نماز

وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ

(اور نماز کی پابندی رکھو اور شرک کرنے والوں میں مت رہو۔) سورہ روم ۳۱۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم ؁

نماز کی حقیقت

اور اُس کے فوائد و اسرار!

رب اور بندہ کا تعلق نماز کی حقیقت اور اس کی اہمیت و ضرورت کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے اور اس کا صحیح لطف بھی وہی اٹھا سکتا ہے جو اس عجیب و غریب، بلند و لطیف اور ناقابل قیاس تعلق سے پوری طرح آگاہ ہو جو رب اور بندہ کے درمیان قائم ہے، یہ ایک ایسا تعلق ہے جس کی نظیر کسی اور جگہ نہیں مل سکتی، اس کو اس کائنات کی کسی دو ہستیوں کے باہمی تعلق یا محض صانع و مصنوع، حاکم و محکوم، قوی و ضعیف، مفلس و محتاج اور سائل و معطی کے تعلق پر بھی قیاس نہیں کیا جا سکتا اسلئے کہ یہ تعلق ان تمام رشتوں سے زیادہ لطیف اور بلند اور ان سب سے زیادہ گہرا مستحکم، جامع اور وسیع ہے،

تعلقات صفات کے تابع ہیں رب اور بندہ کے اس تعلق کو سمجھنے کیلئے خدا کی صفات سے واقفیت بھی ضروری ہے اسلئے کہ تعلقات ہمیشہ

تعداد اس کی سانسوں سے زیادہ اور اس کی ضرورتوں کی فہرست اس کی عمر سے زیادہ طویل ہے، اور یہ محدود دنیا اس کی آرزوؤں کی تکمیل کے لئے ناکافی ہے۔

لیکن اسی عجیب و غریب تضاد میں اس کی عالی ہمتی و حوصلہ مندی، سیماب وشی و بے قراری اور اسی "شوقِ جنوں" اور "ذوقِ طلب" میں اس کی عزت و سربلندی اور خلافتِ الٰہی سے سرفرازی کا راز پنہاں ہے اور یہی وہ چیز ہے جس نے اس کو وہ بارِ امانت اٹھانے پر آمادہ کیا جس کی معذرت آسمان، زمین، پہاڑ سب کر چکے تھے۔ "فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا"[۵] (سو ان سب نے انکار کیا اس سے کہ اسے اٹھائیں اور وہ اس سے ڈرے اور اسے انسان نے اپنے ذمہ لے لیا۔ بیشک وہ بڑا ظالم ہے بڑا جاہل ہے)

فطری انس و محبت

انسان کا خمیر عشق و محبت کے ساتھ اٹھا ہے، حواسِ خمسہ کے ساتھ ساتھ جن سے وہ اپنی مادی زندگی میں فائدہ اٹھاتا ہے، اس کو ایک عام اور بھی عطا کیا گیا ہے جس کو ہم عشق و محبت یا انس و الفت کا حاسہ کہہ سکتے ہیں، یہ حاسہ طاقتور بھی ہو سکتا ہے اور کمزور بھی، آشکارا بھی ہو سکتا ہے اور مستور بھی، لیکن اس سے محرومی صرف اس بات کی علامت ہے کہ انسان یا تو اپنی استعداد کھو چکا ہے یا اپنی فطرت سے منحرف ہو کر جمادات میں داخل ہو گیا ہے، وہ وفا شعار بھی ہے اور زود رنج بھی، اس کے جذبات متلاطم اور اس کے احساسات نازک ہیں، وہ جمال و کمال کی طرف اس طرح بے ساختہ کھنچتا ہے کہ دنیا کی کوئی مخلوق اس طرح نہیں کھنچتی، وہ اپنے محبوب و مطلوب پر اپنی جان اپنی محبت، اپنا خلوص، اپنے جذبات اور اپنا سب کچھ قربان کرنے پر تیار رہتا ہے، عشاق و اہل محبت کے سچے واقعات اسی فطرتِ انسانی کے آئینہ دار، اہلِ معرفت اہلِ درد کی پوری تاریخ اسی جذبہ کا اظہار، اور دنیا کا سارا جذباتی و وجدانی لٹریچر، اور غزل کا سارا سرمایہ (جس سے کسی ملک کا ادب بھی

---

[۵] سورۃ الاحزاب:۔ ۷۲

محروم نہیں) اسی "سوز دروں" کا مرہون منت اور اسی "ذوقِ جنون" کا احسان مند ہے۔

جذبۂ تسلیم و رضا

ان جذبات کے ساتھ اس کو ایک اور جذبہ بھی ملا ہے، اور وہ ہے سرافگندگی، رضا و تسلیم، خشوع و خضوع اور سجدۂ تعظیم کا جذبہ! یہ جذبہ تاریخ کے ہر دور میں اور انسانیت کے ہر طبقہ میں اس کا رفیق رہا اور وہ کبھی اس سے آزاد نہیں ہو سکا، اپنے ابتدائی دور میں (اور یہ ابتدائی دور دنیا کے بعض حصوں میں اب تک موجود ہے) وہ پتھروں، درختوں اور دریاؤں کے سامنے اپنی پیشانی ٹیک کر اس جذبہ کی تسکین کرتا تھا، آگ، سورج، چاند اور ستاروں کی عبادت کرتا تھا؛ فطرت کے مظاہر اور کائنات کی قوتوں، کاہنوں اور راہبوں، عالموں اور صوفیوں اور جنوں اور روحوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا تھا اور ہر اس چیز کے سامنے سر جھکا دیتا تھا جو اس کے علم سے ماوراء اور اس کے فہم سے بالاتر نظر آتی تھی، اور آج بھی اپنے وسیع تہذیب و تمدن، اپنی ترقی پسندانہ عقلیت، اپنے طویل و عریض دعووں، اپنے تکبر و سرکشی اور خود رائی و خود پرستی اور اپنے مسلسل انقلابات اور بغاوتوں اور آزادی و ترقی کی ناکام کوششوں کے باوجود وہ حکام و سلاطین کا پرستار اور پارٹیوں کے لیڈروں، حکومتوں کے سربراہوں، نیز اپنے خود ساختہ فلسفوں اور نظاموں کے سحر میں اسی طرح گرفتار ہے، اس "ثقافت و ترقی" اور "وسیع النظری" کے دور میں بھی وہ موجدین و مجتہدین، مفکرین و مصنفین، اہلِ جاہ و ثروت، اربابِ حکومت، شعراء و ادباء، مصنفوں اور فنکاروں اور عبقری و غیر معمولی ذہانت رکھنے والے انسانوں سے اسی طرح مرعوب ہے اور اس کی مرعوبیت میں محبت و عشق، تقدیس و تعظیم اور فنائیت کا وہی عنصر کارفرما ہے جو تاریخ کے کسی قدیم دور میں تھا، اور اس کا سبب یہی ہے کہ وہ قدرتی طور پر ایک محبت کرنے والی، جھکنے والی، اور اپنے مطلوب و محبوب کے سامنے اپنے وجود کو فنا کر دینے والی مخلوق ہے، اور یہ جذبہ اس کی سرشت میں داخل اور اس کے خمیر میں شامل ہے۔

ایک مثالی وجود یا معیاری ہستی کی ضرورت

اس کو ایک ایسے معیارِ کامل، ایک ایسی مثالی ہستی اور قرآن کی تعبیر میں "مثلِ اعلیٰ" کی ضرورت ہے

جو جمال و کمال کے لحاظ سے فہم و ادراک سے بالاتر ہونے کے لحاظ سے اور اقتدار و قدرت کے لحاظ سے اسکے اس فطری جذبہ کی تسکین اور اس کے مطالبات و مقاصد کی تکمیل کر سکے

خدا اور انسان کے تعلق کی صحیح اور معقول شکل

سب سے پہلے ہم کو اپنے پروردگار کے ان تمام صفات کو جن کو ہم قوت و قدرت، علم و احاطہ، رحم و کرم، جود و عطا، قبول و استجابت، اور قرب و معیت سے تعبیر کرتے ہیں، نیز قرآن مجید نے اسکے جو صفات عالیہ اور اسمائے حسنیٰ بیان کئے ہیں اور ان کی جو بلیغ و معجزانہ تفصیل و تشریح کی ہے اس کو ذہن میں تازہ کرنا چاہیئے پھر انسان کے ان صفات کو مستحضر کرنا چاہیئے جس کا خلاصہ ضعف و عجز اور فقر و افلاس کے دو لفظوں میں بیان کیا جا سکتا ہے پھر اس کی ہمت کی بلندی اور بلند پروازی پر بھی ایک نظر ڈالنی چاہیئے جو کسی اور مخلوق میں ودیعت نہیں کی گئی، مادیت و روحانیت کے دونوں شعبوں میں اس کی نہ مٹنے والی بھوک اور نہ بجھنے والی پیاس کو دیکھنا چاہیئے جس میں اس نے حیوانات کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے، اس کی ضرورتوں، خواہشوں، فرمائشوں اور آرزوؤں کی نہ ختم ہونے والی فہرست کو دیکھنا چاہیئے جس کی کثرت و تنوع، بلند نازک خیالی اور دقیقہ رسی میں اس کا کوئی شریک نہیں، پھر اس کی اس محبت و وارفتگی، جذبۂ سرافگندگی اور شان تسلیم و رضا اور اندازِ دعا کو دیکھنا چاہیئے جو اس کے رگ رگ میں پیوست ہے،

ان سب کھلی ہوئی حقیقتوں کے بعد کیا ایک انسان کو اس کی احتیاج نہیں کہ وہ اپنے اُس پروردگار کے حضور میں مسلسل طاعت و عبادت، مسلسل رکوع و سجود اور مسلسل دعا و مناجات کی حالت میں رہے جو جوادِ مطلق اور مالک الملک ہے اور جو اس کی ہر ضرورت (خواہ وہ زبان قال سے بیان کی گئی ہو یا زبانِ حال سے) پوری کرتا ہے "وَاٰتٰكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا"[1] (اور تم کو ہر اس چیز میں سے دیا جو تم نے مانگی اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو انھیں شمار نہ کر پاؤ گے)

---

[1] سورہ ابراہیم - ۳۴

جو ایسے ایسے نازک و مستور احساسات، بھولے بسرے خیالات اور قدیم و فراموش شدہ آرزوؤں اور تمناؤں سے واقف ہے جن کو انسان نے خود فراموش کر دیا ہے یا مایوس ہو کر ان سے دستبردار ہو گیا ہے ایسے ایسے نازک خیالات جن میں بسا اوقات دل کو عقل کی شرکت بھی گوارا نہیں ہوتی؛

وَاعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ يَحُولُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهِ[1]

اور جانے رہو کہ اللہ آڑ بن جاتا ہے درمیان انسان اور اسکے قلب کے

يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ[2]

(اللہ) جانتا ہے آنکھوں کی چوری کو اور جو کچھ سینہ میں چھپا ہوا ہے اسکو بھی۔

وَإِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَإِنَّهُ يَعْلَمُ السِّرَّ وَأَخْفَى[3]

اور اگر تو پکار کر بات کہے تو وہ چپکے سے کہی ہوئی بات اور اس سے زیادہ چھپی ہوئی بات کو جانتا ہے۔

جو ہر قریب سے زیادہ قریب، ہر سننے والے سے زیادہ سننے والا اور جواب دینے والا ہے؛

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ۔[4]

اور جب آپ سے میرے بندے میرے باب میں دریافت کریں تو میں تو قریب ہی ہوں دعا کرنیوالے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھ سے دعا کرتا ہے پس لوگوں کو چاہئے کہ میرے احکام کو قبول کریں اور مجھ پر ایمان لائیں عجب نہیں کہ ہدایت پا جائیں۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ[5]۔

اور ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور ہم (خوب) جانتے ہیں ان وسوسوں (تک) کو جو اسکے جی میں آتے رہتے ہیں، ہم تو اس کی رگ گردن سے بھی بڑھ کر اس کے قریب ہیں۔

وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَا تُبْصِرُونَ[6]

اور ہم تم سے بھی زیادہ قریب اس شخص کے ہوتے ہیں، البتہ تم نہیں سمجھتے۔

---

[1] سورہ انفال۔ ۲۴ [2] سورہ مومن۔ ۱۹ [3] سورہ طٰہٰ۔ ۷ [4] سورہ بقرہ۔ ۱۸۶ [5] سورہ قٓ۔ ۱۶ [6] سورہ واقعہ۔ ۸۵

جس کو گڑ گڑا کر سوال کرنے والا اور رو رو کر دامن تھامنے والا اور ہر جگہ سے کٹ کر اس کے در پر پڑا رہنے والا مستغنی و بے نیاز انسان سے زیادہ محبوب ہے،

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ[1] ۔

اور تمہارے پروردگار نے کہا ہے کہ مجھے پکارو میں تمہاری درخواست قبول کرونگا، جو لوگ میری عبادت سے سرتابی کرتے ہیں وہ عنقریب جہنم میں ذلیل ہو کر داخل ہوں گے۔

ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ[2]

اپنے پروردگار سے دعا کرو عاجزی کے ساتھ اور چپکے چپکے بیشک وہ حد سے نکل جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "انہ من لم یسأل اللہ یغضب علیہ"[3] (جو اللہ تعالےٰ سے سوال نہیں کرتا اللہ تعالےٰ اس سے ناراض ہوتا ہے۔)

پوری کائنات محو عبادت اور سربسجود ہے

جب سے یہ کائنات وجود میں آئی اس وقت سے سورج روشنی زندگی اور حرارت کا منبع ہے اور اپنا فرض بے کم و کاست اور بے چون وچرا انجام دے رہا ہے، چاند اپنی آب و تاب اور اپنی رفتار کے ذریعہ مہینوں اور سالوں کا تعین کرتا ہے، پہاڑ ہزاروں سال سے اپنی اپنی ڈیوٹی پر کھڑے ہیں، درخت اپنی اپنی جگہ ایستادہ اور خدا کی عبادت میں مشغول ہیں اور اپنے سایہ اور پھل سے لوگوں کو فائدہ پہونچاتے ہیں، ہوا اس انسان کیلئے (جو کائنات کا سردار اور خلیفۃ اللہ فی الارض ہے) حیات کا پیغام لے کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتی ہے، بادل پانی بھر کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہونچاتے ہیں اور زمین کو نئی زندگی بخشتے ہیں۔ اس کی وجہ سے چشمے جاری ہوتے ہیں، انسان کی پیاس دور ہوتی ہے، فصلیں تیار ہوتی ہیں، اور زمین اپنا خزانہ اگل دیتی ہے، چوپائے اپنی ٹانگوں پر چلتے پھرتے دوڑتے بھاگتے اور گویا رکوع کی تصویر

---

[1] سورہ مومن۔ ۶۰ [2] سورہ اعراف۔ ۵۵ [3] روایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ترمذی (کتاب الادعیہ باب ما جاء فی فضل الدعاء)

نظر آتے ہیں، انسان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہونچاتے ہیں، بوجھ اٹھاتے ہیں، ان کے ذریعہ لوگ سردی سے بچاؤ کا سامان اور اپنے کھانے پینے کا انتظام کرتے ہیں، بہت سے جانور پیٹ کے بل چلتے ہیں اور ان سے بھی انسان کو مختلف فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ یہ تمام مخلوقات جو نہ دل رکھتے ہیں نہ عقل، ہر وقت اللہ تعالیٰ کی طاعت و عبادت میں مشغول ہیں، نہ ان کے یہاں نافرمانی ہے، نہ بغاوت، نہ سرکشی، نہ اکتاہٹ، نہ یہ اسٹرائک کرتے ہیں، نہ کبھی چھٹی لیتے ہیں گویا ہر وقت اور ہر حالت میں وہ سربسجود ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَسْجُدُ لَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَکَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ وَکَثِیْرٌ حَقَّ عَلَیْہِ الْعَذَابُ وَمَنْ یُّھِنِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنْ مُّکْرِمٍ اِنَّ اللّٰہَ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ [۱]

کیا تجھے خبر نہیں کہ اللہ ہی کو سجدہ (تسلیم) کرتے ہیں جو کوئی بھی آسمانوں اور زمین میں ہے اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور چوپائے اور کثرت سے انسان بھی، اور بہتوں پر عذاب (بھی) ثابت ہو گیا ہے اور جس کو اللہ ذلیل کرے اس کا کوئی عزت دینے والا نہیں، بیشک اللہ جو چاہے کرے۔

وَلِلّٰہِ یَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّۃٍ وَّالْمَلٰٓئِکَۃُ وَھُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ یَخَافُوْنَ رَبَّھُمْ مِّنْ فَوْقِھِمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ [۲]

اور اللہ ہی کی مطیع ہیں جتنی چلنے والی چیزیں آسمان میں ہیں اور جتنی زمین میں ہیں اور فرشتے بھی اور وہ اپنی بڑائی نہیں کرتے وہ ڈرتے رہتے ہیں اپنے پروردگار سے جو ان پر بالادست ہے اور وہ وہی کرتے ہیں جس کا انھیں حکم ملتا رہتا ہے۔

وَلِلّٰہِ یَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّکَرْھًا وَّظِلٰلُھُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ [۳]

اور اللہ ہی کے آگے جھکتے رہتے ہیں (سب) جتنے آسمانوں میں ہیں اور (جتنے) زمین میں ہیں (کوئی) ارادۃً (تو) اور (کوئی) جبراً (تو) اور ان کے سائے بھی صبح و شام کے وقت۔

---

[۱] سورۂ حج۔ ۱۸ [۲] سورۂ نحل۔ ۴۹۔ ۵۰ [۳] سورہ رعد۔ ۱۵

وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ[1] ۔

سورج اور چاند تک حساب کے (پابند) ہیں اور سبزیاں اور درخت دونوں (اسی کے) مطیع ہیں۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَاٰتٰكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ[2] ۔

اللہ وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور آسمانوں سے پانی اتارا پھر اس (پانی) سے (مختلف) پھل تمہارے لئے بطور رزق پیدا کئے اور تمہارے (نفع کیلئے) کشتی کو (اپنی قدرت کا) مسخر کردیا تاکہ وہ اس کے حکم سے سمندر میں چلے اور تمہارے (نفع کے) لئے دریاؤں کو (اپنی قدرت کا) مسخر کردیا، اور تمہارے (نفع کے) لئے سورج اور چاند کو (اپنی قدرت کا) مسخر کردیا جو دوام رکھنے والے ہیں، اور تمہارے (نفع کے) لئے رات اور دن کو (اپنی قدرت کا) مسخر کردیا اور تم کو ہر اس چیز میں سے دیا جو تم نے مانگی اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو انھیں شمار نہ کرپاؤگے، بیشک انسان بڑا ہی ناانصاف ہے، بڑا ہی ناشکرا ہے۔

یہ مخلوقات اپنے اشکال کے اختلاف وتنوع اور طرز عبادت کے فرق کے باوجود ایک ایسی نماز اور ایک ایسی حمد وتسبیح میں مشغول ہیں جو ان کے فرض منصبی اور ان کے مزاج کے ساتھ ہم آہنگ ہے اور جس کو صرف وہی سمجھ سکتا ہے جس کی چشم بصیرت اللہ تعالےٰ نے کھول دی ہو اور یہ مادی حجاب اٹھا لئے ہوں۔

---

[1] سورہ رحمن۔ ۶
[2] سورہ ابراہیم۔ ۳۲-۳۳-۳۴

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِیْهِنَّ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ اِنَّهٗ كَانَ حَلِیْمًا غَفُوْرًا۔[1]

اسی کی پاکی بیان کرتے ہیں ساتوں آسمان اور زمین اور جو کوئی بھی ان میں موجود ہیں اور کوئی بھی چیز ایسی نہیں جو حمد کے ساتھ اس کی پاکی نہ بیان کرتی ہو، البتہ تم ہی ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے ہو، بیشک وہ بڑا حلم والا ہے بڑا مغفرت والا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّیْرُ صٰٓفّٰتٍ، كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِیْحَهٗ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ بِمَا یَفْعَلُوْنَ۔[2]

کیا تجھے معلوم نہیں کہ اللہ کی تسبیح کرتے رہتے ہیں جو کوئی بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں اور پرند بھی جو پر پھیلائے ہوئے ہیں، ہر ایک کو معلوم ہے اپنی اپنی دعا اور اپنی تسبیح اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ یہ لوگ کرتے رہتے ہیں۔

اس کائنات میں انسان کا مقام اور دوسری مخلوقات سے اسکے امتیاز کا راز

انسان اپنی ان مذکورہ بالا خصوصیات، اپنی برتری و شرف، اپنی عقل اور اپنے قلب کی وجہ سے دوسری مخلوقات کی بہ نسبت اس بات کا زیادہ حقدار تھا کہ مسلسل حالتِ عبادت میں رہتا اور اپنا ہر لمحہ رکوع و سجود، حمد و تسبیح اور ذکرِ الٰہی میں گزارتا، اور کسی وقت بھی اس کی زبان اس کے ذکر سے غافل نہ ہوتی، جو عطیاتِ ربانی اس کے ساتھ مخصوص ہیں اور جن انعامات کا مستحق اس کو بنایا گیا ہے، جو بیشمار نعمتیں اس پر مینھہ کی طرح برستی رہتی ہیں ان سب کا تقاضا بلاشبہ یہی تھا کہ وہ عبادت کو ایک لمحہ کیلئے بھی ترک نہ کرتا اور نماز سے پلک جھپکنے کے برابر غافل نہ ہوتا اور ان فرشتوں کی طرح ہو جاتا جن کے متعلق قرآن مجید کا بیان ہے۔

---

[1] سورۂ بنی اسرائیل - ۴۴ [2] سورہ النور - ۴۱

وَلَہٗ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَمَنۡ عِنۡدَہٗ لَا یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ عَنۡ عِبَادَتِہٖ وَلَا یَسۡتَحۡسِرُوۡنَ ۔ یُسَبِّحُوۡنَ الَّیۡلَ وَالنَّہَارَ لَا یَفۡتُرُوۡنَ ۔ [1]	اور اسی کی ملک ہے جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہے، اور جو اس کے نزدیک ہیں وہ اس کی عبادت سے عار نہیں کرتے اور نہ وہ تھکتے ہیں، رات دن تسبیح کرتے رہتے ہیں موقوف نہیں کرتے ۔

لیکن چونکہ اس کو اس زمین پر اللہ کا خلیفہ بننا تھا اور نہایت نازک منصب پر فائز ہونا تھا اس لئے اس میں خواہشات بھی رکھی گئی ہیں اور کچھ ضرورتیں بھی اس کے ساتھ وابستہ کر دی گئی ہیں، اس میں جذبات بھی ہیں اور سوزِ محبت بھی، احساس الم بھی اور شعورِ مسرت بھی، ذوقِ جستجو اور شوقِ علم بھی، وہ زمین کے خزینوں اور دفینوں سے فائدہ اٹھانے اور ان کو اپنے مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی پوری صلاحیت و قابلیت رکھتا ہے، تعلیم اسماء کی جو خصوصیت و امتیاز اس کو حاصل ہے وہ دراصل اس کی فطری استعداد کا رمز اور خلافت ارضی کا مظہر ہے،

وَاِذۡ قَالَ رَبُّکَ لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَۃً ؕ قَالُوۡۤا اَتَجۡعَلُ فِیۡہَا مَنۡ یُّفۡسِدُ فِیۡہَا وَیَسۡفِکُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِکَ وَنُقَدِّسُ لَکَ ؕ قَالَ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ۔ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ کُلَّہَا ثُمَّ عَرَضَہُمۡ عَلَی الۡمَلٰٓئِکَۃِ ۙ فَقَالَ اَنۡۢبِـُٔوۡنِیۡ بِاَسۡمَآءِ ہٰۤؤُلَآءِ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ۔ قَالُوۡا سُبۡحٰنَکَ لَا عِلۡمَ لَنَاۤ	اور (وہ وقت یاد کرو) جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا میں زمین پر اپنا نائب بنانا چاہتا ہوں وہ بولے کیا تو اس میں ایسے کو بنائے گا جو اس میں فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا، درآں حالیکہ ہم تیری حمد کی تسبیح کرتے رہتے ہیں اور تیری پاکی پکارتے رہتے ہیں (اللہ نے) فرمایا یقیناً میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے، اور اللہ نے آدمؑ کو نام سکھلا دئے کل کے کل، پھر انھیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا،

---

[1] سورۃ الانبیاء ۔ ۱۹ ۔ ۲۰

اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ قَالَ یٰۤاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ[1]	پھر فرمایا بتلاؤ تو ان کے نام اگر تم سچے ہو، وہ بولے تو پاک ذات ہے ہمیں تو کچھ علم نہیں مگر ہاں وہی جو تونے ہمیں علم دے دیا، بیشک تو ہی ہے بڑا علم والا حکمت والا، (اللہ نے) فرمایا اے آدم بتلادو انھیں انکے نام، پھر جب انھوں نے انھیں انکے نام بتلا دئے تو فرمایا میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی چھپی ہوئی چیزیں جانتا ہوں اور جو کہ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو وہ سب جانتا ہوں۔
. . . .	
هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا۔[2]	وہ وہی (خدا) ہے جس نے پیدا کیا تمہارے لئے جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب۔
قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَةَ اللّٰهِ الَّتِیْۤ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ۔[3]	آپ کہئے اللہ کی زینت کو جو اس نے اپنے بندوں کے لئے بنائی ہے کس نے حرام کر دیا ہے اور کھانے کی پاکیزہ چیزوں کو؟

اس اہم اور نازک منصب کی ذمہ داریوں کو نباہنے اور اس خاص مقصد کی تکمیل کیلئے جس کیلئے اسکی تخلیق کی گئی، اس کو اجرام فلکی، پہاڑوں، نباتات جمادات اور حیوانات کی طرح مسلسل قیام، مسلسل رکوع، مسلسل سجود اور مسلسل تسبیح و ذکر کا پابند نہیں کیا گیا، اور اگر وہ کبھی اس کی کوشش کرے گا تو اس زمین پر اللہ تعالے کے خلیفہ کی حیثیت سے اپنی ناکامی کا ثبوت فراہم کریگا اور ان فرشتوں کے اعتراض کو حق بجانب ثابت کرے گا جنھوں نے اس کے بجائے اس بنا پر اپنی خدمات پیش کی تھیں

---

[1] سورۃ البقرہ - ۳۰ - ۳۱ - ۳۲ - ۳۳ - [2] سورۃ البقرہ - ۲۹ - [3] سورۃ الاعراف - ۳۲ -

اور اپنے کو خلافت کا مستحق سمجھا تھا کہ وہ ہمیشہ تسبیح و تحمید اور ذکر و عبادت میں مشغول رہتے ہیں "وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ"۔

موزوں طریقۂ عبادت

ان تمام باتوں کے پیش نظر انسان کیلئے ایک ایسے طرزِ عبادت یا نظامِ عبادت کی ضرورت تھی جو اسکی فطرت، اس کے فرائض منصبی، اس کائنات میں اسکے مرتبہ و مقام اور اس ذمہ داری اور فریضہ کے ساتھ ہم آہنگ ہو جو خلافت الٰہی کی صورت میں اس کے کاندھوں پر ڈالی گئی ہے، ایک طرف عبادت اس کیلئے ضروری بھی تھی، اسلئے کہ اس کی فطرت کا تقاضا اس کے وجود کا منشا، اسکے ضمیر کی آواز، اس کی شرافت و احسانمندی کا اظہار، انسانیت کی ضرورت اور قلب و روح کی غذا ہے، دوسری طرف یہ بھی ضروری تھا کہ یہ عبادت اس کے قد و قامت اور شخصیت کے مطابق اور اس کی نازک اور اہم حیثیت اور اس کائنات میں اسکے منفرد مقام کے ساتھ ہم آہنگ ہو اور اس لباس کی طرح ہو جو اس کے قد و قامت پر پوری طرح راس آئے اور زیب دے، نہ تنگ ہو، نہ ڈھیلا، نہ کم ہو نہ زیادہ۔

اس کی شخصیت کا لباس

نماز درحقیقت یہی لباس ہے جو ٹھیک اس کے وجود پر پورا اتر رہا ہے اور جس میں کسی قسم کی کوئی کمی بیشی نظر نہیں آتی،

أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ[1] ۝ — کیا وہی آگاہ نہ ہوگا جس نے پیدا کیا ہے؟ وہ تو (بڑا ہی) باریک بیں اور (پورا) باخبر ہے۔

إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ[2] ۝ — ہم نے ہر چیز کو (ایک خاص) انداز سے پیدا کیا ہے۔

نماز کی مقدار و تعداد میں تخفیف کا راز اور اسکے نفسیاتی فوائد و اثرات

حکمت الٰہی اور شریعت ربانی نے اس کیلئے

---

[1] سورۃ الملک - ۱۴ [2] سورۃ القمر - ۴۹

جو طریقہ اختیار کیا وہ ایک بلند منتہا کی طرف تدریج وتسہیل کے ساتھ بڑھنے کی معجزانہ مثال ہے، معراج میں پچاس نمازیں فرض کی گئیں پھر اس کو کم کر کے پانچ نمازوں تک لے آیا گیا[1]، اور یہ اس لئے کیا گیا تا کہ انسان کے ہمیشہ یہ پیش نظر رہے کہ اصل نماز پچاس ہی مقرر کی گئی تھی اور اللہ تعالے نے اس کو اس کا اہل سمجھا تھا کہ وہ اپنے وقت، قوت اور دل و دماغ کا اتنا بڑا حصہ اس کی عبادت میں صرف کرے، جو شخص اس بات کو مستحضر اور پیش نظر رکھے گا وہ ان پانچ نمازوں کو کبھی زیادہ نہ سمجھے گا، بلکہ یہ محسوس کریگا کہ وہ تو اس سے زیادہ کا اہل سمجھا گیا تھا اور اگر اللہ تعالے نے اس کیلئے یہ تخفیف نہ کی ہوتی تو وہ اسی پر عمل کرتا اور بے چون وچرا حکم بجالاتا لیکن اللہ تعالے نے اسکے ساتھ لطف وکرم کا معاملہ فرمایا اور ان پانچ نمازوں کو پچاس کے مساوی بنا دیا لیکن یہ پہلا حکم انسان کی عالی ہمتی اور بلند نظری پر مہمیز کا کام دینے کے لئے اب بھی کافی ہے،

قرآن میں اسکی ایک نظیر

ہمیں قرآن مجید سے بھی اس خیال کی تصدیق حاصل ہوتی ہے، پہلے مسلمانوں سے اس بات کا مطالبہ تھا کہ وہ اپنے سے دس گنا دشمن کے مقابلہ

---

[1] ایک طویل حدیث میں جس میں اسراء اور معراج کا مکمل واقعہ بیان کیا گیا ہے اور جس کو امام بخاری نے اپنی جامع صحیح میں درج کیا ہے، یہ الفاظ آئے ہیں۔ "مجھ پر اللہ تعالے نے ہر شب و روز کے لئے پچاس نمازیں فرض کیں میں جب اتر کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا تو انھوں نے پوچھا کہ آپکے پروردگار نے آپ کی امت پر کیا فرض کیا؟ .... میں نے کہا پچاس نمازیں! انھوں نے کہا۔ کہ اپنے رب کے پاس واپس جائیے اور اس میں تخفیف کر دینے کی درخواست کیجئے اس لئے کہ آپ کی امت اس کی طاقت نہیں رکھتی، مجھے بنی اسرائیل کا خوب تجربہ ہے" ارشاد ہوا کہ میں اپنے رب کے پاس واپس گیا اور میں نے عرض کیا کہ پروردگار میری امت کے لئے تخفیف فرما دیجئے تو پانچ نمازوں کی تخفیف فرما دی گئی (اسی طرح آپ نے تفصیل سے کئی بار جانا اور تخفیف کیا جانا بیان کیا) یہاں تک کہ فرمایا کہ جب پانچ نمازیں رہ گئیں تو ارشاد ہوا اے محمد یہ دن و رات میں پانچ نمازیں ہیں اور ہر نماز دس نمازوں کے قائم مقام ہے، اس طرح یہ (حقیقتاً) پچاس نمازیں ہو گئیں۔

میں ثابت قدم رہیں، پھر ان کیلئے بہت آسانی اور تخفیف کردی گئی اور صرف اس کا مطالبہ رہا کہ اپنے سے دوگنے دشمن کے مقابلہ پر انکو ثابت قدم اور غالب رہنا چاہیئے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ إِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ يَغْلِبُوا أَلْفًا مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ الْآنَ خَفَّفَ اللَّهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ ضَعْفًا فَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ أَلْفٌ يَغْلِبُوا أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ۔[۱]

اے نبی مومنین کو قتال پر آمادہ کیجئے، اگر تم میں سے بیس آدمی بھی ثابت قدم ہوں گے تو دو سو پر غالب آجائیں گے، اور اگر تم میں سے سو ہوں گے تو ایک ہزار کافروں پر غالب آجائیں گے، اس لئے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو کچھ نہیں سمجھتے، اب اللہ نے تم پر تخفیف کردی اور معلوم کرلیا کہ تم میں جوش کی کمی ہے سو (اب) اگر تم میں سے سو ثابت قدم ہوں تو دو سو پر غالب رہیں گے اور اگر تم میں سے ہزار ہوں تو دو ہزار پر غالب رہیں گے اللہ کے حکم سے، اور اللہ ثابت قدموں کے ساتھ ہے۔

لیکن اس تخفیف کے باوجود یہ پہلا حکم مسلمانوں کے اندر جوش عمل اور جذبۂ قربانی پیدا کرنے میں بہت معاون ثابت ہوا اور ان کو ہمیشہ جان سے کھیلنے اور خطرات مول لینے پر آمادہ کرتا رہا، یہ آیت جو منسوخ ہونے کے باوجود تلاوت کی جاتی ہے اس میں شاید یہی حکمت و مصلحت ہے کہ اس کے ذریعہ مسلمانوں میں ایک نئی شجاعت اور نیا جوش عمل پیدا ہوسکے اور یہی سچے مسلمانوں اور سر بکف مجاہدوں کا...... شیوہ اور اصل معیار ہے۔

روحانی غذائیں اور دوائیں اور ان کی خوراک و اوقات

یہ پانچوں نمازیں ان ہی متعین اوقات میں ادا کرنا ضروری

---

[۱] سورہ انفال ۔ ۶۵ - ۶۶

ہیں جو اللہ تعالے نے مقرر فرمائے ہیں۔

اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا[1] — بیشک نماز تو ایمان والوں پر پابندی وقت کیساتھ فرض ہے۔

قرآن مجید میں اس کے اوقات کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے[2]، ان پانچ نمازوں کے لئے رکعتیں بھی متعین ہیں جن کی پابندی ضروری ہے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اور آپ کے بعد صحابہ کرام نے زندگی بھر اور ہر موقع پر اس کی پابندی کی، یہاں تک کہ جہاد و قتال کے موقع پر بھی اس میں کوئی تبدیلی گوارا نہیں کی اور اس عمل اور عبادت میں اس قدر تواتر، تسلسل اور اجماع رہا جس کی نظیر دنیا کی کسی ملت اور تاریخ کے کسی دور میں نہیں ملتی، امت اسلامیہ نسلاً در نسل اس کو حفاظت کے ساتھ منتقل کرتی رہی اور نازک سے نازک ساعت، سخت سے سخت آزمائش اور تاریک سے تاریک دور میں بھی وہ ایک دن کے لئے ملتوی نہیں کی گئی۔

---

[1] سورۃ النساء۔ ۱۰۳ [2] ایک جگہ ارشاد ہے:۔

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا (بنی اسرائیل ۷۸) — نماز ادا کیجئے آفتاب کے ڈھلنے (کے بعد) سے رات کے اندھیرے ہونے تک اور صبح کی نماز بھی، بیشک صبح کی نماز حضوری کا وقت ہے،

بعض مفسرین نے لفظ دلوک سے نماز کے تین اوقات کا استنباط کیا ہے، ظہر، عصر، مغرب، اور غسق اللیل سے عشا کی نماز کا استنباط کیا ہے اور قرآن الفجر سے صبح کی نماز ثابت کی ہے، تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو سیرت النبیؐ جلد پنجم تالیف مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ، لفظ دلوک کے معنی اور جہاں جہاں اس کا استعمال ہوتا ہے یہ معلوم کرنے کے لئے لسان العرب سے رجوع کیا جائے۔

قرآن مجید کی دوسری آیت ہے۔

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا وَمِنْ اٰنَآءِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى (سورہ طٰہٰ ۔ ۱۳۰) — اور اپنے پروردگار کی تسبیح کرتے رہئے حمد کے ساتھ آفتاب کے طلوع سے قبل اور اس کے غروب سے قبل اور اوقات شب میں بھی تسبیح کیجیے اور دن کے بھی اول و آخر میں، تاکہ آپ خوش رہیں

اس کی تفسیر کے لئے بھی سیرت النبی جلد پنجم کا مطالعہ مفید ہوگا۔

یہ پانچ وقت کی نمازیں اپنے اوقات اور رکعتوں کے ساتھ دراصل روحانی غذائیں اور صحت کے انجکشن ہیں جو انسانوں کے خالق مالک الملک اور حکیم و علیم نے اپنے بندوں کے لئے مقرر کئے ہیں، وہ حکیم و علیم جو صرف نفوس کا طبیب ہی نہیں بلکہ ان کا خالق و صانع بھی ہے، اس لئے اس کی حکمت و آئین کے سامنے بے چون و چرا سرِ تسلیم خم کر دینا چاہیئے پھر اس پر مضبوطی سے ثابت قدم رہنا چاہیئے، اسی تعداد و مقدار کے ساتھ ان نمازوں کو ادا کرنا چاہیئے جو خدا نے مقرر کر دی ہیں اور انھیں اوقات میں ان کو ادا کرنا چاہیئے جو اللہ کی طرف سے ان کیلئے معین ہیں، ان اوقات کے اسرار اور ان میں اللہ تعالےٰ کی جو تجلیات، ان کے اندر رحمتوں کی جو بارش اور ان میں جو نورانیت اور روحانی ترقی کا سامان پایا جاتا ہے اس کا علم و ادراک اللہ اور اسکے رسول کے سوا کسی کو نہیں،[1]

ان اوقات کے تعین کے وسیع مقاصد میں ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ان اوقات میں مشرکین اپنے معبودانِ باطل کی عبادت کیا کرتے تھے اس لئے ان میں خدائے واحد کی عبادت کا حکم دیا گیا ہے،

(۴ آفتاب، ستارہ، پتھر اور آگ وغیرہ)

جب انسان ڈاکٹروں اور طبیبوں کے مشورہ اور انکے مقرر کردہ اوزان و خوراک کی پابندی ضروری سمجھتا ہے، حالانکہ وہ ان ہی کی سطح کے لوگ اور ان ہی کی طرح گوشت و پوست کے انسان ہیں، انکے تجربے محدود اور اندازے تخمینی ہیں، تو پھر خدائے حکیم و علیم کے حکم کے بارے میں ہمارا کیا رویہ ہونا چاہیئے جس کی شان یہ ہے کہ

اَلَّذِیۡۤ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَہٗ ثُمَّ ہَدٰی ۞[2]	جس نے ہر چیز کو اس کی بناوٹ عطا کی، پھر اسکی رہنمائی کی
اَلَا یَعۡلَمُ مَنۡ خَلَقَ ؕ وَ ہُوَ اللَّطِیۡفُ الۡخَبِیۡرُ ۞[3]	کیا وہی آگاہ نہ ہوگا جس نے پیدا کیا ہے؟ وہ تو (بڑا ہی) باریک بیں اور (پورا) باخبر ہے۔

. . . .

نمازوں کے اوقات اور انکے تسلسل کی حکمت

ان نمازوں کی تکرار اور تھوڑے تھوڑے وقفہ

---

[1] اس موضوع پر حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے "حجۃ اللہ البالغہ" میں "اسرار الاوقات" کے عنوان سے بہترین بحث لکھی ہے اس کو ملاحظہ کیا جائے [2] سورۂ طٰہٰ ۔ ۵۰ [3] سورہ ملک ۔ ۱۴

سے انکے تسلسل میں بہت بڑی حکمت پوشیدہ ہے اس میں نفس انسانی کیلئے مکمل اور صالح غذا کا سامان ہے اور ماسوی اللہ سے غفلت اور قلب و روح پر مادیت کے حملوں سے بچاؤ کا پورا انتظام ہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس کی حکمت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"امت کی سیاست اور اس کی زندگی کا نظام اس وقت تک درست نہیں ہو سکتا جب تک ہر تھوڑی مدت اور وقفہ کے بعد اس کی نگہداشت نہ کی جاتی رہے، یہاں تک کہ نماز کے لئے اس کا انتظار اور اس کے لئے بہت پہلے سے تیاری نماز ہی کے رنگ اور نماز ہی کے نور کا ایک حصہ ہے اور اسی کے حکم میں آتا ہے، اور اس طرح اکثر اوقات اسکے دائرہ میں آجاتے ہیں، ہم کو اس کا تجربہ ہے کہ جو تہجد کی نماز کی نیت کے ساتھ سوئے گا وہ کم از کم بہائم کی نیند نہ سو سکے گا، اسی طرح کسی کو اگر نماز یا کسی ورد کی فکر دامنگیر ہوگی وہ بہیمیت میں پڑنے سے باز رہے گا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد ("من تعارّ من اللیل"[1]) (الحدیث)

کا مقصد و منشا بھی یہی ہے اللہ تعالے کا ارشاد ہے۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ	ایسے لوگ جنھیں نہ تجارت غفلت میں ڈالتی
عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ[2] (سورۂ نور۔ ۳۷)	ہے نہ (خرید و) فروخت اللہ کی یاد سے

اسلام میں نماز کی اہمیت

یہ احکام آلٰہی کی وہ حکمتیں ہیں جن کے سامنے ہمکو سر تسلیم خم کر دینا چاہیئے، ہمارا ایمان ہونا چاہیئے کہ نماز بندوں پر اللہ تعالے کا سب سے بڑا فریضہ ہے، دین کا ستون ہے، مسلمان اور کافروں کے درمیان وجہ امتیاز ہے[3]، نجات کی شرط ہے، ایمان کی

---

[1] اشارہ اس حدیث کی طرف ہے جسکو امام بخاری، امام ترمذی، اور ابوداؤد نے حضرت عبادہ بن صامت سے روایت کیا ہے خلاصہ یہ ہے کہ جس کی زبان سے (نیند سے بیدار ہوتے ہوئے) کلمۂ شہادت اور تسبیح و تحمید کے الفاظ نکلے اور اس نے دعا کی تو اسکی دعا، یا وضو کر کے نماز پڑھ لی تو اسکی نماز قبول ہوگی، (ملاحظہ ہو صحیح بخاری کتاب التہجد، ترمذی کتاب الدعوات، ابوداؤد کتاب الادب) شاہ صاحب کا مقصد یہ ہے کہ جسکی زبان پر ذکر الٰہی اس طرح جاری ہو جائے اور نماز و دعا کی فکر ایسی غالب ہو کہ سوتے سوتے اسکی زبان سے (باقی حاشیہ صفحہ ۳۰ پر)

محافظ ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت و تقویٰ کی بنیادی شرائط کے طور پر بیان کیا ہے، ارشاد ہے۔

الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ[۱]۔

الٓمّ، یہ کتاب (کہ) کوئی شبہ اس میں نہیں ہدایت ہے (اللہ سے) ڈر رکھنے والوں کے لئے جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى[۲]۔

بامراد ہوا وہ جو پاک ہوا اور اپنے پروردگار کا نام لیتا اور نماز پڑھتا رہا۔

اخلاق ذمیمہ رکھنے والوں سے نماز کی حفاظت کرنے والوں کو مستثنیٰ کرتے ہوئے ارشاد ہے۔

اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلٰوتِهِمْ دَآئِمُوْنَ[۳]۔

ہاں البتہ وہ نمازی (اس حکم میں داخل نہیں) جو اپنی نمازوں میں برابر لگے رہتے ہیں۔

کامیاب مسلمانوں کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔

(باقی حاشیہ صفحہ ۲۹ کا) نکل جائے اور خود بخود آنکھ کھل جائے تو وہ غفلت و مدہوشی کی نیند نہیں سو سکتا، ۲؎ حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۸۲ (باب اسرار الاوقات) ۳؎ چنانچہ قرآن مجید میں آتا ہے۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (سورہ روم ۳۱)

اور نماز کی پابندی رکھو اور شرک کرنے والوں میں مت رہو۔

سورۂ توبہ میں ارشاد ہے۔

"فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ۔ (سورہ توبہ ۔ ۵)

اگر توبہ کر لیں اور نماز پڑھنے لگیں اور زکوٰۃ دینے لگیں تو انکا راستہ چھوڑ دو۔

دوسری جگہ ہے "فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ۔ (سورہ توبہ ۔ ۱۱)

لیکن اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز کے پابند ہو جائیں اور زکوٰۃ دینے لگیں تو وہ تمہارے بھائی ہو جائیں گے دین میں۔

مسلم میں جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "بین العبد وبین الکفر ترک الصلوٰۃ" انسان اور کفر کے درمیان صرف نماز چھوڑ دینے کی کسر ہے، دوسری روایت میں، "بین الرجل والشرک" کے الفاظ آئے ہیں، ترمذی کی روایت میں ہے کہ آدمی اور ایمان کے درمیان نماز کا ترک ہی حد فاصل ہے۔" حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "العھد الذی بیننا وبینھم الصلوٰۃ" ہمارے اور ان لوگوں کے درمیان جو عہد ہے وہ نماز ہی کا ہے اس مضمون کی اور بھی روایات ہیں۔

۱؎ سورۃ البقرہ ۱-۲-۳ ۲؎ سورۃ الاعلیٰ ۔ ۱۴ ۔ ۱۵ ۳؎ سورۃ المعارج ۔ ۲۲ ۔ ۲۳

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ[1]، | اور جو اپنی نمازوں کی پابندی کرنے والے ہیں۔

اہل جہنم کے ذکر میں ارشاد ہے۔

مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ، قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ[2]۔ | تمہیں کون سی چیز دوزخ میں لائی؟ وہ کہیں گے ہم تو نماز نہیں پڑھا کرتے تھے،

منافقین کے بیان میں ہے۔

اِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ يُخَادِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ وَاِذَا قَامُوْا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا[3]۔ | بیشک منافقین تو اللہ سے چال چل رہے ہیں حالانکہ اللہ انہی کی چالوں کو ان پر الٹ رہا ہے اور یہ لوگ جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو بہت ہی کاہلی سے کھڑے ہوتے ہیں (صرف) لوگوں کو دکھاتے ہیں اور اللہ کی یاد کچھ یوں ہی سی کرتے ہیں۔

- - - - - - - - - - - - -

یہ ہر آزاد اور غلام، امیر اور غریب، بیمار اور تندرست، مسافر اور مقیم پر ہمیشہ کے لئے اور ہر حال میں فرض ہے، کسی بالغ انسان کو کسی حال میں اس سے مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا، بخلاف روزہ، حج اور زکوٰۃ کے جو مختلف شرائط وصفات کے ساتھ وابستہ ہیں اور ان کے متعین اور محدود اوقات ہیں، نماز میدان جنگ میں بھی فرض ہے اور صلوٰۃ خوف کے نام سے موسوم ہے، اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے۔

وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِى الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا، اِنَّ الْكَافِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا، وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ | اور جب تم زمین پر سفر کرو تو اس باب میں کوئی مضائقہ نہیں کہ نماز میں کمی کر دیا کرو، اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ کافر لوگ تمہیں ستائیں گے، بیشک کافر تو تمہارے کھلے ہوئے دشمن ہی ہیں، اور جب آپ ان کے درمیان ہوں اور

---

[1] سورۃ المومنون - ۹ [2] سورہ مدثر - ۴۲ - ۴۳ [3] سورہ نساء - ۱۴۲

فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ
مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَأْخُذُوْا أَسْلِحَتَهُمْ
فَإِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ
وَلْتَأْتِ طَآئِفَةٌ أُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا
فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَأْخُذُوْا حِذْرَهُمْ
وَأَسْلِحَتَهُمْ، وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ
عَنْ أَسْلِحَتِكُمْ وَأَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ
مَّيْلَةً وَّاحِدَةً وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ
كَانَ بِكُمْ أَذًى مِّنْ مَّطَرٍ أَوْ كُنْتُمْ
مَّرْضٰى أَنْ تَضَعُوْا أَسْلِحَتَكُمْ وَخُذُوْا
حِذْرَكُمْ إِنَّ اللّٰهَ أَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ
عَذَابًا مُّهِيْنًا، فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ
فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى
جُنُوْبِكُمْ فَإِذَا اطْمَأْنَنْتُمْ فَأَقِيْمُوا
الصَّلٰوةَ ۚ إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى
الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا،

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى
وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ، فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا

ان کے لئے نماز قائم کریں تو چاہیئے کہ ان میں کا ایک
گروہ آپکے ساتھ کھڑا ہو جائے اور وہ لوگ اپنے
ہتھیار لیئے رہیں پھر جب وہ سجدہ کر چکیں تو اب چاہیئے کہ
وہ تم لوگوں کے پیچھے ہو جائیں اور دوسرا گروہ جس نے
ابھی نماز نہیں پڑھی ہے آ جائیں اور وہ آپکے ساتھ نماز
پڑھ لیں اور یہ لوگ بھی اپنے بچاؤ کا سامان اور اپنے ہتھیار
(ساتھ) لئے رہیں، کافروں کی تو خواہش یہی ہے کہ تم اپنے
ہتھیاروں اور اپنے سامان سے (ذرا) غافل ہو جاؤ تو یہ
لوگ تمہارے اوپر یکبارگی ہی ٹوٹ پڑیں اور تمہارے لئے
اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ اگر تمہیں بارش سے تکلیف
ہو رہی ہو یا تم بیمار ہو تو اپنے ہتھیار اتار رکھو اور اپنے بچاؤ
کا سامان لئے رہو، بیشک اللہ نے کافروں کیلئے ایک رسوا
کرنیوالا عذاب تیار کر رکھا ہے پھر جب تم (اس) نماز کو ادا کر چکو تو
اللہ کی یاد میں لگ جاؤ کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے اور پھر جب
تمہیں اطمینان حاصل ہو جائے تو نماز کی اقامت کرو، بیشک نماز
تو ایمان والوں پر پابندی وقت کے ساتھ فرض ہے۔

(سب ہی) نمازوں کی پابندی رکھو اور (خصوصاً) درمیانی
نماز کی اور اللہ کے سامنے عاجزوں (کی طرح) کھڑے رہا کرو،

لہ سورۃ النساء - ۱۰۱ - ۱۰۲ - ۱۰۳

فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا فَإِذَا أَمِنتُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا عَلَّمَكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ[1] ۔ لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو تو تم پیدل ہی (پڑھ لیا کرو) یا سواری پر پھر جب تم امن میں آجاؤ تو اللہ کو یاد کیا کرو جس طرح اس نے تمہیں سکھایا ہے جسکو تم جانتے (بھی) نہ تھے،

نماز کے دوام کی ضرورت اور اسکے ترک کے خطرات

یہ ایک ایسا فریضہ ہے جو کسی نبی اور رسول سے بھی ساقط نہیں ہوتا چہ جائیکہ کسی ولی اور عارف اور مجاہد سے، اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے "واعبد ربك حتى یاتيك اليقين[2]" (اور اپنے پروردگار کی عبادت کرتے رہئے یہاں تک کہ آپ کو امر یقین پیش آجائے) اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ مشاہدہ اور یقین کی منزل پر پہونچنے کے بعد یا اسلام کے راستہ میں مختلف خدمات انجام دینے یا اپنے کارناموں اور اپنے مقام کی وجہ سے یہ فریضہ اس سے ساقط ہو گیا تو وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتا ہے اور زبردست خطرہ کو دعوت دیتا ہے۔

کسی خدمت و جہاد کی وجہ سے نماز سے غافل کی مثال

اپنے کسی کارنامہ، کسی خدمت، یا کسی کیفیت اور حال پر اعتماد کر کے نماز چھوڑ دینے والے کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کشتی کا کوئی عالم و فاضل سوار اپنے علم و فضل کے زعم میں کسی تختہ یا کیل کو یہ کہہ کر توڑنے یا نکال دینے کے درپے ہو جائے کہ اس کی اس کشتی میں کیا ضرورت ہے اور ایک تختہ یا کیل نہ ہونے کی وجہ سے کیا نقصان ہوگا اس کے بغیر بھی کام چل سکتا ہے وہ اس کو بلاضرورت اور غیر مفید قرار دے کر زبردستی تختہ یا کیل کو توڑ دے اور بالآخر اس کی اس بوالفضولی کی بدولت کشتی مع مسافروں

---

[1] سورۃ البقرہ - ۲۳۸ - ۲۳۹ [2] سورۃ الحجر - ۹۹ تمام علماء و مفسرین کا اجماع ہے کہ یقین سے مراد موت ہے، عاقل بالغ سے فرائض کا ساقط نہ ہونا علم عقائد کا معروف مسئلہ ہے۔

کے غرق دریا ہو جائے[۱]۔

نماز کی پابندی اور حفاظت کا راز اور اسکے تارک کی سزا

نماز میں ایمان اور دین کی حفاظت، اللہ تعالیٰ سے تعلق، دائرہ اسلام میں رہنے اور جماعت مومنین میں شمولیت کی حفاظت و سلامتی کا راز پوشیدہ ہے یہ کیوں ہے؟ اسکی حقیقت اللہ ہی کو معلوم ہے، ایک بڑے عارف و محقق بزرگ[۲] نے اس نکتہ کی تشریح کے لئے ایک بڑی سبق آموز اور عارفانہ حکایت بیان کی ہے،

"اس کو ایسا سمجھو کہ ایک شخص نے ایک پہاڑ کی چوٹی پر محل تعمیر کیا، وہاں انواع و اقسام کی نعمتیں جمع کیں، جب اس کا اخیر وقت ہوا تو اس نے لڑکے کو وصیت کی کہ اس محل میں جو ترمیم و تصرف چاہنا کرنا لیکن ایک خوشبودار گھاس کا ایک حصہ جو میں چھوڑ کر جا رہا ہوں وہ چاہے خشک ہو جائے اسکو باہر نہ کرنا، جب پہاڑ کی چوٹی پر بہار آئی تو پہاڑ اور میدان سرسبز ہو گئے بہت سی تازہ اور خوشبودار گھاس پیدا ہو گئی جو اس پرانی گھاس سے زیادہ تر و تازہ تھی اس میں سے بہت سی گھاس اور پھول اس محل میں آئے جن کی خوشبو نے سارے محل کو معطر کر دیا اور انکے سامنے اس پرانی سوکھی ہوئی گھاس کی خوشبو دب گئی، لڑکے نے سوچا کہ میرے والد نے یہ پرانی گھاس اس محل میں اس لئے رکھی تھی کہ اس کی خوشبو پھیلے اور یہ جگہ اس سے معطر ہو، اب یہ سوکھی گھاس کس کام آئے گی، اس نے حکم دیا کہ اس گھاس کو باہر پھینک دیا جائے جس وقت محل اس گھاس سے خالی ہو گیا، ایک کالے سانپ نے سوراخ سے سر نکالا اور لڑکے کو ڈس لیا اور اس کا کام تمام ہو گیا۔

---

[۱] یہ مثال حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری بہاریؒ کے ایک مکتوب سے ماخوذ ہے،

[۲] مخدوم شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ، (۶۶۱ھ - ۷۸۶ھ)

سبب اس کا یہ تھا کہ اس گھاس کے دو فائدے تھے ایک یہ کہ وہ خوشبو دے، اور دوسرے اس میں یہ خاصیت تھی کہ وہ جہاں ہوتی ہے سانپ اس کے قریب نہیں جا سکتا، گویا وہ سانپ کا تریاق تھی، یہ خاصیت کسی کو معلوم نہیں تھی، لڑکے کو اپنی ذہانت پر ناز تھا وہ سمجھا کہ جو اس کے معلومات کے دائرہ میں نہ ہو گویا کہ قدرت خداوندی کے خزانہ میں موجود نہیں ہے، اس کو اس آیت کا مفہوم نہیں معلوم تھا۔ "وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا" وہ اپنی ذہانت کے غرّہ میں مارا گیا"[1]

تارک صلوٰۃ کی بھی یہی مثال ہے، اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ وہ نماز سے مستغنی ہے اور ان مقاصد کو حاصل کر چکا ہے جن کیلئے نماز کا حکم ہے، یا اسلام اور مسلمانوں کی کسی بڑی خدمت، یا عبادت و ریاضت، یا اپنے جہاد و سرفروشی یا تحریک و دعوت میں اپنے انہماک و مشغولیت پر بھروسہ کر کے نماز کو حقیر یا بے ضرورت سمجھتا ہے اور اس سے غفلت برتتا ہے تو وہ تباہی کے دہانہ پر کھڑا ہے اور اس کے سارے اعمال اور ساری خدمات نہ صرف رائیگاں بلکہ وبالِ جان ہیں اور اس کی مثال اس بکری یا بھیڑ کی ہے جو اپنے گلہ اور چرواہے سے علٰحدہ ہو کر دور جائے اور بالآخر بھیڑیئے کا لقمۂ تربن جائے۔

نماز مومن کے حق میں ایسی ہے جیسے مچھلی کیلئے پانی

نماز دراصل اس فطرت انسانی اور تقاضہ بشری کی تسکین اور تکمیل ہے جس کو ہم ضعف واحتیاج، مجبوری و درماندگی، دعا و مناجات، اور اس خدائے بزرگ و برتر کی پناہ میں آجانے اور اس کے در پر سر رکھ کر پڑ رہنے کا جذبہ کہہ سکتے ہیں، جو طاقتور ہے بے نیاز ہے، سخی داتا ہے، رحم کرنے والا اور مہربان ہے، حفاظت کرنے والا، عطا کرنے والا، جاننے اور خبر رکھنے والا، سننے اور دینے والا ہے، درحقیقت شکر و احسانمندی، وفاشعاری اور حب الٰہی، عبودیت و تذلل، اور خشوع و تواضع کے اس جذبہ کی تسکین ہے جو انسان کی سرشت میں

---

[1] مکتوبات سرہندی (ترجمہ ماخوذ از تاریخ دعوت و عزیمت حصہ سوم) ص۳۰۶-۳۰۷

ہے اور اس کی انسانیت کا سب سے بڑا جوہر ہے' اس بارہ میں مومن کی مثال مچھلی کی سی ہے جس کی زندگی پانی کے ساتھ وابستہ ہے' اگر اس کو زبردستی پانی سے نکال بھی لیا جائے تب بھی وہ پانی کیلئے بیقرار اور پانی کی محتاج رہے گی اور موقع ملتے ہی بے ساختہ اس پر ٹوٹ پڑے گی' رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے' آپ نے فرمایا "جعلت قرۃ عینی فی الصلوٰۃ"[1] (میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے) اسی طرح حضرت بلالؓ سے آپ نے فرمایا کہ "یا بلال اقم الصلوٰۃ ارحنا بھا"[2] (اے بلال نماز کی تیاری کرو اور اس کے ذریعہ ہم کو آرام دو)

مومن کی جائے پناہ اور جائے امن

نماز مومن کیلئے اس محبت کرنے والی ماں سے بھی زیادہ پناہ لینے' سر چھپانے اور آرام پانے کی جگہ اور اس کی گود سے بھی زیادہ راحت رساں اور جنت بداماں ہے' جو ایک یتیم' ضعیف و عاجز' بے سہارا اور لاڈلے بچہ کیلئے ہر وقت کھلی رہتی ہے' اور جب بھی بچہ کو کسی قسم کے گزند اور نقصان کا خطرہ ہوتا ہے' کوئی اس کو چھیڑتا اور پریشان کرتا ہے یا اس کو بھوک اور پیاس ستاتی ہے یا وہ کسی چیز سے سہم جاتا ہے تو فوراً ماں سے چمٹ جاتا ہے اور اس کی گود میں بیٹھ کر سمجھ لیتا ہے کہ وہ سب سے محفوظ ہو گیا' اسی طرح نماز بھی مومن کی سب سے بڑی پناہ گاہ اور جائے قرار ہے' یہ وہ مضبوط رسی ہے جو اس کے اور اس کے رب کے درمیان پھیلی ہوئی ہے وہ جب چاہے اس رسی کو مضبوطی سے تھام کر اپنی حفاظت کی ضمانت حاصل کر سکتا ہے' یہ اس کی روح کی غذا' درد کا درماں' زخم کا مرہم' بیماری سے شفا اور اس کا سب سے بڑا ہتھیار اور سہارا ہے۔

اللہ تعالے کا ارشاد ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِينَ[3]۔	اے ایمان والو صبر اور نماز سے مدد چاہو بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

---

[1] نسائی [2] ابوداؤد "کتاب الادب" [3] سورۃ البقرہ — ۱۵۳

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو کسی خاص مسئلہ کا سامنا ہوتا تھا تو آپ فوراً نماز کی طرف توجہ فرماتے تھے،

حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ "جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ۔ ۔ ۔ پریشانی درپیش ہوتی تو فوراً نماز کیلئے کھڑے ہو جاتے تھے"[۱] حضرت ابوالدرداءؓ سے روایت ہے کہ "جب کبھی رات کو تیز ہوا چلتی آپ مسجد کی طرف رخ فرماتے اور جبتک ہوا تھم نہ جاتی وہیں تشریف رکھتے، اسیطرح جب سورج یا چاند گرہن ہوتا تو نماز میں مشغول ہو جاتے یہانتک کہ گرہن دور ہو جاتا"[۲]

ابوداؤد میں نضر سے روایت ہے کہ "حضرت انسؓ کے زمانہ میں ایک مرتبہ بڑا اندھیرا چھا گیا، میں انکی خدمت میں حاضر ہوا، میں نے کہا کہ اے ابوحمزہ (حضرت انسؓ کی کنیت) کیا کبھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی ایسا ہوا کرتا تھا انھوں نے فرمایا کہ توبہ توبہ، اگر کبھی زور کی آندھی بھی آتی تھی تو ہم بھاگ کر مسجد میں پناہ لیتے تھے اس ڈر سے کہیں قیامت نہ آ رہی ہو"

نماز سے صحابہ کرامؓ کی شیفتگی اور اسکی خاطر ہر قسم کے مرغوبات کی قربانی اس زمانہ کے مشرکین سے پوشیدہ نہ تھی، مسلم میں حضرت جابرؓ سے روایت ہی فرماتے ہیں کہ ہمنے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کیساتھ قبیلہ جہینہ کے لوگوں سے جہاد کیا، انھوں نے بہت سخت جنگ کی (حدیث کے آخری الفاظ یہ ہیں) کہ وہ کہتے تھے کہ "انکی اس نماز کا وقت آنیوالا ہے جو انکو انکی اولاد سے بھی زیادہ محبوب ہے"[۳]

نماز میں جسم، عقل اور قلب تینوں کی نمائندگی ہے

نماز صرف جسمانی حرکات یا کسی چوب خشک جیسے نظام کا نام نہیں جس میں نہ روح ہوتی ہے، نہ زندگی نہ وہ کوئی ایسا فوجی ڈسپلن ہے جس میں ارادہ و اختیار کو کوئی دخل نہیں ہوتا، وہ ایک ایسا عمل ہے جسمیں جسم عقل اور قلب سب شریک ہیں اور اس میں ان تینوں چیزوں کی حکیمانہ و منصفانہ نمائندگی موجود ہے، جسم کے حصہ میں قیام اور رکوع و سجود آیا ہے، زبان کے حصہ میں تلاوت و تسبیح آئی ہے، عقل کے حصہ میں تفکر و تدبر آیا ہے قلب کے حصہ میں خشوع و انابت اور رقت و کیفیت آئی ہے اور قرآن مجید میں ان تینوں کا ذکر موجود ہے جسم کے اعمال کی طرف ان آیتوں میں اشارہ ہے،

وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ ۔[۴] اور اللہ کے سامنے عاجزوں (کی طرح) کھڑے رہا کرو۔

---

[۱] ابوداؤد [۲] رواہ الطبرانی فی الکبیر وفیہ زیاد بن مجر [۳] مطلب یہ ہے کہ اس وقت ان کی مشغولیت و استغراق سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے اور وہ حملہ کے لئے موزوں وقت ہے۔ [۴] سورۃ البقرہ ۔ ۲۳۸

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ [۱]

اے ایمان والو رکوع کیا کرو اور سجدہ کیا کرو اور اپنے پروردگار کی عبادت کرتے رہو اور نیکی کرتے رہو تاکہ کچھ فلاح پا جاؤ۔

عقل کے اعمال کی طرف ان آیات میں اشارا ہے :۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ [۲] ۔

اے ایمان والو نماز کے قریب نہ جاؤ اس حال میں کہ تم نشے میں ہو یہاں تک کہ جو کچھ (منہ سے) کہتے ہو اسے سمجھنے لگو،

. . . .

اور قلب کے اعمال کی طرف ان آیات میں اشارہ ہے :۔

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ [۳] ۔

یقینا (وہ) مومنین فلاح پاگئے جو اپنی نماز میں خشوع رکھنے والے ہیں۔

تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ [۴] ۔

ان کے پہلو خواب گاہوں سے علیحدہ رہتے ہیں اور اپنے پروردگار کو وہ پکارتے رہتے ہیں خوف سے اور امید سے اور جو کچھ ہم نے دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرتے رہتے ہیں۔

. . . .

صرف ایک چیز کی نمائندگی پر اصرار جہل اور گمراہی ہے

انسان جسم عقل اور دل تینوں چیزوں کا مجموعہ ہے، اور اسی لحاظ سے نماز میں جو اس دین کا سب سے بڑا مظہر ہے، انسانی فطرت کے تمام بنیادی شعبوں اور نمایاں پہلوؤں کی نمائندگی موجود ہے بعض متقشفین مذاہب، اہل عبادت و ریاضت اور عہد آخر کے یہودیوں نے اس کو محض جسمانی حرکات سمجھا، بعض فلسفہ زدہ اور اشراقی صوفیوں نے اس کو صرف تفکر و تدبر اور مراقبہ قرار دیا، بہت سے جاہل عیسائی راہبوں اور بعض نام نہاد مسلمان صوفیوں نے اس کو صرف خشوع و انابت، سوز و گداز، گریہ و بکا، دعا و مناجات اور شوق و محبت کی

---

[۱] سورۃ الحج :- ۷۷ [۲] سورۃ النساء :- ۴۳ [۳] سورۃ المومنون :- ۱-۲- [۴] سورۃ السجدہ :- ۱۶

ایک تصویر سمجھا اور تنہا اسی پر قناعت کرکے بیٹھ رہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ یہ تمام طبقے اصل حقیقت سے منحرف اور نماز کے جامع معجزانہ نظام سے ناآشنا تھے،

نماز کا حکیمانہ و معجزانہ نظام تربیت

حکمت الٰہی اور شریعت ربانی نے نماز کا جو لطیف و عمیق اور جامع و مانع نظام قائم کیا ہے اس سے مقصود صرف یہ ہے کہ اس کے ذریعہ انسان اپنے مقصد عبودیت کی تکمیل کر سکے، اس کے اندر اخلاص، غایت درجہ کا خضوع و تذلل، استغاثہ و ابتہال اور تعلق مع اللہ کی صفات پیدا ہوں، وہ ماسوی اللہ سے منقطع ہو جائے اور ہر اس شخص کے خلاف اعلانِ بغاوت کر دے جو اللہ تعالٰے کی الوہیت و ربوبیت، اس کی عظمت و کبریائی، اسکے حکم و فیصلہ اور اطاعت مطلقہ میں حصہ دار بننا چاہتا اور زبانِ قال یا حال سے اپنی پرستش کرنے کی دعوت دیتا ہو اور اپنے طرزِ عمل سے اس کا دعوے دار ہو کہ وہی حکم دینے والا ہے اور وہی منع کرنے والا، اسی سے امید رکھنی چاہیئے اور اسی سے ڈرنا چاہیئے، نماز کا مقصد یہ ہے کہ نفس انسانی میں ایک ایسی روحانی قوت، نیا ایمان اور قلب کو روشن کر دینے والا نور پیدا ہو جائے جس کے ذریعہ انسان ہر قسم کے فتنوں اور ترغیبات کا مقابلہ کر سکے، بڑے بڑے حوادث میں ثابت قدم رہ سکے نفس کے شر اور اس کے کید سے محفوظ رہے اور اس کی کمزوریوں پر قابو پا سکے۔

نماز میں قبلہ کی طرف رخ کرنیکی حکمت اور اسکے اثرات

اسلام کی تعلیم ہے کہ پانچوں نمازوں میں اپنا رُخ اس بیت عتیق (پرانے گھر) کی طرف رکھا جائے جو صرف اللہ تعالٰے کیلئے بنایا گیا ہے اور جو اس زمانہ میں بھی جب سارے گھر اور معبد بتوں اور جھوٹے معبودوں کی پرستش کیلئے وقف تھے اور ان میں طرح طرح پتھروں، اجرام فلکی اور خیالی معبودوں کی عبادت[1] کی جاتی تھی،

---

[1] مثلاً محبت کا دیوتا، جنگ کا دیوتا، حسن کا دیوتا اور اسی طرح کے وہ سارے دیوتا اور دیبیاں جو اہل یونان، اہل ہند، آشوریوں اور قدیم مصریوں میں معروف تھیں اور ان کی پوجا ہوتی تھی،

تنہا اس کی دعوت کیلئے مخصوص تھا اور توحید کا ابدی رمز اور عالمی شعار بن گیا تھا،

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ ۔[1]

سب سے پہلا مکان جو لوگوں کے لئے وضع کیا گیا وہ ہے جو مکہ میں ہے (سب کیلئے) برکت والا اور سارے جہاں کیلئے راہنما ہے۔

- - - - - - - - - - -

جس کی بنیاد ابوالانبیا ر امامِ توحید اور اس ملت کے اولین موسس حضرت ابراہیم خلیلؑ اور ان کے فرزند اسماعیلؑ کے مبارک ہاتھوں سے پڑی تھی،

وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ، رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِن ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۔[2]

اور (وہ وقت بھی یاد رکھنے کے قابل ہے) جب ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ خانہ (کعبہ) کی بنیادیں بلند کر رہے تھے، اے ہمارے پروردگار ہم سے (یہ) قبول کر یقیناً تو ہی (سب کچھ) سننے والا ہے (سب کچھ) جاننے والا ہے، اے پروردگار ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار بنادے اور ہماری نسل سے ایک فرمانبردار امت پیدا کر اور ہم کو ہمارے دینی قاعدے بتلادے اور ہمارے حال پر توجہ رکھ یقیناً تو تو بڑا توجہ فرمانے والا ہے بڑا مہربان ہے

- - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - -

جس کی اساس ہی اللہ کی عبادت واطاعت اور طاغوت کی مخالفت وبغاوت پر رکھی گئی ہے اور اس کا وجود ہی دنیا کے سارے معبودانِ باطل کے خلاف اعلانِ جنگ ہے،

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَٰذَا الْبَلَدَ آمِنًا وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَن نَّعْبُدَ الْأَصْنَامَ

اور (وہ وقت یاد کرو) جب ابراہیمؑ نے عرض کی کہ اے میرے پروردگار اس شہر (مکہ) کو امن والا بنادے

---

[1] سورہ آل عمران ۔ ۹۶ [2] سورہ بقرہ ۔ ۱۲۷ ۔ ۱۲۸

رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔[1]

اور مجھ کو اور میرے فرزندوں کو اس سے بچائے رکھ کہ ہم لوگ مورتی پوجا کرنے لگیں اے میرے پروردگار ان (مورتیوں) نے بہتیرے آدمیوں کو گمراہ کر دیا ہے سو جو کوئی میری راہ پر چلے گا وہ میرا ہے ہی اور جو کوئی میری نافرمانی کرے تو تو بڑا مغفرت والا ہے بڑا رحمت والا ہے؛

اس لحاظ سے اس گھر کو قبلہ کی حیثیت سے مخصوص کرنا اور سب سے بڑی اور عمومی عبادت میں اس کی طرف رُخ کرنا در حقیقت شعار توحید کا اعلان اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عقیدۂ و دعوت اور ان کے مرکز عبادت میں ان کی پیروی و تقلید کا اظہار اور ان کی طرف اپنا انتساب ہے،

مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ[2]

تم اپنے باپ ابراہیم کی ملت (پر قائم رہو) اسی نے تمہیں مسلم قرار دیا،

شیخ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"چونکہ کعبہ اللہ تعالٰے کے شعائر میں سے ہے اس لئے اس کی تعظیم واجب ہے اور سب سے بڑی تعظیم یہ ہے کہ سب سے اچھے حال اور کیفیت میں اس کی طرف رخ کیا جائے، ایک خاص جہت (قبلہ) کی طرف رُخ کر کے کھڑا ہونا بھی اللہ تعالٰے کے شعائر میں سے ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ نمازی کے اندر انابت اور خشوع خضوع کی کیفیات و صفات پیدا ہوں اور وہ یہ محسوس کرے کہ وہ ایک غلام کی طرح آقا کے حضور میں سر تسلیم خم کئے مودب کھڑا ہے اور اسی لئے اس کو نماز کی شرط قرار دیا گیا ہے"[3]

---

[1] سورہ ابراہیم ۳۵-۳۶ [2] سورۃ الحج ۷۸ [3] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۳۶

اس حکیمانہ قانون (استقبال قبلہ) نے عالمی سطح پر ایک ایسی فکری و روحانی وحدت پیدا کر دی ہے، جس کی کوئی نظیر نہیں، اور جس کا ملی اتحاد، قلب و روح کی ہم آہنگی، جمعیت قلبی اور ایک رخ پر اپنی ساری توجہ مرکوز کرنے میں بڑا اہم حصّہ ہے

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں:۔

"نماز میں ایک ایسی چیز کی طرف رضا و تقرب الٰہی کے جذبہ سے رخ کرنا جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص کر دی گئی ہے، جمعیت خاطر، خشوع خضوع اور حضوری قلب پیدا کرنے کا بہت مفید ذریعہ ہے اور اس میں وہ انداز پایا جاتا ہے جو بادشاہ کے سامنے کھڑے ہونے والے کا ہوتا ہے۔"

وہ کہتے ہیں:۔

"دل کی توجہ چونکہ ایک پوشیدہ چیز تھی اس لئے (اس کی علامت کے طور پر) رخ کو بیت اللہ کی طرف کرنا اس کا قائم مقام قرار دیا گیا ہے، اور اس کو وضو ستر عورت اور پاکی ہی کی طرح شرط قرار دیا گیا ہے، چونکہ تعظیم امر خفی اور دل کا فعل ہے اسلئے جسم کی وہ ظاہری حرکات و سکنات جن کو شاہی آداب میں شمار کیا جا سکتا ہے اور بادشاہوں کے حضور میں انکا خاص اہتمام کیا جاتا ہے، اس تعظیم کا ثبوت اور اس کا قائم مقام قرار دیا گیا۔"[1]

تکبیر اور اسکے آفاق

نماز کو تکبیر یعنی اس متعین ماثور کلمہ سے شروع کرنے کا حکم ہے جس کو "اللہ اکبر" کہا جاتا ہے، یہ وہ بلیغ، واضح، فیصلہ کن اور ہر عہد، ہر ملک اور ہر معاشرہ کے لئے قابلِ فہم کلمہ ہے جس کے سامنے بڑے بڑے ظالم حکمراں، دیو پیکر انسان اور خود انسانوں کے تراشے ہوئے بت خاک کا ڈھیر بن جاتے ہیں اور ان کی جھوٹی خدائی کا طلسم پاش پاش ہو جاتا ہے، شرط یہ ہے کہ کہنے والے

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۷۳

نے اس کو فہم و شعور اور یقین و اعتقاد کے ساتھ ادا کیا ہو اور خدائی عظمت کے مدعی اس کے معنی سمجھتے ہوں اور جانتے ہوں کہ اس کی چوٹ کہاں کہاں اور کس کس پر پڑتی ہے، دراصل یہ پتھر کے بت جن کی عبادت کی جاتی ہے، یہ ہستیاں جن کو دیوتا سمجھا جاتا ہے، ان اشیاء کو جن کو مقدس قرار دیا جاتا ہے اور کائنات کی ان قوتوں کی جن کے سامنے انسان اپنا سر جھکانے لگتا ہے اور وہ حکام اور سیاسی رہنما جن کی آنکھ بند کر کے اطاعت کی جاتی ہے اور جن کے حکم کو بے چوں و چرا تسلیم کرنا ضروری قرار دیا جاتا ہے ان سب کے درمیان قدر مشترک عظمت وکبریائی، تفوق و ترفع اور استعلاء و استیلاء کا جذبہ ہے، یہ بلیغ، مختصر لیکن انقلاب آفریں کلمہ جس کا قرآن مجید میں "وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ" (اپنے رب کی بڑائی بیان کرو) کے ذریعہ حکم دیا گیا ہے ان تمام دعووں اور دعوتوں، خود فریبیوں اور فریبوں، اوہام و خرافات اور مظاہر و جہالتوں کے طلسم کو پاش پاش کر دیتا ہے، اس کے ایک ایک جز کی نفی کرتا ہے اور ظلم و فساد کے ایک ایک مرکز کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکتا ہے۔

اس شہادت کی اہمیت اور تاریخ میں اس کے کارنامے

جب آدمی صدق دل سے اس کلمہ پر ایمان لاتا ہے اور اللہ تعالےٰ کی عظمت وکبریائی کی شہادت دیتے ہوئے "اللہ اکبر" کہتا ہے اور یہ عقیدہ اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا اور رگ و ریشہ میں سما جاتا ہے تو اس وقت اس کی نظر میں بڑے بڑے بادشاہوں، ملکوں کے سربراہوں اور مطلق العنان حکمرانوں کی ساری عظمت و شوکت ہیچ ہو جاتی ہے بلکہ خاک میں مل جاتی ہے، ان کا رعب اس کے دل سے بالکل نکل جاتا ہے اور وہ اس کی نگاہ میں حقیر جانوروں یا انسانی تصویروں اور معمولی گڑیوں اور کھلونوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے، وہ ان کی دولت و سطوت کے مظاہر سے وہ معاملہ کرتا ہے جو کوئی بلند قامت انسان بونوں کے ساتھ، یا کوئی بزرگ و مربی اپنے شاگردوں اور چھوٹے بچوں کے ساتھ کرتا ہے۔

صحابہ کرام نے جاہ و اقتدار اور دولت و ثروت کے مظاہرہ اور نمائش کے خلاف جو طرز عمل اختیار کیا اور جس سے ان چیزوں کی بے وقعتی کھل کر ظاہر ہوئی اس کی بکثرت مثالیں اور واقعات تاریخ کے ذخیرہ

میں محفوظ ہیں،

مورخ ابن کثیر لکھتے ہیں :-

"حضرت سعدؓ نے ربعی بن عامر کو ایرانی افواج کے سپہ سالار رستم کی طرف قادسیہ میں قاصد بنا کر بھیجا، رستم کا دربار اس سے پہلے خوب آراستہ کیا گیا، ریشمی پردوں اور گدوں، ہیرے یاقوت اور دوسرے قیمتی ہیروں اور موتیوں کی خوب نمائش کی گئی تھی، رستم کے سر پر تاج اور بہت قیمتی پوشاکیں تھیں، وہ ایک سونے کے تخت پر بیٹھا ہوا تھا، ربعی بن عامر اپنے پرانے کپڑوں اور تلوار وڈھال کے ساتھ ایک پستہ قد گھوڑے پر سوار دربار میں داخل ہوئے اور فرش اور قالین کے ایک حصہ کو روندتے ہوئے آگے بڑھ گئے، پھر اترے اور انھیں گاؤتکیوں میں سے ایک میں گھوڑے کو بے تکلف باندھ دیا، پھر ہتھیار لگائے زرہ پہنے اور سر پہ خود لگائے ہوئے رستم کی طرف بڑھے، ان سے کہا گیا کہ ہتھیار رکھ دیں، انھوں نے جواب دیا کہ میں خود سے تمہارے پاس نہیں آیا ہوں، تمہارے بلانے پر آیا ہوں، مجھکو اسی طرح چھوڑتے ہو تو خیر ورنہ میں واپس جاتا ہوں، رستم نے کہا کہ "اجازت است" وہ اسی قالین پر اپنا نیزہ ٹیکتے ہوئے آگے بڑھے جس کی وجہ سے اس کا بڑا حصہ پھٹ گیا۔"[1]

اس طاقتور عقیدہ اور ایمان ویقین کی بدولت اسلامی تاریخ کے ہر دور میں ایسے محیر العقول واقعات پیش آئے، اور ان لوگوں میں ایسی غیر معمولی اور خارق عادت قوتیں پیدا ہو گئیں کہ وہ سلاطین وامراء سے اس طرح کا معاملہ کرنے لگے جو بہت سے لوگ فقراء اور ضعفا سے بھی نہیں کر سکتے، سلطنت کی جاہ وحشمت ان کے سامنے حباب کی طرح تحلیل ہو گئی اور ان کی نظر میں اس کی کوئی قیمت باقی نہ رہی، شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام کے ایک رفیق "الباجی" نے ایمان کی اس قوت اور اخلاقی جرأت کا ایک واقعہ اپنی کتاب میں قلمبند کیا ہے۔

---

[1] البدایہ والنہایہ، ج ۷، ص ۹

وہ کہتے ہیں :-

"ہمارے شیخ عزالدین ایک مرتبہ سلطان[1] کے پاس قلعہ گئے، عید کا دن تھا، انھوں نے دیکھا کہ دربار لگا ہوا ہے اور لشکر بادشاہ کے سامنے ایستادہ ہے، سلطان اپنی پوری شوکت و عظمت اور زینت کے ساتھ موجود ہے، امراء سلطان کے سامنے تعظیماً زمیں بوس ہیں، شیخ سلطان کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کا نام لے کر پکارا "ایوب" اللہ کے سامنے تم کیا جواب دوگے اگر اس نے یہ پوچھا کہ ہم نے تجھکو مصر کی فرمانروائی عطا کی اور تو شراب جائز کرتا ہے، سلطان نے کہا کیا ایسا ہوا ہے، شیخ نے کہا کہ ہاں فلاں دُکان پر شراب فروخت کی جاتی ہے اور دوسرے منکرات ہوتے ہیں اور تم اپنے عیش و آرام میں پڑے ہو، یہ سب باتیں بہت بلند آواز سے کہتے رہے اور لشکری اسی طرح مودب کھڑے رہے اس نے جواب میں کہا کہ یہ میرا کیا ہوا نہیں ہے یہ سلسلہ تو میرے والد کے زمانہ سے قائم ہے، شیخ نے جواب دیا کہ کیا آپ ان لوگوں میں ہیں جو کہتے ہیں "اِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلٰی اُمَّۃٍ" کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طریقہ پر پایا، یہ سنتے ہی سلطان نے اس دکان کو بند کر دینے کا فرمان جاری کر دیا جب شیخ سلطان کے پاس سے واپس آئے اور یہ خبر مشہور ہوئی تو میں نے شیخ سے ماجرا پوچھا، انھوں نے جواب دیا کہ میرے عزیز" جب میں نے اس کو شوکت و عظمت میں دیکھا تو مجھے خیال آیا کہ اسکی بھلائی اسی میں ہے کہ اس کی تھوڑی سی تذلیل کی جائے ورنہ اس کا نفس موٹا اور سرکش ہو کر اس کو نقصان پہونچا دے گا، میں نے کہا کہ آپ کو کچھ ڈر نہیں لگا، فرمایا خدا کی قسم جب میں نے اس کے سامنے اللہ تعالےٰ کی ہیبت و شان کا استحضار کیا تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے سامنے کوئی بلّا بیٹھا ہو"[2]

---

[1] اس سے مراد سلطان مصر الملک الصالح نجم الدین ایوب، (م ۶۴۷ھ) ہیں [2] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۵ ص ۸۲

ایمان وعقیدہ اور دعوت وعزیمت کی یہ تاریخ اپنے آپ کو ہر ملک اور ہر دور میں برابر دہراتی رہی،

شیخ محمد بن مبارک کرمانی (م ۷۷۰ھ) اسی قسم کا واقعہ بیان کرتے ہوئے اپنی کتاب "سیر الاولیا" میں لکھتے ہیں:۔

"ایک مرتبہ سلطان محمد تغلق نے شیخ قطب الدین منور کو دہلی طلب کیا، انھوں نے بادشاہ کو تعظیمی سلام نہیں کیا تھا اس پر سرزنش اور عتاب مقصود تھا، جب وہ دربار میں داخل ہوئے اور ایوان شاہی میں پہونچے تو دیکھا تمام امراء وزراء اور حکام اور درباری ہتھیار لگائے ہوئے مودب اور باوقار انداز میں کھڑے ہیں اور شوکت سلطانی سے لرزہ براندام ہیں، انکے ساتھ ان کے صاحبزادے نورالدین بھی تھے جو اس وقت کم سن تھے اور انھوں نے ایسا منظر کبھی نہیں دیکھا تھا وہ دیکھ کر ڈر سے گئے اور مرعوب ہوئے، شیخ قطب الدین نے یہ دیکھ کر بہت بلند آواز کے ساتھ ان سے کہا کہ بابا نورالدین العظمۃ للّٰہ! نورالدین بیان کرتے ہیں کہ یہ آواز سنتے ہی میں نے اپنے اندر ایک عجیب قوت محسوس کی، ساری ہیبت یک لخت کافور ہو گئی اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یہ انسان نہیں ہیں بلکہ بھیڑ بکری ہیں۔"[1]

نماز کے افتتاح کے اذکار اور دعائیں

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نماز کا آغاز جن اذکار اور دعاؤں سے کرتے تھے ان کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ وہ اخلاص وتوحید، تقدیس وتمجید، انابت الی اللہ اور اسکے دربار عالی میں عاجزی و درماندگی کے اظہار و اعتراف کے سوا کچھ نہیں۔

احادیث صحیحہ سے جو اذکار ثابت ہیں ان پر نظر ڈالنے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے، نماز کا افتتاح اور آغاز ان دعاؤں سے ہوتا ہے،

(۱) سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ — اے اللہ تو پاک ہے اپنی تعریفوں کے ساتھ تیرا نام بابرکت ہے

---

[1] سیر الاولیا صفحہ ۳۵۵،۳۵۳

وَتَعَالٰی جَدُّكَ وَلَا اِلٰهَ غَيْرُكَ
اور تیرا رتبہ بڑا ہے اور تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔

(۲) اَللّٰهُمَّ بَاعِدْ بَيْنِيْ وَبَيْنَ خَطَايَايَ كَمَا بَاعَدْتَ بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ، اَللّٰهُمَّ نَقِّنِيْ مِنَ الْخَطَايَا كَمَا يُنَقَّى الثَّوْبُ الْاَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ، اَللّٰهُمَّ اغْسِلْ خَطَايَايَ بِالْمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ، (۳) اَللّٰهُ اَكْبَرُ كَبِيْرًا، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا، سُبْحَانَ اللّٰهِ بُكْرَةً وَاَصِيْلًا، اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ مِنْ هَمْزِهٖ وَنَفْخِهٖ وَنَفْثِهٖ۔

اے اللہ میرے اور میرے گناہوں کے درمیان وہ فاصلہ کردے جو مشرق و مغرب میں ہے۔ اے اللہ مجھے خطاؤں سے ایسا پاک کردے جیسا کہ سفید کپڑا میل سے، اے اللہ میری خطاؤں کو پانی، برف اور اولہ کے شفاف پانی سے دھودے اللہ ہی بڑا ہے۔ تمام تعریفیں زیادہ سے زیادہ اسی کی ہیں۔ خدا کی تعریف ہر صبح و شام ہے اے اللہ میں شیطان مردود کے چھیڑنے، پھونکنے اور تھوکنے سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔

اس کے بعد شیطان سے پناہ مانگی جاتی ہے اور نماز کی حفاظت، قرآن مجید کی تعظیم اور نماز کو شیطان کے شر و مکائد سے محفوظ رکھنے کیلئے بسم اللہ کا آغاز ہوتا ہے اور اس فرمان الٰہی کی تعمیل کی جاتی ہے "وَاِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ"۔

سورہ فاتحہ کا جمال و جامعیت اور زندگی پر اس کا اثر

اب سورہ فاتحہ پر غور کیجئے، یہ سورہ آسمانی معجزات کا ایک لعل بے بہا اور قرآن مجید کی آیات بینات کا ایک بے مثال شہ پارہ ہے، اگر ساری دنیا کے ذہین اور ساری قوموں کے ادیب و انشاپرداز، ماہرین نفسیات، معلمین اخلاق اور روحانی پیشوا یکجا ہو کر کوئی ایسا مضمون تیار کرنا چاہیں جو تمام انسانی طبقات کیلئے ان کی ضرورتوں اور خواہشات کے اختلاف کے باوجود کافی ہو اور وہ اس کے ذریعہ اپنی عبادتوں میں اپنے مافی الضمیر کو مکمل طور پر ادا کر سکیں تو وہ سورہ فاتحہ جیسا مضمون تیار نہیں کر سکتے جو ہر انسانی گروہ اور فرد کی تسکین کیلئے کافی ہے۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۔[1]

آپ کہہ دیجئے کہ اگر (کل) انسان و جنات اس بات کیلئے جمع ہو جائیں کہ اس جیسا قرآن لے آئیں (جب بھی) اس جیسا نہ لا سکیں گے اور خواہ ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جاویں

. . . .

دوسری جگہ اس سورہ کے متعلق ارشاد ربانی ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ۔[2]

اور بالیقین ہم نے آپ کو (وہ) سات آیتیں دیں (جو) مکرر (پڑھی جاتی ہیں) اور قرآن عظیم (دیا)

یہ سورہ حمد سے شروع ہوتی ہے جو شکر و تعریف کا جامع کلمہ ہے اور ان معجزانہ اور بلیغ کلمات میں سے ہے جن کا کسی اور زبان میں صحیح ترجمہ بیحد مشکل بلکہ ناممکن ہے،

حمد ہی وہ بہترین وسیلہ ہے جس کے ذریعہ ایک وفا شعار اور محسن شناس بندہ اپنی دعا و مناجات کا آغاز اور اس مقام محمود اور قیام و سجود (نماز) کا افتتاح کر سکتا ہے،

پھر نمازی یہ محسوس کرتا ہے کہ جس رب کی حمد و ثنا وہ بیان کر رہا ہے اور جس کی عبادت میں مشغول ہے وہ صرف کسی قبیلہ اور قوم، کسی خاندان اور برادری، اور کسی ملک و وطن کا رب نہیں، بلکہ رب العالمین ہے، یہ انقلاب آفریں اور نیا عقیدہ ان تمام مصنوعی اور خود ساختہ تقسیموں کے خلاف اعلانِ جنگ ہے جنھوں نے انسانیت پر ظلم عظیم کیا ہے، اس طرح مسلمان دو وحدتوں کا اعلان کرتا ہے اور ان ہی دونوں وحدتوں پر انسانی معاشرہ کے امن و سکون کی بنیاد ہے اور انھیں دونوں ستونوں پر اسلام انسانیت کی تعمیر نو کا کام انجام دیتا ہے . . . .

. . . . . ایک نوع انسانی کے خالق و صانع کی اور ایک نسل انسانی کے بانی و مورث کی وحدت کی، اس طرح رنگ

---

[1] سورہ بنی اسرائیل ۸۸ [2] سورہ حجر ۸۷

ونسل اور ملک و وطن کی تفریق کے بغیر نسل انسانی کی وحدت ثابت ہوتی ہے اس لئے کہ ہر انسان دوسرے انسان سے دُہرا رشتہ رکھتا ہے، ایک روحانی اور حقیقی طور پر، وہ یہ کہ ان سب کا رب ایک ہے، دوسرے جسمانی وثانوی طور پر وہ یہ کہ وہ سب ایک باپ کی اولاد ہیں۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا[1]

اے لوگو! اپنے پروردگار سے تقویٰ اختیار کرو جس نے تم (سب) کو ایک ہی جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بکثرت مرد اور عورتیں پھیلا دئے، اور اللہ سے تقویٰ اختیار کرو جس کے واسطے سے ایک دوسرے سے مانگتے ہو اور قرابتوں کے باب میں بھی (تقویٰ اختیار کرو) بیشک اللہ تمہارے اوپر نگراں ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ[2]

اے لوگو! ہم نے تم (سب) کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور مختلف قومیں اور خاندان بنا دیا ہے کہ ایک دوسرے کو پہچان سکو، بیشک تم میں سے پرہیزگار تر اللہ کے نزدیک معزز تر ہے، بیشک اللہ خوب جاننے والا ہے پورا خبر دار ہے۔

اس حکم اور اصول کی شرح وتفصیل میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ تعالےٰ نے جاہلیت کا تعصب اور آباؤ اجداد کا فخر تم سے دور فرما دیا ہے اب صرف (دو قسم کے لوگ ہیں) پرہیزگار مسلمان یا بدنصیب فاسق وفاجر، سب انسان

---

[1] سورہ نساء:۔ ۱ [2] سورہ حجرات:۔ ۱۳

آدم کے بیٹے ہیں اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے تھے، کسی عربی کو عجمی پر فضیلت حاصل نہیں، مگر تقویٰ کے ساتھ"۔[۵۱]

نمازی اللہ تعالیٰ کی ان بہترین صفات کریمہ میں سے جن پر وہ پہلے ہی ایمان لا چکا ہے سب سے پہلے اس کی صفت رحمت کا استحضار کرتا ہے، اس لئے کہ اس موقع اور محل کے لئے اس سے بہتر صفت کوئی اور نہیں ہوسکتی، یہ وہ موقع ہے جب مسلمان خشوع و عبادت، دعا و ابتہال، توبہ و انابت اور احتیاج و فقر کا استحضار کرتے ہوئے خدا کے حضور سر بسجود ہوتا ہے، یہ امید اور خوش گمانی کا موقع ہے نہ کہ ناامیدی و بدگمانی کا، اس کے بعد وہ آخرت اور جزاء و سزا کا دن یاد کرتا ہے، وہ دن جس میں اللہ تعالیٰ کی حکومت مطلقہ اور اقتدار اعلیٰ اپنی پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہوگا اور کسی بادشاہ، امیر، اور وزیر کو اس کے حضور میں دم مارنے کا یارانہ ہوگا، لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ[۵۲] (آج کے روز کس کی حکومت ہے؟ بس اللہ واحد و غالب ہی کی ہے)

اس وقت وہ اپنے دل میں آخرت کے اس ایمان کو از سر نو تازہ کرتا ہے جو ہر خوف، باز پرس کے ڈر اور نفس اور ضمیر کی نگرانی کا سرچشمہ ... ہے، ایک مسلمان کو جو ترغیبات سے بھری ہوئی دنیا میں رہتا ہے اس ایمان اور یقین کی جو شدید ضرورت ہے اس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں،

پھر وہ عربی زبان کے (جس میں قرآن مجید نازل کیا گیا اور جس کو نماز کی عالمی اور سرکاری زبان قرار دیا گیا) پورے زور کلام اور بلیغ انداز میں یہ کہتا ہے کہ "وہ نہیں عبادت کرتا کسی کی سوائے اللہ کے اور نہیں مدد چاہتا کسی سے سوا اس کے"[۵۳]، زندگی دراصل عبادت و استعانت کا دوسرا نام ہے، اسی سے

---

[۵۱] ترمذی، و دیگر صحاح [۵۲] سورہ مومن: ۱۶ [۵۳] ضمیر منصوب منفصل کی تقدیم، حصر و تاکید کے فوائد، اور نحو و بلاغت کے دوسرے دقیق نکتوں تک رسائی کے لئے تفسیر، نحو اور بلاغت کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے۔

ایک انسان دوسرے انسان سے، کمزور کا طاقتور سے، غریب کا امیر سے، محکوم کا حاکم سے، اور عابد کا معبود سے رشتہ قائم ہوتا ہے اگر یہ دونوں چیزیں صرف اللہ تعالیٰ کیلئے مخصوص کردی جائیں تو زندگی کے سارے بندھن اور آہنی زنجیریں خود بخود پاش پاش ہو جائیں گی اور شرک اور دوسرے تمام فتنے ختم ہو جائیں گے، وہ یہ سب سے بڑا معاہدہ اور اعلان ہے جو مسلمان اپنے خدا سے دن رات میں بار بار کرتا ہے، اس کو دیکھنا چاہیئے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، نماز سے باہر زندگی کا سارا نظام اس کو دو چیزوں پر ہمہ وقت مجبور کرتا ہے، ایک خضوع و استکانت پر، دوسرے سوال و استعانت پر اور یہی وہ دو چیزیں ہیں جن کے خلاف وہ پہلے ہی بغاوت کر چکا ہوتا ہے،

پھر وہ اللہ تعالیٰ سے صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت کی دعا کرتا ہے، یہ وہ ہدایت ہے جو اسکی سب سے بڑی ضرورت ہے اور جس کے دم سے جنت کی رونق قائم ہے وہ ہدایت جس سے محروم ہو جانے کے بعد کسی چیز کی کوئی قیمت نہیں اور اس سے بہرہ اندوز ہونیکے بعد کسی چیز کے چھوٹنے کا کوئی غم نہیں، اس کی طلب و جستجو انسان کی فطرت میں داخل اور اس کی آرزو قلب و روح میں پیوست ہے، لیکن یہ ہدایت خلا میں قائم نہیں ہو سکتی، یہ اسی وقت قابل فہم اور قابلِ عمل ہو سکتی ہے جب اسکے زندہ اور عملی نمونے ہماری نگاہوں کے سامنے ہوں، یہ وہ لوگ ہیں جن کو ہم تاریخ انسانیت میں انبیاء و صدیقین، شہداء و صالحین کے نام سے یاد کرتے ہیں، قرآن مجید اور تمام گذشتہ آسمانی صحیفوں نے دنیا کے عام انسانوں کو انکی پیروی و تقلید، ان کی محبت و اطاعت، ان کی جماعت میں شمولیت اور ان کی طرف اپنا انتساب کرنے کی دعوت دی ہے،

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ[1]۔ یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت کی تھی سو آپ بھی ان کے طریقہ پر چلئے۔

اور اسی کے ساتھ ان لوگوں سے برأت اور بے تعلقی کا مطالبہ کیا ہے جو ہدایت کی راہ سے ہٹ کر ناشکری، ہوا پرستی اور تباہی و خودکشی کے راستہ پر پڑ گئے، جنھوں نے سرکشی اور انتہا پسندی کی حد کر دی

---

[1] سورہ انعام :۔ ۹۰

اور غضب الٰہی کے مورد قرار پائے، یا دین میں تحریف، تفریط اور ترمیم و تنسیخ کے مرتکب ہوئے اور کھلی ہوئی گمراہی کے شکار ہوئے۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ[۱]

چلا ہم کو سیدھا راستہ، ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا ہے، نہ ان لوگوں کا (راستہ) جو زیر غضب آچکے ہیں اور نہ بھٹکے ہوؤں کا۔

سورۂ فاتحہ کے بعد قرآن مجید کے کسی ایسے حصہ کی تلاوت کا حکم ہے جو یاد ہو اور آسانی سے ذہن میں آجائے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ"[۲]، اس کا مقصد یہ ہے کہ یہ معانی و کیفیات اچھی طرح دل نشین ہو جائیں، ان کو مزید قوت اور غذا حاصل ہو، ان کی اچھی طرح تشریح و تفصیل ہو سکے اور ان کی جڑیں گہری اور مضبوط ہو جائیں، اس لئے کہ نماز عبادت بھی ہے اور تعلیم بھی۔

تدریجی اور فطری عبادت

نمازی سجدہ کی طرف بہت تدریجی طور پر بڑھتا ہے، وہ نماز کا آغاز قیام سے کرتا ہے، رکوع میں وہ دہرا ہو جاتا ہے، ایک لمحہ کیلئے پھر کھڑا ہو جاتا ہے اور اس کے بعد سجدہ کرتا ہے، یہ اس لئے ہے تاکہ نفس میں خشوع و خضوع اور احساس ذلت کی کیفیت زیادہ پیدا ہو سکے اور اس کے احساس تمکنت کو اور چوٹ پہونچے[۳]، اسی طرح تعظیم و تمجید کے الفاظ میں وہ "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيمِ" کہتا ہے، لیکن جب ذلت و عبودیت، شکستگی و خود فراموشی کے آخری درجہ پر پہونچتا ہے یعنی اپنے جسم کے سب سے معزز حصہ کو کائنات کی سب سے حقیر چیز مٹی پر رکھ دیتا ہے جو پیروں سے روندی جاتی ہے اور ذلت و پستی میں ضرب المثل ہے تو اس وقت وہ خدا کی عظمت و علو کا آخری کلمہ "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَىٰ" کہتا ہے۔ اس اعلان اور بیان کی عظمت نمازی کی اس ہیئت اور اس جگہ کی

---

[۱] سورۂ فاتحہ۔ ۵-۶-۷ [۲] سورہ مزمل۔ ۲۰ [۳] حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ رکوع و سجود کے درمیان قیام کی حکمت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں، اس سے وہ فرق نمایاں ہوتا ہے جو انحنا (جو سجدہ کا پیش خیمہ ہے) اور رکوع (جو سر کی تعظیم ہے) میں پایا جاتا ہے۔

عظمت کے ساتھ دل گراو ردو بالا ہو جاتی ہے، وہ دونوں سجدوں کے درمیان چند لمحوں کیلئے بیٹھا بھی ہے تاکہ دوسرے سجدہ کیلئے نیا نشاط اور نیا جذبہ حاصل ہو سکے، غفلت کی کوئی تہ اگر اس کے دل پر جم گئی ہو تو وہ ہٹ جائے اور اس کو اس نئے سجدہ میں نئی لذت اور نئی قوت محسوس ہو،

سجدۂ شوق

یہ وہ سجدۂ شوق ہے جس سے رسم ورواج، دستور وقیاس اور عادات ومالوفات کے وہ سارے خود ساختہ بندھن پاش پاش ہو جاتے ہیں جنھوں نے انسان کو جکڑ رکھا ہے وہ اپنی پیشانی اور اپنا چہرہ خدا کے حضور میں خاک آلود کرتا ہے اور زمام کار تھوڑی دیر کیلئے دل کے حوالہ کر دیتا ہے، اب نہ عبودیت وتذلل، انابت ودل شکستگی اور خشوع وخضوع کی کوئی حد ہوتی ہے، نہ آنسوؤں پر کوئی پابندی، اس وقت اس کے دل کا پیمانہ چھلکنے لگتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس کے سینہ میں کوئی طوفان برپا ہے جو باہر نکلنے کے لئے بیتاب ہے، صحابۂ کرام حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ آپ کے سینۂ مبارک سے ایسی آواز نکلتی تھی جیسے دیگچی چولھے پر چڑھا دی گئی ہو اور وہ کھول رہی ہو،[1] عمرو بن العاصؓ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی صلوٰۃ کسوف کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں، "آپ نے سجدہ کے آخر میں بہت طویل سانس لی اور فرمایا اُف اُف، پھر فرمایا پروردگار کیا تو نے مجھ سے یہ وعدہ نہیں کیا کہ اگر میں ان میں موجود ہوں گا تو ان پر عذاب نازل نہ کرے گا، کیا تو نے یہ وعدہ نہیں کیا کہ جب تک وہ استغفار کرتے رہیں گے تو ان کو عذاب میں مبتلا نہ کرے گا۔[2]

سجدہ پوری نماز میں خدا کے قرب کی سب سے آخری شکل ہے اور خدا کو سب سے زیادہ محبوب وپسندیدہ ہے، حدیث صحیح میں آتا ہے کہ۔

اقرب ما یکون العبد من ربہ وھو ساجد فاکثروا الدعاء۔	بندہ اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب سجدہ میں ہوتا ہے اس لئے اس میں خوب دعا کرو،

---

[1] ابوداؤد و ترمذی (روایت عبداللہ بن شخیر) [2] ابوداؤد و نسائی۔

چنانچہ نمازی اس قیمتی موقع کو غنیمت جانتا ہے اور اپنا کلیجہ نکال کر خدا کے سامنے رکھ دیتا ہے اور زبان قال یا زبان حال سے یوں گویا ہوتا ہے۔[۱]

اللھم انك تسمع کلامی وتری مکانی وتعلم سری وعلانیتی لا یخفی علیك شئ من امری وانا البائس الفقیر المستغیث المستجیر الوجل المشفق المقر المعترف بذنبی، اسألك مسألة المسکین، وابتھل الیك ابتھال المذنب الذلیل وادعوك دعاء الخائف الضریر ودعاء من خضعت لك رقبته وفاضت لك عبرته وذل لك جسمه ورغم لك انفه۔

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

اے اللہ تو میری بات کو سنتا ہے اور میری جگہ کو دیکھتا ہے، اور میرے پوشیدہ وظاہر کو جانتا ہے تجھ سے میری کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی، میں مصیبت زدہ ہوں، محتاج ہوں، فریادی ہوں، پناہ جو ہوں ترساں ہوں، ہراساں ہوں، اپنے گناہوں کا اقرار کرنے والا ہوں، اعتراف کرنے والا ہوں، تیرے آگے سوال کرتا ہوں جیسے بیکس سوال کرتے ہیں، تیرے آگے گڑگڑاتا ہوں جیسے گنہگار، ذلیل وخوار گڑگڑاتا ہے اور تجھ سے طلب کرتا ہوں جیسے خوف زدہ، آفت رسیدہ طلب کرتا ہے، اور جیسے وہ شخص طلب کرتا ہے جس کی گردن تیرے سامنے جھکی ہوئی ہو، اور اس کے آنسو بہہ رہے ہوں اور تن بدن سے وہ تیرے آگے فروتنی کئے ہوئے ہو اور اپنی ناک تیرے سامنے رگڑ رہا ہو، اے اللہ تو مجھے اپنے سے دعا مانگنے میں ناکام نہ رکھ اور میرے حق میں بڑا مہربان اور نہایت رحیم ہوجا۔

---

[۱] فقہائے احناف کے یہاں اس طرح کی دعائیں نوافل کے سجدوں میں درست ہیں فرائض کے سجدوں میں ان کے نزدیک صرف تسبیح "سبحان ربی الاعلیٰ" ہے۔

یہ وہ سجدہ ہے جس سے کسی زمانہ میں پہاڑ تھرا اٹھتے تھے، زمین کانپ جاتی تھی، اور بڑے بڑے جابر بادشاہوں اور مطلق العنان حکمرانوں کی گردنیں اس کی قوت و طاقت کے سامنے جھک جاتی تھیں، اس امت کی مجاہدانہ سرگرمیوں، مہم جوئیوں اور آزمائشوں میں اس عاشقانہ اور والہانہ سجدہ نے اس کی بار بار دستگیری کی ہے اور اس کے عجیب اور حیرت انگیز واقعات تاریخ اسلام میں محفوظ ہیں، کتنے بار اس نے تاریخ کے دھارے بدل دئے ہیں، کتنی مرتبہ اس سے قوموں کی قسمت پلٹ گئی ہے، ہزیمت خوردہ جماعت فتحیاب ہوگئی ہے اور غالب مغلوب نظر آنے لگا ہے۔

نماز میں درود کی حیثیت اور اس کی حکمت

نمازی اپنے قیام، رکوع و سجود اور نماز کے دوسرے اجزا کی تکمیل کے بعد قعدۂ اخیرہ میں تشہد پڑھتا ہے، اور اس کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجتے ہوئے کہتا ہے "السلام علیك ایها النبی ورحمة الله وبرکاته" پھر اللہ تعالےٰ سے اس کی التجا کرتا ہے کہ اپنے نبیؐ پر اپنی رحمتوں اور برکتوں کی بارش فرمائے، اللھم صل علی محمد وعلی آل محمد، کما صلیت علی ابراهیم وعلی آل ابراهیم انك حمید مجید۔

انبیاء کرام ہر زمانہ میں خدا اور خلق کے درمیان ہدایت کا واسطہ اور ذریعہ ہوتے ہیں، انہی کے ذریعہ انسانوں کو خدا کی ذات و صفات کی صحیح معرفت ہوتی ہے اور ان کو خدا کا پاک نام لینے اور عمل صالح کی توفیق ملتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اہل جنت داخلۂ جنت کے وقت خدا کی حمد بیان کرتے ہوئے صرف اتنا ہی نہیں کہیں گے کہ۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰىنَا لِهٰذَا وَمَا	شکر ہے اس خدا کا جس نے ہم کو یہاں تک پہونچایا
كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ[۵]	اور ہم یہاں تک پہونچنے والے نہ تھے اگر اللہ ہماری

---

۵ سورہ اعراف - ۴۳۔

. . . . رہبری کا سامان نہ کرتا،

بلکہ اس کے ساتھ فوراً یہ بھی کہیں گے

لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ۔ [1] بیشک ہمارے رب کے رسول و پیغمبر حق لے کر آئے

. . . . (جو ہماری ہدایت کا ذریعہ بنا)

اس کا راز یہی ہے کہ ان کی ہدایت کا ذریعہ اور طبعی سبب یہی انبیاء کرام تھے، اس دنیا کی جہالت و گمراہی اور آخرت کے عذاب اور تباہی سے نجات انکو انھیں کے واسطہ سے حاصل ہوئی اور وہ اس کے بجا طور پر مستحق ہیں کہ وہ سارے انسان جن کی اصلاح و رہنمائی اور تعلیم و تربیت کیلئے انھوں نے اتنی زبردست کوششیں کیں اور قربانیاں دیں، اور جن کی کوششوں کے نتیجہ میں وہ ہدایت و معرفت اور عبادت و انابت کے اس درجہ پر پہونچے دل سے ان کا شکریہ ادا کریں، ان کو جو نماز کی توفیق ہوئی وہ بھی دراصل اسی پیغام و دعوت زہرہ گداز اور روح فرسا جد و جہد اور ہوش ربا جہاد و قربانی کا نتیجہ ہے جو انھوں نے انسانوں کی ہدایت کے لئے کی، احسان شناسی اور اعتراف حق کا تقاضہ ہے کہ وہ اپنی نماز کو ختم کرنے سے پہلے اس حق کو ادا کرتے چلیں،

حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو دعوت الی اللہ، تبلیغ رسالت اور جہاد کے میدان میں جو رتبۂ عالی اور مقام محمود حاصل ہے وہ کسی اور کو حاصل نہیں، آپ نے جس وقت اپنی دعوت و جہاد کا آغاز کیا اس وقت روئے زمین پر چند گنے چنے اشخاص ایسے تھے جو خدائے واحد کی عبادت کرتے تھے، جزیرۂ عرب میں جہاں آپ کی بعثت ہوئی تھی اللہ تعالےٰ کا ایک بھی عبادت کرنے والا ایسا نہ تھا جو شرک اور دوئی کے شائبہ کے بغیر خدا سی کی عبادت کرتا اور اس کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کرتا اور جبین نیاز جھکاتا ہو، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ خود خانۂ کعبہ کے اندر جو خدا کا پہلا گھر اور توحید کا سب سے بڑا مرکز تھا تین سو ساٹھ بت تھے۔ اور

---

[1] سورہ اعراف۔ ۴۳

اہلِ جاہلیت کی عبادت و نماز کا رکن اعظم تالی پیٹنا اور سیٹی بجانا رہ گیا تھا،

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَّتَصْدِيَةً [1] — اور (خود) ان کی نماز (ہی) خانہ (کعبہ) کے پاس کیا تھی بجز سیٹی بجانے اور تالی بجانے کے،

لیکن جب آپ اس دنیا سے تشریف لے گئے تو اپنے چمن نبوت کو برگ و بار لاتا دیکھ کر آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہو چکی تھیں، آپ کی کوششوں سے اسلام بادو باراں کی طرح جزیرۂ عرب پر محیط ہو چکا تھا۔ لوگ جوق درجوق دین اسلام میں داخل ہونے لگے تھے " وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا " عرب کے چپہ چپہ پر مسجدیں تعمیر ہو رہی تھیں، قریہ قریہ میں اذان کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں، مسلمان پروانہ وار نمازوں کے لئے ہجوم کرتے نظر آ رہے تھے، آخری علالت میں جب آپ خود نماز پڑھانے سے معذور تھے نمازیوں کی تعداد اور ان کی گرمجوشی میں کوئی فرق نہ آیا،

کیا یہ نماز جو کروروں مسلمان آج مشرق و مغرب میں پڑھ رہے ہیں، آپ کا دیا ہوا تحفہ اور آپ کی دعوت و جہاد کا نتیجہ نہیں ہے ؟ کیا ایک مسلمان کیلئے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کا حق ادا کرنیکے بعد یہ مناسب نہ ہوگا کہ وہ اس نماز کے اختتام پر جو سراپا تشکر و اعتراف ہے اپنے نبی ؐ کیلئے بھی سلام و رحمت اور برکت کی دعا کرے کہ یہ سب انھیں کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ اور ان کی جانفشانیوں کا فیض ہے،

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے — یہ سب پود انھیں کی لگائی ہوئی ہے [2]

---

[1] سورہ انفال، ۳۵ [2] اقبال نے اس مضمون کو بڑی خوبی سے ادا کیا ہے وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں

سوختی لات و منات کہنہ را — تازہ کردی کائنات کہنہ را
نے خدا ہا ساختیم از گاو خر — نے حضور کاہناں افگندہ سر
نے سجودے پیش معبودانِ پیر — نے طواف کوشک سلطان و میر
ایں ہمہ از لطف بے پایان تست — فکر ما پروردۂ احسان تست

(مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق)

اس کے علاوہ اس میں شرک سے حفاظت کا بھی ایک اہم پہلو ہے، ظاہر ہے کہ جو شخص اپنے نبی کے لئے اللہ تعالیٰ سے رحمت و برکت کا طلبگار ہوگا اور یہ عقیدہ رکھے گا کہ یہ ان کے حق میں مفید اور باعث مسرت و برکت ہے، اس کے دل میں یہ یقین اچھی طرح راسخ ہو جائے گا کہ دنیا میں کوئی ہستی بھی ایسی نہیں جو اللہ تعالیٰ کی رحمت، اس کے لطف و مغفرت، اسکے جود و عطا اور اکرام و انعام سے بے نیاز ہو یا ذات و صفات میں اللہ تعالیٰ کی شریک و ہمسر ہو،[1] رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین اور سید الاولین والآخرین ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے آپ پر رحمت و سلام بھیجنے کا تمام مسلمانوں کو حکم فرمایا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ	بیشک اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر رحمت بھیجتے ہیں
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔[2]	اے ایمان والو تم بھی آپ پر رحمت بھیجا کرو اور خوب سلام بھیجا کرو،

خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے اوپر درود و سلام بھیجنے کی ترغیب دی ہے اور اپنی امت سے اس کا مطالبہ کیا ہے، جیسا کہ احادیث صحیحہ سے (جو حدِ تواتر تک پہونچ چکی ہیں) پوری طرح ثابت ہے۔[3]

مومن کی خود اعتمادی اور اسکی جماعت اور گروہ کا تعین

اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کا حق ادا کرنے اور اس کے نبی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجنے کے بعد نمازی کو بھی اس سلام و رحمت میں سے کچھ حصہ ضرور ملتا ہے جس کا وہ محتاج اور متمنی ہے اور جو اسلام کا شعار اور مسلمانوں کا سلام ہے وہ کہتا ہے، السلام

---

[1] یہ خیال مولانا محمد منظور نعمانی کی کتاب معارف الحدیث جلد چہارم سے ماخوذ ہے۔ [2] سورۂ احزاب:- ۵۶

[3] صلوٰۃ وسلام کی احادیث، ان کے معانی و حکمتیں اور فوائد و لطائف کے موضوع پر علامہ ابن قیم کی کتاب "جلاء الافہام فی الصلوٰۃ والسلام علی خیر الانام" کا مطالعہ مفید ہوگا۔

علینا وعلیٰ عباد اللہ الصالحین (سلامتی ہو ہم پر اور اللہ کے نیک بندوں پر) اس طرح اسکے مقام اور حیثیت کا تعین اور اظہار ہوتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر جگہ اور ہر دور میں صالحین کے ساتھ ہے اور سلام و اخوت اور سلامتی و رحمت میں ان کا شریک اور برابر کا حصہ دار ہے، یہ بات اس میں امید و خود اعتمادی پیدا کرتی ہے، مایوسی و افسردگی اور (ماہرین نفسیات کی جدید اصطلاح میں) "احساس کمتری" کو زائل کرتی ہے۔ وہ اس کو اس امت کے دوسرے نمازیوں (جن میں بڑے بڑے علماء و فضلاء اور صالحین و اہل اللہ شامل ہیں) کے ساتھ ایک صف میں کھڑا کر دیتی ہے اور سب کو ایک مرتبہ دیتی ہے،

أُولَٰئِكَ حِزْبُ اللَّهِ ۚ أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ[۱] — یہ لوگ اللہ کا گروہ ہیں خوب سن لو کہ اللہ ہی کے گروہ والے فلاح پانے والے ہیں۔

پھر نمازی اپنے لئے دعا کرتا ہے اور عذاب جہنم، عذاب قبر، زندگی و موت کی آزمائشوں اور لغزشوں اور المسیح الدجال کے فتنہ کے شر سے خدا کی پناہ چاہتا ہے[۲]، اس لئے کہ یہ سب چیزیں اس قابل ہیں کہ ان سے خدا کی پناہ مانگی جائے اور ان کے شر اور فتنہ سے حفاظت کی دعا کی جائے، حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "نوحؑ کے بعد کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس نے اپنی قوم کو دجال سے نہ ڈرایا ہو اور میں بھی تم کو اس سے ڈراتا ہوں اور ہوشیار رہنے کی تلقین کرتا ہوں[۳]"۔

---

[۱] سورہ مجادلہ۔ ۲۲ [۲] مسلم نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے فرماتے ہیں کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم انکو یہ دعا اس طرح سکھاتے تھے جس طرح قرآن مجید سکھاتے تھے فرماتے تھے کہو اللھم انی اعوذ بک من عذاب جہنم و اعوذ بک من عذاب القبر و اعوذ بک من فتنۃ المسیح الدجال و اعوذ بک من فتنۃ المحیا والممات، حضرت ابوہریرہؓ سے یہ روایت ہے کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی تشہد سے فارغ ہو تو چار چیزوں سے اللہ تعالےٰ کی پناہ مانگے، عذاب جہنم سے، عذاب قبر سے، زندگی و موت کے فتنہ اور مسیح دجال کے شر سے" [۳] روایت ابو عبیدہ بن الجراحؓ (ترمذی و ابوداؤد) فتنۂ دجال کے موضوع پر تفصیل کے لئے مصنف کی کتاب "تاملات فی القرآن" میں تفسیر سورہ کہف ملاحظہ کی جائے۔

نماز کا حسن اختتام

نماز کے اختتام پر سارے آداب و شرائط کو حسن و خوبی سے ادا کرنے کے بعد اور اس کے تمام حقوق کی تکمیل کے باوجود نمازی اپنی کوتاہی کا اعتراف کرتا ہے اور گویا زبان حال سے یہ کہتا ہے "ماعبدناک حق عبادتک" (ہم نے آپ کی ویسی عبادت نہ کی جیسا عبادت کرنے کا حق تھا۔) وہ نماز کا اختتام ان الفاظ پر کرتا ہے جو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو (جو آپ کے بعد امت میں افضل ترین شخص ہیں) تلقین فرمائے تھے،

اللھم انی ظلمت نفسی ظلماً کثیراً ولا یغفر الذنوب الا انت فاغفرلی مغفرۃ من عندک وارحمنی انک انت الغفور الرحیم۔[1]	اے اللہ میں نے اپنے نفس پر بہت ظلم کیا ہے اور تیرے سوا نہیں ہے کوئی ان گناہوں کو معاف کرنے والا پس تو اپنے خاص عفو و کرم سے مجھے معاف فرما اور مجھ پر رحم فرما، بیشک تو مغفرت کرنے، رحم کرنے والا ہے۔

اس طرح اس افضل عبادت کا خاتمہ اعتراف تقصیر اور احساسِ ندامت پر ہوتا ہے اور کسی صحیفۂ اعمال کے خاتمہ کیلئے اس سے زیادہ مناسب و موزوں چیز کوئی اور نہیں ہو سکتی،

وہ نماز کو اس طرح ختم نہیں کرتا جیسے وہ کسی قید میں تھا اور اب اس کو آزادی نصیب ہوئی ہے یا کسی نے اس کو باندھ دیا تھا اور اب وہ رسیاں توڑ کر آزاد ہو گیا ہے، بلکہ بڑے اطمینان و وقار کے ساتھ اور بڑے خوشگوار پاکیزہ اسلوب میں اس کو ختم کرتا ہے، وہ دائیں بائیں اپنا منہ پھیرتا ہے، اپنے ساتھی نمازیوں پر، سب مسلمانوں پر اور ان فرشتوں پر جو اس موقع پر موجود اور گواہ ہوتے ہیں سلام بھیجتا ہے اور کہتا ہے السلام علیکم ورحمۃ اللہ، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی اور عالم میں منتقل ہو گیا تھا اور حاضر و موجود سے اس کا کوئی تعلق باقی نہیں رہ گیا تھا اب وہ پھر اپنی پہلی جگہ اور اپنی زندگی کے پہلے مرکز پر واپس آگیا ہے اور جو لوگ آس پاس ہیں ان کو سلام کر رہا ہے جیسے کسی سفر اور طویل غیر حاضری کے

---

[1] صحیح بخاری

بعد واپس آنے والے کا معمول اور دستور ہے[1]،

حقیقی نماز کا غیر اللہ کی بندگی اور جاہلیت کی زندگی سے کوئی ربط نہیں

اخلاص اور خشوع وخضوع سے بھری ہوئی نماز کا (جس کو ایک مسلمان اس کی روح وحقیقت اور آداب و اوقات کا لحاظ رکھتے ہوئے ادا کرتا ہے) غیر اللہ کی بندگی سے کوئی جوڑ نہیں، دونوں میں کھلا ہوا تضاد ہے، وہ غیر اللہ کی عبادت سے (جس کے اہم مظاہر شرک وبت پرستی اور اوہام پرستی ہیں) اور غیر اللہ کی غلامی سے (جس کا مظاہرہ عام طور پر سلاطین وامراء اہل ثروت واقتدار اور حاکموں کی خوشامد، ان سے خوف، ان کو نفع وضرر کا مالک سمجھنے، ظلم وزبردستی میں ان کا ساتھ دینے، عقیدہ وضمیر کو نیلام پر چڑھا دینے کی شکل میں ہوتا ہے) کوئی میل نہیں کھاتی، اور کسی جگہ اور کسی موقع پر اس سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتی،

یہ بندگی اور غیر اللہ کی غلامی، نماز کے سارے ارکان، خدا سے نمازی کے عہد وپیمان اور نماز میں پڑھی جانے والی ساری چیزوں کے سراسر منافی، اور ان سے برسرِ پیکار ہیں، وہ سب سے پہلے تکبیر تحریمہ "اللہ اکبر" کے منافی ہے جس سے وہ نماز کا آغاز کرتا ہے، "الحمد للہ رب العالمین" کے منافی ہے اس لئے کہ نہ اس کے سوا کوئی رب ہے نہ کوئی حمد کے لائق۔ وہ "اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" کے منافی ہے اس لئے کہ عبادت و استعانت صرف اسی کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے، وہ رکوع وسجود کے بھی منافی ہے اس لئے کہ جسمانی وروحانی اور ظاہری وباطنی دونوں قسم کے رکوع اور سجدے صرف اللہ تعالیٰ ہی کیلئے ہیں یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں کو نماز کی یہ حقیقت نصیب ہوئی وہ ملوک وسلاطین کے سامنے سب سے زیادہ بے باک حق کہنے میں سب سے زیادہ جری اور پیش پیش، دنیا اور اسباب دنیا کے معاملہ میں سب سے زیادہ زاہد اور

---

[1] یہ نکتہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے رسالہ "قبلہ نما" سے ماخوذ ہے۔

قناعت پسند، اور ظلم و گناہ کے ساتھ تعاون میں سب سے زیادہ دور رکھے[1]،

اخلاق و رجحانات پر نماز کا اثر

نماز اخلاق رذیلہ، برائی و بے حیائی کے کاموں، اور وقتی لذت پسندی اور ہوس پرستی کو ختم کرنے میں جو تاثیر رکھتی ہے وہ کلمۂ توحید کے سوا کسی اور چیز میں نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

اُتْلُ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِؕ وَ لَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُؕ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ۔[2]	جو کتاب آپ پر وحی کی گئی اسے پڑھا کیجئے اور نماز کی پابندی رکھیے، بیشک نماز بے حیائی اور ناشائستہ کاموں سے روکتی رہتی ہے، اور اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے اور اللہ تمہارے سب کاموں کو جانتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ انسان کا رخ تبدیل کر دیتی ہے، اور اس کو ایک نیا ذوق، نئی طلب اور نیا ذہن

---

[1] ماضی قریب میں بھی اس کی بعض غیر معمولی مثالیں ملتی ہیں، حضرت سید احمد شہیدؒ کے ایک رفیق اور صحبت یافتہ کے متعلق تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ ان کو ایک مرتبہ ایک مسلمان طبیب کے پاس جانے کی نوبت آئی، بہت سن رسیدہ اور معمر تھے، دوسری طرف طویل علالت نے بہت کمزور کر دیا تھا، حکیم صاحب بہت فاصلہ پر رہتے تھے، بڑی مشقت سے پیدل چل کر وہاں پہونچے اور دیر تک حکیم صاحب کے منتظر رہے، حکیم صاحب برآمد ہوئے تو انھوں نے صلوٰۃ غوثیہ کی نیت باندھی، یہ نماز بغداد کی طرف منھ کر کے خاص ہئیت اور طریقہ کیساتھ پڑھی جاتی ہے ان صاحب نے انکو جب یہ عمل کرتے دیکھا تو انھوں نے اپنے شاگرد سے فوراً واپس چلنے کو کہا اور اسی وقت روانہ ہو گئے، راستہ میں انکے شاگرد نے دریافت کیا کہ اتنی تکلیف اٹھا کر تو آپ وہاں پہونچے، انکا اتنی دیر انتظار کیا اور جب وہ آ گئے تو آپ واپس چلے آئے، یہ بات کچھ سمجھ میں نہ آسکی، انھوں نے جواب دیا، اللہ تمہیں ہدایت دے کیا تم نے دیکھا نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور شرک میں مبتلا تھے، شاگرد نے کہا ہمیں تو انکے فن سے سروکار ہے انکے عقائد و اعمال یا انکی ضلالت و گمراہی سے ہمارا کیا تعلق، انھوں نے فرمایا کہ اللہ تمہیں سمجھ دے اگر میں اس بات سے چشم پوشی کر لیتا اور خاموشی اختیار کرتا تو رات کو میں اپنے رب کے سامنے کیا منہ لیکر کھڑا ہوتا اور دعائے قنوت میں کس زبان سے یہ الفاظ ادا کرتا کہ "نخلع و نترک من یفجرک" (جو تیری نافرمانی کرتا ہے اور تیرے حکموں اور حدوں کو توڑتا ہے ہم اس سے علیحدہ ہوتے ہیں اور اسکو چھوڑتے ہیں) [2] سورہ عنکبوت - ۴۵

عطا کرتی ہے وہ اس کو حقیر و پست کاموں سے نکال کر بلند کاموں کی طرف لے جاتی ہے، اسکے دل میں ایمان کی محبت اور ایمان کا شوق پیدا کرتی ہے اور کفر و فسق و نافرمانی اس کیلئے مکروہ و مبغوض بنا دیتی ہے لیکن یہ سب اسی وقت ہوتا ہے جب یہ نماز حقیقی ہو اور وہ زندگی، حرارت اور قوت سے لبریز ہو جب حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم کو توحید اور تقویٰ و طہارت کی زندگی اختیار کرنے کی دعوت دی اور ظلم و حق تلفی اور ناپ تول میں کمی کے انجام سے ان کو ڈرایا تو انھوں نے حضرت شعیبؑ کی زندگی میں اس نئی دعوت کے سرچشمہ اور اس اختلاف و انکار کے سررشتہ کی جستجو کی اور اس نتیجہ پر پہونچے کہ اس ساری کشمکش اور اختلاف اور اس سارے ہنگامہ کی ذمہ دار نماز ہے جس کو بارہا انھوں نے حضرت شعیبؑ کو پڑھتے دیکھا تھا اور یہی وہ ظاہری عمل تھا جس سے ان کی زندگی خالی اور وہ اس سے ناآشنا تھے بس گویا انھوں نے اس دعوت و تبلیغ اور اس انکار و تردید کا راز معلوم کر لیا اور اپنے نزدیک پہیلی بوجھ لی کہ حضرت شعیبؑ اپنی قوم کے اس قدیم و موروثی مذہب اور اپنے گرد و پیش کی اس قدیم طرز زندگی اور عادات و اخلاق کے کیوں اس قدر مخالف ہیں، انھوں نے بڑی سادگی اور معصومیت کے ساتھ حضرت شعیبؑ سے کہا،

أَصَلٰوتُكَ تَأْمُرُكَ أَنْ نَتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَاؤُنَا أَوْ أَنْ نَفْعَلَ فِي أَمْوَالِنَا مَا نَشَاءُ إِنَّكَ لَأَنْتَ الْحَلِيمُ الرَّشِيدُ[۱] ۔	کیا یہ تمہاری نماز تمہیں تعلیم دیتی ہے کہ ہم ان چیزوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے بڑے کرتے آئے ہیں یا اسکو چھوڑ دیں کہ ہم اپنے مال کے ساتھ جو چاہیں کریں، واقعی تم ہی تو بڑے عقلمند بڑے دین دار ہو۔

نماز کی تیاریوں کا راز اور اس کیلئے مناسب و سازگار فضا بنانے کا فائدہ

اللہ تعالیٰ نے نماز کو عزت و تعظیم، رقت و خشوع و وقار و سنجیدگی، تعاون و اجتماعیت کی ایک ایسی فضا اور ایسا ماحول عطا کیا ہے جس کی نظیر کسی دوسرے

---

[۱] سورہ ہود - ۸۷

مذہب وملت کی عبادت میں نہیں ملتی۔

اسکا اندازہ ہمیں ان حکیمانہ احکام و قوانین اور ہدایات و تعلیمات سے ہوگا جو آگے بیان کی جائیں گی،

اذان نماز کا اعلان، اور اسلام کی دعوت

نماز کے اعلان اور دعوت کیلئے جو ندا (اذان) شارع نے مقرر فرمائی ہے اس میں صرف نماز کے مقاصد اور نماز کے معانی و حقائق کا اظہار نہیں بلکہ اس میں اسلام کے مقاصد، توحید کے شعار، اور دین کی روح کی بھی پوری وضاحت، بلاغت، اختصار اور حسن و نغمہ کے ساتھ اس طرح سمو دی گئی ہے کہ اس اعلان نے (جو موذن دن میں پانچ مرتبہ مسجد کے میناروں سے بلند کرتا ہے) اسلام کی متعین اور ٹھوس دعوت کی شکل اختیار کر لی ہے، نماز کی یہ ندا جو سادگی و پرکاری کا عجیب نمونہ ہے بہت سے غیر مسلموں کے سینوں کو اسلام کے لئے کھول چکی ہے اور دوسرے مذاہب و ادیان کے عبادات کے اعلان کے طریقوں سے بالکل مختلف ہے[1]، یہ وہ منفرد اور واحد ندا ہے جو ہر قسم کے ظاہری اشکال اور آلات وغیرہ کی مدد سے پاک اور محفوظ ہے اور اس میں دین کا لب لباب اور خلاصہ آگیا ہے۔

---

[1] اذان کس طرح شروع ہوئی اسکے احکام کس طرح دئے گئے اور دوسرے مذاہب کے طریقوں سے ہٹ کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس طریقہ کو کیسے اختیار کیا جو اللہ تعالے نے آپکو تلقین فرمایا تھا، اس سلسلہ میں بہت سی صحیح احادیث وارد ہوئی ہیں ابو داؤد میں ابو عمیر بن انس رضؓ سے روایت ہے وہ انصار میں اپنے دادیالی رشتہ داروں سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اسکی فکر ہوئی کہ نماز کیلئے لوگوں کو کس طرح جمع کیا جائے، بعض لوگوں نے مشورہ دیا کہ نماز کیوقت ایک جھنڈا نصب کر دیا جایا کرے اسکو دیکھ کر لوگ ایک دوسرے کو آگاہ کر دیں گے، آپنے اس تجویز کو پسند نہیں فرمایا، پھر سنکھ یا قرنا کا ذکر کیا گیا جو یہود کے یہاں رائج تھا آپنے اسکو بھی پسند نہ کیا اور یہ فرمایا کہ یہ یہودیوں کا طریقہ ہے، پھر آپکے سامنے ناقوس کا ذکر کیا گیا، آپنے فرمایا کہ یہ نصاریٰ کا شعار ہے اس پر عبداللہ بن زید انصاری رضؓ واپس آگئے مگر آنحضرتؐ کی فکر میں وہ بھی شریک تھے چنانچہ انھوں نے رات کو خواب میں اذان کی تعلیم پائی اور صبح کو آنحضرتؐ کے پاس آئے اور عرض کیا کہ نیند اور بیداری کی درمیانی حالت میں ایک شخص آیا اور اسنے مجھے اذان کی تعلیم دی۔ اور حضرت عمر رضؓ بھی اس سے پہلے یہی خواب دیکھ چکے تھے لیکن وہ ۲۰ دن سے اسے چھپائے ہوئے تھے۔ پھر آپنے حضور کو خبر دی تو ارشاد ہوا کہ اب تک کیوں نہیں بتایا تھا؟ آپنے عرض کیا کہ عبداللہ بن زید مجھ سے پہلے دیکھ چکے تھے اسلئے مجھے شرم آرہی تھی۔ اس پر حضورؐ نے حضرت بلال رضؓ کو حکم دیا کہ عبداللہ بن زیدؓ جیسا بتائیں ویسا ہی کرو۔ چنانچہ حضرت بلالؓ نے اذان دی۔ صنہ۵

وہ اللہ تعالٰے کی عظمت وکبریائی کا اعلان بھی ہے کہ وہ ہر بڑے سے بڑا ہے، پھر اس میں دونوں شہادتیں موجود ہیں، توحید کی شہادت بھی اور رسالت کی شہادت بھی، اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمدا رسول الله، اس میں نماز میں حاضری کی دعوت اور اس کا اظہار ہے کہ وہ دنیا وآخرت دونوں جگہ فلاح کا راستہ ہے، اور اس کے بغیر فلاح کسی جگہ سے حاصل نہیں کی جاسکتی، ان سب باتوں کی وجہ سے اذان ایک ایسی جامع اور مکمل دعوت اور بلیغ اعلان بن گئی ہے جو قلب اور عقل دونوں کو بیک وقت مخاطب کرتا ہے، مسلم وغیر مسلم دونوں کو متوجہ کرتا ہے، سست آدمی میں چستی پیدا کرتا اور غافل کو ہوشیار و بیدار کرتا ہے۔

حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اس مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"حکمت الٰہی اس کی متقاضی تھی کہ اذان صرف اعلان اور تنبیہ ہو کر نہ رہ جائے بلکہ دین کے شعائر میں داخل ہو جائے، اور غافل کے لئے اس کی حیثیت محض تنبیہ کی نہیں بلکہ دین کی تبلیغ و دعوت کی بھی ہو اور اس کی تعمیل اطاعت وفرماں برداری کی علامت اور نشانی سمجھی جائے، اسی لئے ضروری ہوا کہ اس میں خدا کا ذکر بھی ہو، دونوں کلمۂ شہادت ہوں، نماز کی دعوت ہو تاکہ اس مقصد کی (جو اوپر بیان کیا گیا) اچھی طرح ترجمانی ہو سکے"[۵]

پاکی اور اسکے اہتمام کے اثرات وفوائد

نماز کے لئے طہارت اور وضو کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ تعالٰے کا ارشاد ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ	اے ایمان والو جب تم نماز کو اٹھو تو اپنے چہرے اور
فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ	اپنے ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھو لیا کرو اور اپنے سروں
وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ	پر مسح کر لیا کرو اور اگر تم حالت جنابت میں ہو تو (سارا جسم)
وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَى أَوْ عَلَى سَفَرٍ أَوْ جَاءَ	پاک صاف کر لو اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے

۵ حجۃ اللہ البالغہ ج ا صـ۱۷۳

أَحَدٌ مِّنكُم مِّنَ الْغَائِطِ أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ	کوئی استنجا سے آئے یا تم نے عورت سے صحبت کی ہو
تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا	پھر تم کو پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے تیمم کر لیا کرو یعنی اپنے
فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُم مِّنْهُ	چہروں اور ہاتھوں کو اس سے مسح کر لیا کرو، اللہ نہیں
مَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُم مِّنْ	چاہتا کہ تمہارے اوپر تنگی ڈالے بلکہ وہ (تو یہ)
حَرَجٍ وَلَٰكِن يُرِيدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ	چاہتا ہے کہ تمہیں خوب پاک صاف رکھے اور تم
نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ۔[1]	پر اپنی نعمت پوری کرے تاکہ تم شکرگزاری کرو۔

پاکی کا یہ اہتمام اور وضو اگر ایمان و احتساب[2] کے ساتھ عمل میں آئے تو وہ انسان کے اندر ایک قسم کی بیداری اور چستی، خیال و لحاظ کی کیفیت اور نماز کے استقبال اور اس کے نور و سکینت کو قبول کرنے کی استعداد و صلاحیت پیدا کر دیتا ہے،

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے وضو و طہارت کے فوائد کی تکمیل اور نماز کی تیاری کے لئے (جو درحقیقت مومن کی اللہ تعالےٰ سے سرگوشی اور دعا و مناجات ہے) مسواک کرنے کی بھی تعلیم فرمائی ہے اور بہت تاکید کے ساتھ اس کی ترغیب دی ہے، اور یہاں تک ارشاد فرمایا کہ "اگر اپنی امت پر

---

[1] سورہ مائدہ - ۶ [2] ایمان واحتساب کے معنی یہ ہیں کہ اس کو اللہ تعالےٰ کے وعدوں اور اس کے رسولؐ کے بتائے ہوئے اجر و ثواب پر پورا یقین ہو اور وہ ان اعمال کو شوق و عظمت کے ساتھ انجام دے، اعمال کی قبولیت اور وزن میں اس کو بڑا دخل ہے، حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "جب مسلم (یا مومن) بندہ وضو کرتا ہے اور اپنا منہ دھوتا ہے تو اس کے چہرے سے ہر گناہ جو اس نے اپنی نگاہوں سے کیا ہے پانی کے ساتھ یا پانی کے آخری قطرہ کے ساتھ دھل جاتا ہے، جب وہ اپنے ہاتھ دھوتا ہے تو اسکے ہاتھوں کے سارے گناہ جو اسکے ہاتھوں سے سرزد ہوئے ہیں وہ پانی کیساتھ یا پانی کے آخری قطرہ کے ساتھ نکل جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ گناہوں سے بالکل صاف و پاک ہو جاتا ہے"، صحیح مسلم و مؤطا میں اتنا اضافہ ہے کہ جب وہ اپنے پیر دھوتا ہے تو اسکے پیروں سے جن سے چلکر اس نے کوئی گناہ کیا ہے سب گناہ دھل جاتے ہیں۔

مشقت کا ڈر نہ ہوتا تو میں لوگوں کو ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا ہ[1]،

مساجد اور مسلم معاشرہ میں انکی اہمیت و مرکزیت

اس مقصد کیلئے ایسی مساجد تعمیر کی گئیں جو اپنی سادگی و سنجیدگی، سکینت و لطافت، اپنی پرکیف روحانی فضا، پرسکون ماحول اور توحید کے کھلے ہوئے نمایاں شعائر میں دوسرے مذاہب و اقوام کی عبادت گاہوں سے بالکل مختلف ہیں،

فِی بُیُوتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْکَرَ فِیْھَا اسْمُہٗ یُسَبِّحُ لَہٗ فِیْھَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ، رِجَالٌ لَّا تُلْھِیْھِمْ تِجَارَۃٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ وَاِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَاۗءِ الزَّکٰوۃِ یَخَافُوْنَ یَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِیْہِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ[2]، . . . .

(وہ) ایسے گھروں میں ہیں جن کے لئے اللہ نے حکم دیا ہے کہ ان کا ادب کیا جائے اور ان میں اس کا نام لیا جائے ان میں وہ لوگ صبح و شام اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں، ایسے لوگ جنہیں نہ تجارت غفلت میں ڈال دیتی ہے نہ (خرید و) فروخت اللہ کی یاد سے اور نماز پڑھنے سے اور زکوٰۃ دینے سے، وہ ڈرتے رہتے ہیں ایسے دن سے جس میں دل اور آنکھیں الٹ جائیں گی،

وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰہِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰہِ اَحَدًا[3]

اور یہ کہ مسجدیں (خاص) خدا کی ہیں تو خدا کے ساتھ کسی اور کی عبادت نہ کرو۔

وَاَقِیْمُوْا وُجُوْھَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْہُ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ[4]۔

اور ہر سجدہ کی جگہ اپنا رخ سیدھا کیا کرو اور اسے (یعنی اللہ کو) پکارا کرو دین کو اسی کے واسطے خالص کرکے۔

---

[1] بخاری و مسلم [2] سورہ نور: ۳۶-۳۷ [3] سورہ جن: ۱۸ [4] سورہ اعراف: ۲۹

يٰبَنِىٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ۔[1] اے اولادِ آدم! ہر سجدہ گاہ کے موقع پر اپنا لباس پہن لیا کرو۔[2]

مساجد بجا طور پر مسلمانوں کا دینی مرکز اور ان کی تعلیم و تربیت اور اصلاح و رہنمائی کا سرچشمہ بن گئی تھیں، ان میں مسلمانوں کے اجتماعی و دینی معاملات حل کئے جاتے تھے، زندگی کے مختلف شعبوں اور مختلف مہموں میں ان کو احکام دیئے جاتے تھے، جب کوئی بڑا واقعہ پیش آتا یا کوئی مہم درپیش ہوتی اور مسلمانوں کو نئی ہدایت اور نئی رہنمائی کی ضرورت ہوتی تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم حکم دیتے کہ مسلمانوں میں اعلان کر دیا جائے "الصلاۃ جامعۃ"[3] (یعنی دوسرے محلوں اور دور دور کے مسلمان بھی آج نماز مسجد نبوی میں پڑھیں کہ کوئی اہم بات کہنی ہے)

مسجدوں کو یہ مرکزیت و جامعیت برابر حاصل رہی، ساری زندگی اسی محور کے گرد گھومتی تھی، علم و ہدایت کے سرچشمے، اصلاح و ارشاد کی تحریکیں، جہاد و سرفروشی کی لہریں سب اسی مرکز سے پیدا ہوتی اور پھیلتی تھیں، آج بھی ان مساجد میں وہ پرانے اثرات باقی ہیں جن پر غیر مسلموں اور غیر مذاہب کے پیرؤں کو حسد ہوتا ہے، کبھی وہ ان کو حسرت کے ساتھ دیکھتے ہیں، کبھی ڈر اور خوف کے ساتھ، مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کیلئے یہ ضروری ہے کہ ان مساجد کو مسلم معاشرہ اور مسلم قیادت میں وہ مرکزیت و اہمیت دوبارہ حاصل ہو جو پہلے حاصل تھی،

ایمانی و روحانی فضا کی تکمیل کیلئے بعض ہدایات و آداب

نماز کی ایمانی و روحانی فضا کی تقویت و تکمیل کے لئے جو آداب اور حکیمانہ و پیغمبرانہ تعلیمات و ہدایات دی گئی ہیں وہ اس میں خشوع و خضوع اور

---

[1] سورہ اعراف ۳۱ [2] ان آیات کے ترجمے میں اس تفسیر کو اختیار کیا گیا ہے جسمیں مسجد یا مساجد سے مقامات سجود (مسجدیں) مراد لی گئی ہیں دوسرے مترجمین و مفسرین نے اس سے اعضاء سجود اور نماز مراد لی ہے [3] واقعات اور مثالوں کیلئے ابواب الصلاۃ ما بین یدی الساعۃ و ابواب صلوٰۃ الخسوف صحاح میں ملاحظہ کیجئے۔

سکینت و وقار پیدا کرنے کی ضامن ہیں، حضرت انسؓ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ "اگر تم میں سے کوئی شخص نماز میں ہے تو وہ اپنے رب سے ہمکلام ہے، اس کو چاہیئے (کہ ضرورت پڑنے پر) اپنے آگے یا اپنے داہنے نہ تھوکے بلکہ بائیں طرف اور پیروں کے نیچے" [۱] نمازی کو اس کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ امام کی تقلید واتباع کرے، اسلئے کہ اس میں انتشار وافتراق سے حفاظت اور اپنی خواہشات سے رہائی ہے نہ اسکو امام سے آگے بڑھنا چاہیئے نہ اس سے پیچھے رہنا چاہیئے، اسی طرح اسکو صرف ایک ہیئت اور ایک شکل پر باقی رہنے کی بھی اجازت نہیں: خواہ اس کو اس میں کتنی ہی لذت محسوس ہو رہی ہو اور وہ دیر تک اسی ہیئت پر رہنا چاہتا ہو، اس لئے کہ نماز کی روح اطاعت وفرماں برداری اور رسول کی تقلید و پیروی ہے، نہ کہ وجدان و ذوق کی تابعداری اور خواہشات نفس پر عمل، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "صلوا کما رأیتمونی اصلی" [۲] (نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھکو نماز پڑھتے دیکھا ہے) چنانچہ مقتدی اس پر مجبور ہے کہ ساری حرکات وسکنات میں امام کی پیروی کرے اور سر مو بھی اس میں فرق نہ پڑے "انما جعل الامام لیؤتم بہ" (امام اس لئے بنایا جاتا ہے تاکہ اس کی اقتدا کی جائے [۳])

مساجد میں اللہ تعالےٰ کی عظمت سب سے زیادہ نمایاں ہوتی ہے، یہی وہ جگہ ہے جہاں کسی مخلوق کی کوئی عزت یا کسی "بڑے" کی کوئی خصوصیت نہیں، وہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں آقا و غلام حاکم و محکوم اور امیر و فقیر سب مساوی نظر آتے ہیں، وہ "منیٰ" کی طرح ہے جس کے متعلق حدیث میں آیا ہے "منیٰ مناخ لمن سبق" [۴] (منیٰ اسی کی فرودگاہ ہے جو پہلے پہونچ جائے)۔

اسلام ان بدعتوں اور جدتوں سے بالکل ناآشنا ہے جو سلاطین و امراء نے اپنا امتیاز اور تفوق ظاہر کرنے کے لئے عہد صحابہؓ کے بعد وضع کر لی تھیں، ان مساجد میں اگر کچھ امتیاز، فوقیت اور آگے پیچھے

---

[۱] بروایت عبداللہ بن مسعودؓ (متفق علیہ) [۲] بخاری (باب الاذان للمسافر اذا کانوا جماعۃ) [۳] مسلم روایت انس بن مالکؓ (باب ائتمام المأموم بالامام) [۴] ترمذی روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا (مرفوع)

کا فرق ہے بھی تو وہ علم قرآن، فقہ اور تقویٰ میں حظ وافر کی بنیاد پر، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ "لیلینی منکم اولوا الاحلام والنھی ثم الذین یلونھم ثلاثا"[1] (چاہیے کہ مجھ سے قریب رہیں اہل عقل وفہم، پھر جن کا مرتبہ ان کے بعد ہے، پھر جو ان کے بعد آتے ہوں)

جماعت اور اسکی اہمیت وفضیلت

فرض نماز جماعت کے ساتھ ادا کرنے کا حکم ہے اور اسلام میں نماز کا مزاج اور اس کی صحیح شکل یہی ہے "وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ"[2] (رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ) یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کرام اس پر اس طرح مداومت کرتے رہے کہ گویا وہ بھی نماز کا جزو اور نماز کے اندر داخل ہے، آپ نے اپنے مرض وفات میں بھی اس کو ترک نہ فرمایا، صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ۔

ثقل النبی صلے اللہ علیہ وسلم فقال اصلی الناس؟ قلنا لاھم ینتظرونک یارسول اللہ قال ضعوالی ماءً فی المخضب ففعلنا فاغتسل ثم ذھب لینوء فاغمی علیہ ثم افاق فقال اصلی الناس؟ قلنا لاھم ینتظرونک قال ضعوالی ماءً فی المخضب ففعلنا فاغتسل ثم ذھب لینوء فاغمی علیہ ثم افاق فقال اصلی الناس؟ قلنا لاھم ینتظرونک

آنحضرتؐ جب بیمار ہوئے تو (نماز کے وقت) فرمایا کیا لوگوں نے نماز پڑھ لی ہم نے کہا نہیں! لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا برتن میں میرے لئے پانی رکھدو ہم نے رکھدیا تو آپ نے وضو فرمایا پھر آپ نے اٹھنا چاہا تو بیہوش ہوگئے۔ پھر افاقہ ہوا تو آپ نے سوال فرمایا کیا لوگوں نے نماز پڑھ لی؟ ہمنے عرض کیا نہیں! وہ تو آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا میرے لئے برتن میں پانی رکھدو۔ آپ نے وضو فرمایا اور اٹھنا چاہا کہ پھر بیہوش ہوگئے پھر جب افاقہ

---

[1] صحیح مسلم. کتاب الصلوٰۃ باب تسویۃ الصفوف" وابو داؤد ونسائی [2] سورہ بقرہ ۔ ۴۳ ۔

قال ضعوا لی ماءً فی المخضب. فاغتسل ثم ذهب لینوء فاغمی علیه ثم افاق فقال اصلی الناس؟ قلنا لا، هم ینتظرونك والناس عکوف فی المسجد ینتظرونه لصلوٰة العشاء الآخرة (قالت) فأرسل صلے اللہ علیه وسلم الی ابی بکر اَن یصلی بالناس[1]، (الی آخره)

ہوا تو آپ نے وہی سوال کیا کہ کیا لوگوں نے نماز پڑھ لی؟ ہم نے پھر وہی جواب دیا کہ نہیں وہ تو آپ کے انتظار میں ہیں لوگوں کا یہ حال تھا کہ وہ مسجد میں بیٹھے عشا کی نماز کا انتظار کر رہے تھے اس لئے آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو نماز پڑھانے کے لئے بلوا بھیجا۔ الخ

صحابہ کرام جماعت کی پابندی کا جس قدر اہتمام کرتے تھے اس کا اندازہ مندرجہ ذیل حدیث سے ہوگا۔

عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں:۔

لقد کان الرجل یوتی به یهادی بین الرجلین حتی یقام فی الصف[2]۔

آدمی کو اس حالت میں لایا جاتا کہ دو آدمی اس کو سہارا دیئے ہوئے ہوتے اور صف میں کھڑا کر دیا جاتا۔

ان ہی سے دوسری روایت ہے۔

رأیتنا ما یتخلف عن الصلوٰة الا منافق قد علم نفاقه او مریض[3]۔

جماعت سے صرف دو قسم کے آدمی پیچھے رہتے تھے وہ منافق جن کا نفاق سب کو معلوم ہو یا مریض!

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جماعت چھوڑنے والوں پر سخت نکیر فرماتے تھے، کتب صحاح میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کچھ لوگوں کو بعض نمازوں میں نہ دیکھا تو فرمایا میں سوچتا ہوں کہ ایک آدمی کو حکم دوں کہ وہ نماز پڑھائے پھر ان لوگوں کے پاس جاؤں جو جماعت سے پیچھے رہ جاتے ہیں پھر حکم دوں کہ لکڑیوں کو جمع کرکے ان کو آگ میں جلا دیا جائے۔[4]

---

[1] صحیحین [2] مسلم، ابوداؤد، نسائی [3] مسلم [4] صحیح مسلم (باب فضل الصلوٰة جماعة وبیان التشدید فی التخلف عنها)

جماعت کی بعض حکمتیں اور آداب و مصالح

نماز با جماعت کے اندر اللہ تعالیٰ نے بہت سی نازک حکمتیں اور مصلحتیں رکھی ہیں ان میں بہت سے اجتماعی اور اخلاقی فوائد ہیں (مثلاً وحدت و اجتماع، اور تعاون و تعارف وغیرہ) جن پر علماء اسلام اور اہل قلم نے بہت کچھ لکھا ہے اور بار بار اس کی تشریح و وضاحت کی گئی ہے، لیکن اس میں اس کے علاوہ بھی بہت سی نازک اور اہم حکمتیں و مصلحتیں ہیں، جن تک بہت سے معاصر اہل قلم و اہل فکر کی رسائی نہیں ہو سکی ہے[۱]

ان فوائد اور حکمتوں میں سے ایک حکمت یہ ہے کہ جب بہت سے مسلمان اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر امید کا دامن تھامے ہوئے، خوف سے بھرے ہوئے، سر تسلیم خم کئے ہوئے جمع ہوتے ہیں تو ان کے اس اجتماع کی وجہ سے برکتوں کا نزول ہوتا ہے، رحمتیں اترتی ہیں اور ان کو اپنے سایہ میں لے لیتی ہیں، استسقاء کی اجتماعی دعا جمعہ و جماعت اور حج کے اجتماعات کا راز یہی ہے[۲]

اس کی وجہ سے عبادات اور ان پر مداومت آسان ہو جاتی ہے اور اس کی تکمیل و ترقی اور کثرت و زیادتی میں مقابلہ اور مسابقت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اگر ان عبادات میں انفرادیت یا ناواقفیت کی وجہ سے کوئی خلل واقع ہو جاتا ہے تو جماعت کی وجہ سے اس کو دور کرنے میں بڑی سہولت ہوتی ہے، نماز کے احکام و آداب کا سیکھنا اور سمجھنا سہل ہو جاتا ہے۔ اور علماء و فقہاء اور اللہ کے مخلص بندوں کی نقل و پیروی کے بہتر مواقع حاصل ہوتے ہیں۔

اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ بعض اوقات بعض مخلصین کے اخلاص، انابت اور توجہ الی اللہ کی وجہ سے پوری جماعت اللہ تعالیٰ کے سایہ میں آجاتی ہے اور کسی ایک مرد خدا کا صدق و اخلاص بہت سے افسردہ و شکستہ دلوں کے لئے حیاتِ نو کا پیغام اور بہت سے پست ہمتوں کے لئے مہمیز بن جاتا ہے اور ایک کی وجہ سے

---

[۱] جماعت کے اسرار و مصالح پر نفیس ترین علمی بحث وہ ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ ؒ نے حجۃ اللہ البالغہ ص۲/۱۹ پر سپرد قلم کی ہے، مزید تفصیل کے لئے اس کو ملاحظہ فرمایا جائے [۲] حجۃ اللہ البالغہ (خفیف تصرف کے ساتھ)

سب کی عبادت قبول ہو جاتی ہے، یہ بات نہ شرع کے خلاف ہے، نہ عقل کے، اسلئے کہ ان اہل اخلاص اور اہلِ دل کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ "قوم لا یشقی بھم جلیسھم" (یہ وہ لوگ ہیں جن کے پاس بیٹھنے والے کبھی محروم نہیں رہتے)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو صفوں کی درستی کا بڑا اہتمام تھا اور آپ اس میں انتشار اور ناہمواری پیدا کرنے والوں پر سخت نکیر فرماتے تھے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جماعت کے فوائد اور "اَلْبُنْیَانُ الْمَرْصُوْصُ" (سیسہ پلائی ہوئی دیوار) کی شان صفوں کی درستی کے بغیر کبھی حاصل ہی نہیں ہو سکتی، اس کے علاوہ نماز اور جماعت درحقیقت پوری زندگی کی تربیت ہے، اگر کسی نے نماز بھی صحیح طریقے سے پڑھنا نہ سیکھا تو دنیا و آخرت کا کوئی کام بھی اچھی طرح نہیں کر سکتا، انس بن مالکؓ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔

سوّوا صفوفکم فان تسویۃ الصفوف من اقامۃ الصلوٰۃ[1]

اپنی صفوں کو برابر کرو، اس لئے کہ صفوں کی برابری اقامت صلوٰۃ میں داخل ہے،

نعمان بن بشیرؓ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں۔

کان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یسوی صفوفنا حتی کانما یسوی بہ القداح حتی رأی انا قد عقلنا عنہ ثم خرج یوماً فقام حتی کاد ان یکبر فرأی رجلاً بادیا صدرہ من الصف فقال عباد اللہ لتسوون صفوفکم او لیخالفن اللہ بین وجوھکم[2]۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہماری صفوں کو تیروں کی طرح سیدھا کرتے تھے۔ ایک دن آپ تکبیر کہنے کے قریب تھے کہ آپ نے ایک شخص کو صف سے آگے نکلا ہوا دیکھا تو فرمایا خدا کے بندو یا اپنی صفیں ٹھیک کرو یا پھر اللہ تمہارے درمیان پھوٹ ڈال دے گا۔

---

[1] بخاری و مسلم [2] مسلم

جمعہ۔ اس کا درجہ اور خصوصیات

جمعہ کی نماز بہت سے ایسے آداب، ترغیبات اور متعدد ایسی خصوصیات اور اضافوں پر مشتمل ہے جن کی وجہ سے اس کی جلالت شان اور عظمت میں بہت اضافہ ہوگیا ہے اور ان سے عبادات اور تقرب الی اللہ، مسلمانوں کی وحدت اور تعاون علی البر والتقویٰ کا نیا جذبہ اور ولولہ پیدا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِن يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ[1] ٥

اے ایمان والو جب جمعہ کے دن اذان کہی جائے تو نماز کے لئے چل پڑا کرو اللہ کی یاد کی طرف اور خرید و فروخت چھوڑ دیا کرو، یہ تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم کچھ سمجھ رکھتے ہو؛

حدیث شریف میں ہے۔

من ترك ثلاث جمع تهاونا بها طبع الله على قلبه[2]۔

جو تین جمعے سستی و سہل انگاری میں چھوڑ دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے دل پر مہر لگا دیتا ہے؛

دوسری حدیث ہے۔

لينتهين اقوام عن ودعهم الجمعات او ليختمن الله على قلوبهم ثم ليكونن من الغافلين[3]۔

باز آجائیں لوگ جمعہ چھوڑنے سے ورنہ مہر لگادے گا اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر پھر ہو جائیں گے غافلوں میں سے۔

دوسرے موقع پر ارشاد ہے۔

لقد هممت أن آمر رجلاً يصلي بالناس ثم احرق على رجال يتخلفون

مجھے خیال ہوتا ہے کہ میں ایک آدمی کو حکم دوں کہ وہ نماز پڑھائے پھر اس کے بعد ان لوگوں کے

---

[1] سورہ جمعہ۔ ۵ [2] اصحاب سنن [3] مسلم و نسائی۔

عن الجمعة، بیوتھم[۱] — گھروں کو آگ لگا دوں جو جمعہ چھوڑ کر بیٹھ رہے ہیں۔

جمعہ کی نماز کیلئے غسل کرنے، مسواک کرنے، خوشبو لگانے اور زیادہ سے زیادہ پاکی و لطافت کا اہتمام کرنے کا حکم ہے اور اس دن نماز سے قبل خطبہ بھی دیا جاتا ہے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جمعہ کا جو خطبہ دیتے تھے وہ کوئی ایسا تقلیدی اور روایتی خطبہ نہ تھا جس میں نہ زندگی ہوتی ہے، نہ روح، اور نہ کوئی پیغام و رہنمائی بلکہ وہ زندگی اور واقعات کے ساتھ بالکل ہم آہنگ ہوتا تھا،

جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

کان النبی صلے اللہ علیہ وسلم اذا خطب احمرت عیناہ وعلا صوتہ حتی کانہ منذر جیش یقول صبحکم ومساکم[۲]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب خطبہ دیتے تھے تو آپ کی چشم مبارک سرخ ہو جاتی تھی آواز بلند ہو جاتی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے آپ کسی لشکر سے ڈرا رہے ہیں کہ صبح کو اس کا حملہ ہونے والا ہے، شام کو ہونے والا ہے۔

علامہ ابن قیم زاد المعاد میں لکھتے ہیں۔

"آپ اپنے خطبہ میں اپنے اصحاب کو اسلام کے اصول و قواعد اور شرائع کی تعلیم دیتے تھے اور اگر کوئی امر و نہی کا معاملہ ہوتا تھا تو امر و نہی فرماتے تھے[۳]"

اپنے زمانہ کے اماموں اور خطیبوں پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"پھر اس پر ایک طویل زمانہ گزر گیا، نور نبوت لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہونے لگا، شرائع و احکام کی جگہ رسوم و عادات نے لے لی، جن کو ان کے حقائق و مقاصد کی رعایت کے بغیر ادا کیا جانے لگا، لوگ صرف اس کی ظاہری صورت کی نگہداشت اور نوک پلک

۱؎ مسلم و نسائی ۲؎ مسلم و نسائی ۳؎ زاد المعاد ج ۱ ص ۱۱۵

درست کرنے میں لگ گئے، ان رسوم واشکال کو انھوں نے سنت کا درجہ دیدیا اوران مقاصد

سے دست کش ہوگئے جن سے ادنیٰ غفلت اور جس میں ادنیٰ تغیر جائز نہ تھا، انھوں نے

اپنے خطبوں کو مقفّیٰ عبارتوں... اور علم بدیع سے آراستہ کیا اور مغز کی بات اس سے کم ہوتی

چلی گئی بلکہ بالکل ختم ہوگئی اور خطبہ کا اصل مقصد ہی فوت ہوگیا۔"[1]

اسی طرح آپکا خطبہ اس زمانہ کے خطبوں کی طرح طویل اور اکتادینے والا بھی نہیں ہوتا تھا جن میں اپنی خطابت و

علمیت کا سکہ بٹھانے اور ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کی جاتی ہے، مقامی اور وقتی مسائل

پر (جن میں نقطۂ نظر اور مسلک کے اختلاف کی بڑی گنجائش ہے) داد خطابت دی جاتی ہے اور مخالف مسلک

یا جماعت پر کھلی تنقید کی جاتی ہے، اس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ اکثر سامعین منشرح اور مطمئن ہونے کے بجائے متنفر اور بیزار

ہوکر اٹھتے ہیں اور جمعہ کے خطبہ کا وہ تقدس اور عظمت جاتی رہتی ہے جو اس کی خصوصیت ہے، آپ کا خطبہ

عملی حقیقت پسندانہ، حرارت و تاثر سے بھرپور، نورانیت و برکت سے معمور اور آپکی گفتگو کی طرح مختصر لیکن جامع اور دل نشین ہوتا

تھا، نہ اس میں ضرورت سے زائد اختصار ہوتا تھا، نہ ضرورت سے زائد طول، جابر بن سمرہؓ فرماتے ہیں کہ "رسول اللہ

صلے اللہ علیہ وسلم کی نماز بھی معتدل ہوتی تھی، اور خطبہ بھی معتدل، قرآن مجید کی چند آیات تلاوت فرماتے،

پھر لوگوں کو نصیحت فرماتے"[2] دوسری روایت میں ہے کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن کوئی طویل

وعریض وعظ نہیں فرماتے تھے، بلکہ چند مختصر کلمات کہتے تھے"[3]

خطبہ کو بہت خاموشی اور سکون کے ساتھ سننے کا حکم ہے تاکہ اس پرسکون اور روحانی فضا میں اس کا

پورا اور صحیح فائدہ حاصل ہوسکے، اسلئے کہ یہ عبادت کا محل ہے نہ کہ خطابت کا، خطبہ کے دوران گفتگو کو سختی

سے منع کیا گیا ہے یہاں تک کہ اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے آدمی کو بات چیت کرنے سے روکنا بھی منع ہے اسلئے کہ

اس سے بھی اس سکون و وقار میں فرق آجائے گا جو خطبہ میں مطلوب ہے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ جس نے جمعہ

---

[1] زاد المعاد ج ا صـ ۱۱۵ [2] صحیح مسلم [3] کتب ستہ

کے دن اپنے ساتھی سے کہا کہ خاموش رہو اس نے بھی زائد اور فضول بات کی۔[۱]

جمعہ کا مزاج اور اس کے مصالح و فوائد کا تقاضا یہ ہے کہ جمعہ شہر کی صرف ایک مسجد میں یا کم سے کم مساجد میں ہو[۲]، (بشرطیکہ شہر بڑا اور پھیلا ہوا نہ ہو اور لوگوں کی شرکت ایک مسجد میں مشکل ہو) اور تمام مسلمان ہفتہ میں ایک بار ایک جگہ جمع ہوں، اس سے ایک طرف اتحاد و اخوت کے رشتہ کو مضبوط کرنے میں مدد ملے گی، دوسری طرف اس جماعت کی بدولت مسلمانوں کے عقائد و اعمال تحریف و فساد سے محفوظ رہیں گے، لیکن مسلمانوں نے اس مسئلہ میں بہت سہل انگاری اور سستی و غفلت سے کام لیا ہے اور اس کے نتیجہ میں جمعہ کی تاثیر و قوت، اہمیت و افادیت اور عظمت و شوکت خاصی حد تک کم ہو گئی ہے۔

جمعہ ہفتہ کی میزان ہے

ایک ذمہ دار، مشغول اور زندگی کے تقاضوں اور مطالبوں اور انسانی حقوق سے لدے اور تھکے ہوئے انسان کیلئے ایک ایسے دن کی ضرورت تھی جس میں اس کے اندر نئی ہمت اور نیا حوصلہ پیدا ہو اور وہ عبادت و تقرب الٰہی کے کاموں کو زیادہ دلچسپی، سکون اور فراغت کے ساتھ ادا کر سکے اور دل کے اس زنگ کو صاف کر سکے جو ہفتہ بھر کی بے احتیاطیوں اور لغزشوں سے دل پر لگتا رہتا ہے، وہ اپنے اس دن کو اس طرح کارآمد بنائے کہ اس کی روشنی، برکت اور نورانیت بقیہ تمام دنوں میں سرایت کر جائے یا دوسرے الفاظ میں بقیہ سارے دن اس کے سایہ میں آجائیں اور اسی کے حکم میں سمجھے جائیں، یہ دن ہفتہ میں جمعہ، رمضان میں شب قدر، اور بقیہ تمام مہینوں

---

[۱] ابوداؤد بروایت حضرت علیؓ۔

[۲] علامہ بحر العلوم فرنگی محلی اپنی کتاب "رسائل الارکان" میں لکھتے ہیں کہ چونکہ جمعہ مسلمانوں کے اجتماع کا ذریعہ ہے اسی لئے امام ابو یوسف ایک شہر میں متعدد جمعوں کے قائل نہ تھے اور امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کا بھی قول یہی ہے اسلئے کہ اگر ایک شہر میں کئی جمعوں کی اجازت دیدی گئی تو مسلمانوں کے اجتماع کا مقصد فوت ہو جائے گا، لیکن امام محمد امام ابو حنیفہ سے روایت کرتے ہیں کہ تعدد جمعہ مطلقاً جائز ہے، دو ہو یا اس سے زیادہ بھی، اور یہی آخری قول راجح اور مفتی بہ ہے۔

میں رمضان ہے،[۱]

علامہ ابن القیم اس نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"وہ (یعنی جمعہ) ایسا دن ہے جس میں عبادت کے لئے اہتمام و یکسوئی مستحب ہے، نیز متعدد واجب و مستحبات میں اس کو دوسرے دنوں پر فضیلت و امتیاز حاصل ہے، اللہ تعالے نے ہر ملت کیلئے ایک دن رکھا تھا جس میں لوگ دنیا کی دلچسپیوں اور مشغلوں سے علٰحدہ ہو کر اپنے آپ کو عبادت کیلئے فارغ کر سکیں، جمعہ اسی طرح ایک عبادت کا دن ہے، دنوں میں اس کی وہ حیثیت اور قدر و منزلت ہے جو مہینوں میں رمضان کی ہوتی ہے، اس میں جو ساعت اجابت (قبولیت دعا کی خاص ساعت) ہے اس کی وہ حیثیت ہے جو رمضان میں شب قدر کی، اس لحاظ سے جس کا جمعہ اچھی حالت میں گزرا اس کے ہفتہ کے باقی دن بھی اچھے ہو جائیں گے، اور جس کا رمضان اچھی طرح گزرا اور صحیح و سالم محفوظ رہا، اس کے سال کے باقی ایام بھی اچھی طرح گزریں گے، اور جس کا حج ٹھیک ہوا اور اچھی طرح گزرا اس کی پوری عمر اچھی طرح گزرے گی، پس جمعہ کا دن ہفتہ کی میزان ہے، رمضان سال کی میزان ہے، اور

---

[۱] جمعہ ہندوستان کے بعض علاقوں خصوصاً دیہاتوں اور قصبوں میں اور بہت سے دوسرے اسلامی ممالک میں بھی زراعت پیشہ اور اہلِ حرفت طبقہ اور اسلام کے درمیان رابطہ کی بہت اہم اور واحد شکل ہے، اس میں وہ اہتمام سے غسل کرتے ہیں، پہلے سے نماز کی تیاری کرتے ہیں، اسلام کے شعائر و احکام سے واقف ہوتے ہیں، انکے اندر اسلام کا شعور و احساس پیدا ہوتا ہے اور وہ اس پر فخر و مسرت محسوس کرتے ہیں اور اس حصار کی برکت سے وہ ارتداد و بے دینی کے فتنوں اور شرک و بت پرستی کی تحریکوں اور دعوتوں سے محفوظ و مامون رہتے ہیں، اگر جمعہ اور اسکے مقدمات و انتظامات و اجتماعات نہ ہوتے تو مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد اس جاہلی معاشرہ میں (جس میں وہ سانس لیتی ہے) جذب ہو جاتی اور ارتداد کی موجیں جو اسکے ماحول سے ٹکرا رہی ہیں اسکو نگل لیتیں اور کچھ دن کے بعد یہ پتہ چلانا بھی دشوار ہو جاتا کہ اسکا اسلام سے کچھ تعلق بھی رہ چکا ہے یہی وہ مصالح تھے جنکے پیش نظر عہد آخر کے بعض علماء احناف نے اس میں سختی و تنگی روا نہیں رکھی بلکہ توسع اختیار کیا ہے۔

حج پوری عمر کی میزان ہے، اور توفیق خدا کے ہاتھ میں ہے[۱]،،

عیدین کی نماز اور ان کی اسلامی خصوصیات

دنیا کی تمام قوموں اور ملتوں میں سالانہ تہوار اور تقریبیں آزادی و بے قیدی اور لذت و تعیش کے دن مانے گئے ہیں، بے حیائی و بے شرمی، لذت و ہوس، لہو و لعب اور سیر و تفریح کا مبالغہ آمیز رجحان ان کا شعار، اور ان تقریبات کا موضوع بن گیا ہے یہاں تک کہ یہ تہوار عبادت کے معنی و مفہوم کے بالکل مخالف، سنجیدگی و متانت سے عاری اور خشوع و انابت سے یکسر خالی ہو گئے ہیں،

اس کے برعکس یہ دونوں عیدیں، عید الفطر اور عید الاضحیٰ جو شارع نے انسانی فطرت کی تسکین اور حقیقت کے اعتراف کے طور پر مسلمانوں کو عطا کی ہیں[۲]، یکسر دینی و روحانی رنگ میں رنگی ہوئی ہیں، عیدین کی نماز میں زاید تکبیرات اور نماز کے بعد خطبہ کا حکم ہے اور نماز سے قبل راستہ میں زیادہ سے زیادہ تکبیر مسنون ہے اور عید الفطر کی نماز سے قبل صدقۂ فطر اور عید الاضحیٰ کی نماز کے بعد قربانی کرنے کا حکم ہے،

عید کی نماز کی اصل یہ تھی کہ مسلمان جس طرح ہفتہ میں ایک بار جمعہ کیلئے جمع ہوتے ہیں اسی طرح سال میں دو بار ایک کھلے اور وسیع میدان میں جمع ہوں لیکن اس میں بھی مسلمانوں نے جمعہ کی غفلت اور سہل انگاری سے کام لیا اور ہر چھوٹی بڑی مسجد میں عید کی نماز پڑھی جانے لگی، اس کی وجہ سے اس نماز کا بھی وہ اثر جاتا رہا اور بہت سے وہ مقاصد فوت ہو گئے جو شریعت کے پیش نظر تھے، علامہ ابن القیم لکھتے ہیں۔

---

[۱] زاد المعاد ج ۱ ص۱۶۱

[۲] انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو اس وقت وہاں دو دن خاص تھے جس میں وہ لوگ کھیل تماشے کرتے تھے، آپؐ نے دریافت فرمایا کہ یہ دو دن کیسے ہیں لوگوں نے عرض کیا کہ جاہلیت میں ہم ان دنوں میں کھیل کود وغیرہ میں مشغول ہوتے تھے، آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو اس سے اچھا بدل عطا فرمایا ہے، یوم الاضحیٰ و یوم الفطر (ابو داؤد)

"رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم عید کی نماز اس عیدگاہ میں ادا فرماتے تھے جو مدینہ کے مشرقی دروازہ پر ہے، یہ وہ مصلّٰے ہے جہاں حجاج کا محمل اتارا جاتا ہے، آپ نے عید کی نماز اپنی مسجد میں صرف ایک بار پڑھی وہ بھی بارش کی وجہ سے (اگر اس حدیث میں جو سنن ابی داؤد وابن ماجہ میں ہے کوئی کلام نہ کیا جائے) لیکن معمول عیدگاہ ہی میں نماز پڑھنے کا رہا۔"[1]

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب عیدین اور اس کے اہتمام و احکام کی حکمت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ہر ملت کے لئے ایک ایسا مظاہرہ اور اجتماع ضروری ہوتا ہے جس میں اس کے سب ماننے والے جمع ہوں تاکہ ان کی شوکت و کثرت تعداد ظاہر ہو، اور اسی لئے عیدین میں تمام لوگ حتیٰ کہ عورتوں اور بچوں کا نکلنا بھی مستحب قرار دیا گیا ہے، ان کو عیدگاہ سے علیحدہ ایک جگہ بیٹھنے اور مسلمانوں کی دعوت و اجتماع میں شریک ہونے کا حکم ہے، اور اسی لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جانے میں دوسرا اور آنے میں دوسرا راستہ اختیار فرماتے تھے تاکہ مسلمانوں کی شان و شوکت کا نقشہ دونوں طرف کے لوگوں کے سامنے آجائے۔"[2]

بدعت، تحریف اور انتشار سے حفاظت کیلئے جمعہ اور جماعت کی اہمیت و ضرورت

جمعہ اور جماعت کا اس دین کی سلامتی و حفاظت اور اسلامی شریعت اور دینی ماحول کی ان بنیادوں کے بقا و استحکام میں بڑا دخل ہے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کرام امت کے لئے چھوڑ کر گئے تھے، اس کی وجہ سے یہ دین تحریفات کا شکار ہونے اور بازیچۂ اطفال بننے سے محفوظ رہا، اگر خدا نخواستہ مسلمان یہ دو چیزیں جمعہ اور جماعت ترک کر دیتے اور اپنے اپنے گھروں میں نماز ادا کر لیا کرتے تو اس وقت ان نمازوں کی شکل و صورت

---

[1] زاد المعاد، ج ا ص ۱۱۹ [2] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۲۳

تک پہچانی نہ جاتی، یا کم از کم وہ بہت کچھ اپنی ابتدائی اور اصلی شکل کھو چکی ہوتیں، اور ان میں بڑا اختلاف پیدا ہو جاتا، اسکے نتیجہ میں مسلمانوں میں نماز کے مختلف نمونے رائج ہو جاتے اور جس طرح ان کی مدنی اور اجتماعی زندگی کے مختلف مظاہر اور رخ ہیں اسی طرح ان کی عبادتوں اور نمازوں کےلئے بھی مختلف مظاہر اور مختلف انفرادی اور مقامی نمونے بن جاتے اور یہودیت و نصرانیت اور ہندوستان کے مشرکانہ مذاہب کی طرح ہر شہر اور ہر ملک کے مسلمان ایک نئی طرز کی نماز پڑھتے نظر آتے، اس لحاظ سے "جماعت" عبادات میں وحدت و یکسانی اور احکام کی حفاظت کا بہت اہم اور موثر ذریعہ ہے،

ان مذکورہ بالا حکمتوں اور مصلحتوں نیز اور بہت سے دوسرے مصالح کی بنا پر (جن کو اللہ تعالے کے سوا اور کوئی نہیں جانتا) جماعت سے نماز انفرادی نماز سے بدرجہا افضل قرار دی گئی ہے، حضرت ابوہریرہؓ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ "جماعت کے ساتھ آدمی کی نماز گھر میں یا دکان پر نماز پڑھنے سے پچیس[1] درجہ افضل ہے، اسلئے کہ جب وہ وضو کرتا ہے اور اچھی طرح وضو کرتا ہے پھر مسجد کی طرف چلتا ہے اور صرف نماز اس کی غرض ہوتی ہے تو اسکے ہر قدم پر ایک درجہ بلند کیا جاتا اور ایک گناہ معاف کیا جاتا ہے، جب وہ نماز شروع کرتا ہے تو جب تک وہ اپنے مصلے سے نہیں ہٹتا اس وقت تک فرشتے اس پر رحمت وسلام بھیجتے رہتے ہیں اور یہ کہتے ہیں "اللھم صل علیہ اللھم ارحمہ" (اے اللہ اس پر اپنا سلام و رحمت بھیجئے اے اللہ اس پر رحم فرمائیے) اور جب تک کوئی آدمی نماز کے انتظار میں رہے گا نماز ہی میں سمجھا جائے گا، حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز انفرادی نماز سے ۲۷ درجہ افضل ہے[2]"

نماز دوسرے مذاہب میں

قبل اس کے کہ ہم اسلامی نماز کی دوسری قسموں کا جائزہ لیں اور اسکے خطوط و نقوش اور زندگی اور نفس انسانی پر اسکے اثرات کا مطالعہ کریں مناسب ہے کہ ان مذاہب کے طریقہ عبادت پر بھی ایک تحقیقی نظر ڈالی جائے جو اسلام سے قبل موجود تھے، اور آج بھی پائے جاتے ہیں

[1] صحاح ستہ باستثنا نسائی [2] موطا، بخاری، ترمذی، نسائی

نیز ان مذاہب میں نماز کے حقیقی تصور و مفہوم، اس کی شکل و صورت اور آداب و احکام سے براہ راست واقفیت حاصل کی جائے، اگرچہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خیالات و افکار، تعبیرات و تفسیرات، اور قیاسات و تخمینات کے اس جنگل میں ایک واضح، متعین اور سچی تصویر پیش کرنا (جس طرح اسلامی نماز کی پیش کی گئی ہے) بیحد مشکل کام بلکہ قریب قریب ناممکن ہے لیکن اسکے صحیح علمی موازنہ اور جائزہ سے ہمیں اسلام کی نعمت کی قدر آئے گی اور اس کے بتائے ہوئے احکام کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ ہوگا اور یہ معلوم ہوسکے گا کہ اتنے طویل زمانہ کے بعد بھی اور اتنی مختلف النوع اقوام میں رہ کر بھی اس کا دامن ہر قسم کی تحریف اور تغیر و تبدل کی آلودگی سے آج تک پاک ہے اور وہ اپنی صحیح شکل و صورت پر قائم ہے،

یہودی مذہب میں نماز کی حقیقت

نماز کے احکام و مسائل، اور اس کی شکل و ہیئت کی تاریخ یہودی مذہب اور یہودی لٹریچر میں بہت مبہم، الجھی ہوئی، اور بہت تاریکی میں ہے۔ اور اس میں کوئی ایسی یکساں شکل نہیں ملتی جو ہر دور اور ہر نسل میں مشترک ہو، اسلامی نماز کے برعکس اس کا تخیل اور احکام و قوانین زمانہ کے ساتھ بدلتے رہے اور اصلاح و تجدید کا ہاتھ آزادی کے ساتھ اس پر عمل کرتا رہا اور آج تک تغیر و تبدل اور تجدد کی لہریں اس پر اثر انداز ہیں، ایک مؤرخ اور مبصر کیلئے اس کی اصلی ہیئت اور ابتدائی شکل و صورت کا سراغ لگانا (جس پر انبیائے بنی اسرائیل اور علماء و فقہائے یہود عہد قدیم میں کاربند تھے) جوئے شیر لانے سے کم نہیں، ہم یہاں ایک بڑے یہودی فاضل (Samuel S. Cohon) کی بحث کا خلاصہ پیش کرتے ہیں جو امریکہ کے ایک بڑے عبرانی دار العلوم[1] میں یہودی مذہب و دینیات کے پروفیسر ہیں، وہ لکھتے ہیں:۔

"اگرچہ توریت میں نماز کا صریح حکم نہیں ملتا ہے اس لئے کہ عہد قدیم میں عبادات کی رواتی

---

[1] Hebrew Union College, Cincinnati, Ohio.

شکل صرف ذبیحوں اور قربانیوں تک محدود تھی[۵]، تاہم وہ دعا و نماز کو تقرب الٰہی کا ذریعہ سمجھتے تھے یہود کے احبار نے اکثر قربانیوں کے اس روایتی اور رسمی نظام پر سخت گرفت کی ہے اور دعا و انابت کی زندگی پر زور دیا ہے، "نبی ارمیا" زندگی کی مشکلات، انہماک اور مشغولیتوں سے فرار اختیار کرتے ہوئے اکثر توبہ و استغفار اور خدا کے سامنے عبودیت اور تذلل کا سہارا لیتے تھے، انھوں نے بابل کے جلاوطن یہودیوں کو یہ نصیحت کی تھی کہ وہ اپنے نفوس کو دعا اور عبادات کے ذریعہ خدا کے استحضار اور تقرب کا عادی بنائیں؛ "سفر مزامیر" کے مولفین اس پر کاربند ہے اور ان کی دینداری اور تورع نے یہودی مذہب میں انفرادی و جماعتی نماز کی تشکیل کی اور اس کو ایک خاص سانچہ میں ڈھالا۔

یہود کے عالموں نے توریت میں نماز کی اساس کو تلاش کرتے ہوئے "سفر تثنیہ" کی ایک آیت سے استدلال کیا ہے جو یہ ہے۔

"تم اس سے محبت کرو اور اپنے معبود کی، اپنے سارے دل اور ساری جان سے عبادت کرو (۱۲-۱۰)"

---

[۱] لیکن قرآن مجید سے جو کتب سابقہ کا محافظ و نگہبان بھی ہے، بنی اسرائیل میں نماز کے وجود کا پتہ چلتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس امت کے انبیاء و صلحا اسکی پابندی اور اہتمام کرتے تھے، سورہ انبیاء میں حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحاقؑ، اور حضرت یعقوبؑ کے ذکر میں یہ آیت ہے "وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَإِقَامَ الصَّلٰوةِ وَإِيتَاءَ الزَّكٰوةِ وَكَانُوا لَنَا عَابِدِينَ" سورہ مریم میں حضرت عیسیٰؑ کا قول خود موجود ہے "وَجَعَلَنِي مُبَارَكًا أَيْنَ مَا كُنتُ وَأَوْصَانِي بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا" سورہ آل عمران میں ہے "يَا مَرْيَمُ اقْنُتِي لِرَبِّكِ وَاسْجُدِي وَارْكَعِي مَعَ الرَّاكِعِينَ") ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہود نے بہت ابتدائی عہد سے نماز کے معاملہ میں غفلت و سستی سے کام لیتے ہوئے اس کو اپنے ہاتھ سے کھو دیا ہے چنانچہ سورہ مریم میں ہے۔

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ۔ (سورہ مریم - ۵۹)	پھر انکے بعد (بعض ایسے) ناخلف جانشین ہوئے جنھوں نے نماز کو برباد کیا اور خواہشات کی پیروی کی سو وہ عنقریب خرابی سے دوچار ہونگے۔

عبرانی الفاظ جو دعا و عبادات کے معنی میں آتے ہیں اور جو یہودیوں کی نماز پر روشنی ڈالتے ہیں، ان میں سب سے زیادہ مشہور لفظ (Tephillah) ہے اور گولڈزیہر نے اس کا ترجمہ "خدا کو حاکم سمجھتے ہوئے اس کے سامنے تضرع و مناجات اور اس کے سامنے جھک جانا" کیا ہے،

تین وقت کی نماز (فجر، ظہر اور غروب آفتاب) جو عہد ہیکل کے اہل دین و اہل تقویٰ کا شعار تھا، عہد احبار میں انفرادی اور اجتماعی نماز کا باقاعدہ دستور بن گئی ان تینوں نمازوں کے اوقات، ان کے طریقے، یوم السبت کے طریقے، نئے چاند کی نماز، دوسرے اضافی مقدس ایام کی نماز یوم کفارہ کی مخصوص نماز عہد ہیکل میں ذبیحوں اور قربانیوں کے مساوی قرار دیئے گئے،

یہودیوں کے روائتی نظام عبادت میں عورتوں کو مردوں سے علٰحدہ رکھنے کا حکم ہے اور سر کو ڈھانکنا اور سر جھکانا اور خاص نمازوں میں کھڑا ہونا[1] بھی فرض ہے، نمازی کو چاہیئے کہ "عمیداہ" اور "سفر الحذقیل" کی تلاوت کے وقت تین قدم پیچھے ہٹ آئے،

صبح کی نماز میں نمازی کو ایک خاص چادر اوڑھنی پڑتی تھی اور مخصوص تعویذات جن کو "فلقطیر" کہا جاتا تھا وائیں بازو اور سر میں باندھنا پڑتا تھا اور مردوں میں جن کی عمر ۱۳ برس سے متجاوز ہو گئی ہو انکے لئے تعویذ باندھنا لازمی تھا، کفارہ کے دن وہ سفید طیلسان استعمال کرتے تھے (جسکو انکے یہاں کفن میں استعمال کیا جاتا ہے) یہودی شریعت اماموں اور عام مقتدیوں میں کوئی تفریق نہیں کرتی بلکہ یہ کہتی ہے کہ اللہ کے سامنے وہ سب برابر ہیں

یہود کے تجدد پسند طبقہ نے عبادت میں موسیقی کا خاص طور پر اہتمام کیا ہے اور ہر نماز کے لئے مخصوص آہنگ اور نغمے وضع کئے ہیں تاکہ یہ عبادت دلوں میں اچھی طرح اتر سکے اور اپنا اثر کر سکے تجدد پسند یہودیت نے حسن ذوق و جمال پرستی کو بہت اہمیت دی ہے، جسمانی حرکات نماز میں کم سے کم کر دی ہیں،

---

[1] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں کی نماز میں سجدہ نہیں ہے چنانچہ قرآن مجید نے ان کی نماز کے ذکر کے وقت صرف رکوع کا ذکر کیا ہے "وارکعی مع الراکعین (رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ)"

مردوں وعورتوں کی علٰحدہ صفوں کا انتظام ختم کر دیا ہے، سر ڈھانکنے اور چادروں کے استعمال کو بھی ضروری قرار نہیں دیا، اور چونکہ یہ تجدد پسند جماعت سنیچر اور ایام مقدسہ کی نمازوں پر قانع تھی اسلئے اب تعویذات کی رسم بھی مٹادی گئی اور قیام وسکوت اور سر خم کرنا بعض بعض موقعوں پر کافی سمجھا جانے لگا،

یہودیوں کی نماز میں گانے اور موسیقی کی آمیزش نے نماز کے اہم اجزا اور اس کے مقاصد کو سخت نقصان پہونچایا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تجدد پسند اور قدامت پرست دونوں قسم کے افراد عبادت کی روح سے (جس کو خشوع قلب اور ظاہر و باطن کے ساتھ اللہ تعالٰے کی طرف توجہ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے) خالی اور محروم ہوگئے اور یہ سب ان نغموں اور سروں کی وجہ سے ہے جسکو اس فن کے ماہرین نے جو خود یہودی نہیں تھے وضع کیا تھا اور جو یہودی ہیکلوں اور عبادات کی شکلوں پر ہولناک حد تک چھا گئے ہیں"[1]

یہودیوں کے دائرۃ المعارف (جیوش انسائیکلوپیڈیا) میں "یہودیوں کی نماز" کے عنوان سے جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں ان سے سطور بالا کی تصدیق ہوتی ہے، ہم اس کے چند اقتباسات یہاں پیش کرتے ہیں۔

"اس حکم کے بموجب کہ "اے اسرائیل اپنے خدا سے ملاقات کیلئے ضروری تیاری کرو" نماز سے قبل یہودی خاص تیاریاں کرتے تھے اور قدیم زمانہ کے صالح لوگ تو ان تیاریوں میں ایک ایک گھنٹہ صرف کر دیتے تھے، عزرا (Ezra) کے حکم کے بموجب نماز سے قبل جسم کو احتیاط سے دھونا ضروری تھا، نماز کیلئے مناسب کپڑوں کا پہننا بھی ضروری تھا،

نماز کی دعا کو کھڑے ہوکر اور ارض مقدس کی طرف رخ کرکے پڑھا جاتا تھا اسی لئے لفظ (عمیداہ) رکھا گیا ہے،

نماز کیلئے کسی چبوترہ پر نہیں چڑھنا چاہیئے، بلکہ نیچی جگہ نماز پڑھنی چاہیئے، پیروں کو

---

[1] Judaism-A way of life- pages 298, 316 to 318 and 358 to 360

ملاکر اور سیدھا رکھا جائے جیسے فرشتے کرتے ہیں، نماز پڑھنے والے کو اپنے ہاتھ پھیلا کر ان کو اپنے پاک حاکم کی طرف بلند کرنا چاہیئے، اس کو اپنی نظر نیچی رکھنا چاہیئے، تحمید و تمجید کے دوران اس کو جھک جانا چاہیئے اور اللہ کے نام پر اٹھنا چاہیئے۔

"عمیدا ہ" کے بعد نمازی تین قدم پیچھے ہٹتا ہے اور پھر داہنی اور بائیں طرف جھکتا ہے یہ عمل زمانہ قدیم کے بادشاہوں سے رخصت طلبی کی رسم سے مشابہ ہے،

باقاعدہ نماز عام طور پر کم از کم دس بالغ افراد کی جماعت کے ساتھ ادا کی جاتی ہے اور پبلک مقام پر نماز ادا کرنا انتہائی محمود متصور ہوتا ہے، نماز مردوں اور عورتوں کیلئے ضروری ہے، لڑکیوں کو نماز ممنوع ہے،

نماز کی دعاؤں کی تصنیف و تالیف اور اس کی تحمید و تمجید) اشی نبیوں کے دور میں ایک سو بیس[۲] بزرگوں کی طرف منسوب ہے، یہ معلوم نہیں کہ نماز کی دعائیں ابتداً زبانی سکھلائی گئیں یا باقاعدہ ضبط تحریر میں آئیں، بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ مدت مدید تک لوگ ان کو حفظ کر کے دہراتے تھے، شائد (Geonic) کے دور تک یہی صورت رہی،

امام مجتہد (Johanna) فرماتے ہیں کہ تین نمازیں دن کے تین تغیرات سے متعلق ہیں، طلوع آفتاب، دوپہر، اور غروب آفتاب[۱]"۔

رومن کیتھولک عیسائیوں میں نماز کی شکل

عیسائی نماز کی سب سے پہلی تشکیل چوتھی صدی میں نیقاشہ کے جلسہ میں ہوئی اور ویٹیکن کی کمیٹی

---

[۱] Jewish Encyclopaedia [۲] دائرۃ المعارف مذاہب و اخلاق کے مضمون نماز عیسائیوں میں[۳] کے مقالہ نگار اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ حضرت مسیح نماز میں یہودیوں کیساتھ شریک ہوتے تھے اور ہیکل کی عبادت میں بھی حاضر ہوتے تھے یہی طرز عمل مسیحیت کے قدیم اماموں کا تھا مسیحی عبادت اس عبادت کی اساس پر قائم تھی جس پر پہلی مسیحی (باقی صفحہ ۸۷ پر)

آج تک اس میں ترمیمیں کرتی رہتی ہے اور کیتھولک دنیا کو اس سے برابر باخبر رکھتی ہے، کلیسا کے مرکزی نظام کو بھی اس کا حق حاصل ہے کہ وہ نماز میں حسب دلخواہ تبدیلیاں کر سکے،

ذیل میں کیتھولک کلیسا کی سرکاری فدوایتی نماز کا ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے جو وٹیکن کیمٹی کے جاری کردہ تازہ ترین آخری پلیٹن St. Paul Publications Series–"The Sacrifice of the Mass" کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے،

"پادری (امام) جب کلیسا میں داخل ہوتا ہے تو حاضرین اس کی تعظیم میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور وہ نماز کی نیت کرتے ہوئے کہتا ہے "باپ بیٹے روح القدس کے نام پر میں کلیسا کے مذبح کی طرف نماز پڑھتا ہوں"، اس موقع پر امام اور مقتدیوں میں ایک مکالمہ ہوتا ہے جو خدا کی تقدیس و ثنا سے متعلق ہے۔

"پھر امام اپنے گناہوں اور خطاؤں کا اعتراف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں قدرت رکھنے والے اللہ اور مبارک مریم عذرا اور معزز فرشتہ میکائیل اور بپتسمہ دینے والے یوحنا اور اللہ کے مبارک رسول پطرس و پولس اور تمام مقدس ہستیوں اور تمام عیسائی بزرگوں اور تم سب کو گواہ بنا کر یہ اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے اتنے فکری لسانی اور عملی گناہ کئے ہیں جن کا شمار و حساب ناممکن ہے یہ گناہ میں نے کئے ہیں اور تنہا میں ان کا ذمہ دار اور جواب دہ ہوں، لہذا میں مبارک کنواری مریم، مبارک فرشتہ میکائیل اور مبارک بپتسمہ دینے والے یوحنا اور مبارک رسول پطرس و پولس اور تمام بزرگ و مقدس ہستیوں اور آپ سب سے اے بھائیو اس کا خواستگار ہوں آپ اللہ مالک الملک سے میرے لئے دعا کریں۔

(باقی حاشیہ صفحہ ۸۶ کا) نسل کا نشو ونما ہوا تھا اور یہ کہ کلیسا نے اپنا تعلق یہودیت سے منقطع نہیں کیا بلکہ یہ خود یہودیت تھی، جس نے مسیحیت کو خارج کر دیا،

پھر جماعت اس کیلئے دعا کرتی ہے اور امام آمین کہتا ہے پھر پوری جماعت اعتراف کی یہی عبارت دہراتی ہے اور دعا کی طالب ہوتی ہے، امام دعا کرتا ہے، جماعت آمین کہتی ہے پھر امام اور جماعت کے درمیان دعا ورحمت وبخشش اور سب کیلئے امن اور مغفرت کی طلب سے متعلق ایک مکالمہ ہوتا ہے،

پھر امام مذبح پر چڑھتا ہے اور لاطینی زبان میں ایک دعا پڑھتا ہے جس میں خدا سے گناہوں کی معافی مانگی جاتی ہے اور حضرت مسیح اور ان مقدس ہستیوں کا توسل اختیار کیا جاتا ہے جن کے آثار کلیسا میں موجود ہیں پھر امام کہتا ہے کہ اے اللہ ہم پر رحم فرما، اے عیسیٰ مسیح ہم پر رحم فرما، اے عیسیٰ مسیح ہم پر رحم فرما، یہ الفاظ دو مرتبہ دہراتا ہے، واپس آکر وہ اللہ تعالےٰ سے رحمت کا طلبگار ہوتا ہے، پھر جماعت واپس آتی ہے اور اللہ تعالےٰ سے رحم کی التجا کرتی ہے۔

حمد وثنا (Gloria) جو عبادت کے اوقات میں کلیسا میں پڑھے جاتے ہیں حمد وثنا کے الفاظ پر مشتمل ہوتے ہیں اور اس میں باپ اور اکلوتے بیٹے کے الفاظ بار بار دہرائے جاتے ہیں اور مسیح علیہ السلام کو اللہ کا میمنہ (بھیڑ) کہا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بندوں کے گناہ معاف کرتے ہیں اور اللہ کے داہنی طرف بیٹھے ہیں، ان سے بار بار رحم وعفو طلب کیا جاتا ہے اور اس کا اظہار کیا جاتا ہے کہ وہ ہر چیز کے مالک اور ہر چیز پر حاکم اور ہر چیز سے بالاتر ہیں،

کتاب مقدس کا ایک اقتباس بھی جس کو پادری منتخب کرتا ہے اس موقع پر پڑھا جاتا ہے اور اس کی تلاوت کے وقت پوری جماعت تعظیماً کھڑی ہو جاتی ہے،

کیتھولک کلیسا کی ہفتہ وار نماز جو اتوار کو ہوتی ہے، اس لحاظ سے عام نمازوں سے مختلف ہے کہ اس میں امام ضرورت وحالات کے مطابق ایک خطبہ بھی پڑھتا ہے اور کلمۂ ایمان کی تجدید کرتا ہے، اس کلمہ میں حضرت مسیح کے متعلق یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ وہ اللہ کے اکلوتے بیٹے ہیں، اسی سے پیدا ہوئے ہیں اور تمام زمانوں سے ماوراء ہیں، رب الارباب ہیں، نور النور ہیں، معبود برحق ہیں اور وجود میں بھی اپنے باپ کے

شریک ہیں، ان ہی سے تمام موجودات وجود میں آئے، اور وہ آسمانوں سے ہماری نجات کیلئے اس دنیا میں تشریف لائے (اس موقع پر حاضرین گھٹنوں کے بل گر جاتے ہیں) اور مریم عذرا اور روح القدس کے واسطہ سے جو انسانی شکل میں ظاہر ہوئے، یہ کلمہ مسیح کی الوہیت کے الفاظ اور صلیب وکفارہ کے عقیدہ اور مقدس عالمی کلیسا کی وحدت کے بارہ میں ہوتا ہے اور اس میں کلیسا کو مرکز ہدایت بپتسمہ کا مرکز، حشر اور حیات بعد الموت کا مرکز قرار دیا جاتا ہے،۔

نماز کے بعد "عشاء ربانی" کا انتظام ہوتا ہے، اس کی اصل یہ ہے کہ عہد قدیم میں کلیسا میں آنے والے اپنے ساتھ روٹی اور انگور کی شراب لاتے تھے اور مذبح پر چڑھاتے تھے، پادری تھوڑی سی شراب لے کر روٹی میں ملا دیتا تھا، ان کا عقیدہ تھا کہ یہ روٹی اور شراب حضرت مسیح کے گوشت اور خون میں تبدیل ہو جاتی ہے اور جو ان کو کھاتا ہے اسکے اندر حضرت مسیح کا گوشت وخون سرایت کر جاتا ہے "عشاء ربانی" رات کے اس آخری کھانے کو بھی کہتے ہیں جو حضرت مسیح نے اپنی زندگی میں تناول فرمایا لیکن شراب اور روٹی کی جگہ اب پیسوں نے لے لی ہے جو آنے والے پادری کو پیش کر دیتے ہیں، لیکن اسکے باوجود کلیسا کے امام اور پادری اس رسم کو جاری رکھتے ہوئے حاضرین میں روٹی ضرور تقسیم کرتے ہیں۔

ان سب چیزوں کا اختتام ایک مختصر دعا پر ہوتا ہے جس پر یہ نماز ختم ہوتی ہے اور جماعت منتشر ہو جاتی ہے۔"

پروٹسٹنٹ فرقہ میں "نماز" کا طریقہ

پروٹسٹنٹ گرجاؤں کی نماز بشمول میتھوڈسٹ (Methodist) اور (Anglican)

اعتراف، توبہ واستغفار، تجدید ایمان، بنیادی عقائد کی توثیق، حمد وثنا اور دعا وتلاوت انجیل میں کیتھولک نماز سے ملتی جلتی ہے، لیکن اس کا اسلوب اور صیغے اپنے مخصوص کلیسائی نظام کے ماتحت اور کئی وجوہ سے کیتھولک نماز سے مختلف ہیں،

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس میں لاطینی زبان استعمال نہیں کی جاتی، دوسرے یہ کہ اس کی دعاؤں کے سارے صیغے ترانوں اور گانوں کی شکل میں ہیں اور ہر دعا کی گے اور آہنگ جدا اور مقرر ہے[۱]، ایک خاص بات یہ ہے کہ خدا کے ذکر کے وقت خاموشی وسکون کا لحاظ رکھا جاتا ہے اور حضرت مسیح کی الوہیت کے سلسلہ میں صریح اور کھلی ہوئی عبارتیں حذف کر دی گئی ہیں، بعض ادعیہ میں سکوت و تدبر بھی ملتا ہے، اس اجتماعی روایتی دعا کا ایک نمونہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

"اے آسمانی باپ تو نے اپنی محبت سے ہم کو پیدا کیا اور اپنی محبت سے باقی رکھا، تیری محبت وشفقت ہماری تکمیل کر سکتی ہے، ہم پورے عجز کے ساتھ اعتراف کرتے ہیں کہ ہم پورے دل وجان کے ساتھ تجھ سے محبت نہیں کر سکے اور ایک دوسرے سے بھی محبت نہیں کر سکے جیسا کہ حضرت عیسیٰ مسیح نے ہم سے محبت کی، ہماری روحیں ضرور زندہ ہیں لیکن ہماری انانیت اور خود غرضی نے ہم کو تجھ سے دور کر دیا ہے اور ہم نے تیری نصرت وتائید سے غفلت برتی، ہم سے جو کچھ سرزد ہوا اس کو معاف فرما اور ہمارے موجودہ حال کو درست فرما، اور مستقبل میں اپنی روح سے ہماری رہنمائی فرما یہاں تک کہ تیری خلقت کی عظمت ہمارے نفوس میں اور خلق کے نفوس میں عیسیٰ مسیح کے واسطہ سے جو ہمارے مولا اور ہمارے بادشاہ ہیں اچھی طرح روشن ہو جائے"

انجلیکانی کلیسا کی نماز میں عبادت سے پہلے گھنٹیاں بجائی جاتی ہیں، یہ نماز کا اعلان ہوتا ہے، انجیل کے ایک اقتباس کی تلاوت کی جاتی ہے اور "ایمان کا کلمہ" ترانے اور کورس کے انداز میں پڑھا جاتا ہے، خاص خاص موقعوں پر "عشاء ربانی" کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے اور اس کلیسا کے پیرو یہ عقیدہ رکھتے ہیں

---

[۱] نمونہ کے طور پر ملاحظہ ہو
The Methodist Hymnal–The Methodist Publishing House, (U. S. A.)

کہ یہ یادگار منا کر وہ اپنے نفوس کا تزکیہ کر رہے ہیں اور اپنی ارواح کو قوت پہونچا رہے ہیں[۱]،

ہندو مذہب میں عبادت کے طور طریق

جہاں تک ہندو مذہب کا تعلق ہے اس کی نماز (یا زیادہ صحیح الفاظ میں پوجا) کا سب سے نمایاں وصف اس کے طریقوں، شکلوں، رسموں، روائتوں اور حکموں کا قدم قدم پر اور ہر ہر چیز میں اختلاف ہے، یہ اختلاف لسانی، صوبائی، مذہبی اور تاریخی سطح پر ملتا ہے، اس کا سراغ لگانے والا اپنے کو ایسے جنگل میں پاتا ہے جس میں سخت نشیب و فراز اور کثرت سے دلدل اور گھاٹیاں ہیں، دراصل یہ ہندوستان کے تمام عقائد، نظریات، مذاہب اور رسم و رواج کی خصوصیت ہے، یہی وجہ ہے کہ ہندو مذہب کے واضعین قانون اور علماء مذاہب کو "ہندو" کی ایک متعین اور منطقی تعریف پیش کرنے میں بڑی زحمت پیش آئی۔

ہندو مذہب کی مفروضہ عبادت میں سخت قسم کا اضطراب اور انتشار پایا جاتا ہے، اس میں بہت وسعت گنجائش اور لچک ہے، اس کی شکلیں اور طریقے مختلف ہیں، اس کے حدود اور شرائط مبہم اور اس کی ہیئت و شکل غیر واضح اور غیر متعین ہے، یہاں نہ شکل و صورت کی یکسانی پائی جاتی ہے نہ عقائد و بنیادی خیالات میں وحدت یہی وجہ ہے کہ کسی ایک کتاب میں اس کی مکمل تصویر نہیں ملتی اور فلسفہ یا دینیات کے کسی ہندو فاضل نے اس کا مکمل نقشہ ابتک پیش نہیں کیا، زیادہ سے زیادہ جو تصور ہندوستان کے سب سے بڑے رقبہ اور عبادت کی عام شکلوں کی نمائندگی کر سکتا ہے وہ مدراس یونیورسٹی میں شعبہ فلسفہ کے صدر T. M. P. Mahadevan کی کتاب[۲] (Outlines of Hinduism) (ہندو مذہب کا خاکہ یا اجمالی تعارف) میں ملتا ہے، وہ ہندو مذہب کے نظام عبادت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں۔

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، The Book of Common Prayer
e Church of India, Pakistan, Burma and Ceylon,
903.

[۲] اس کتاب کا مقدمہ ہندوستان کے سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے لکھا ہے اور کتاب کی تعریف کی ہے

"وشنو، شیوا اور شکتی" عوام میں سب سے زیادہ مقبول بت ہیں جن کی مندروں اور گھروں میں پوجا کی جاتی ہے لیکن شمال میں کرشن کی اور جنوب میں (Kartikaya) کی بے شمار مورتیاں ہندوؤں کے سمجھدار طبقہ میں زیادہ تر ہر دلعزیز ہیں، تمام ہندو (طبقات اور فرقوں کے اختلاف کے باوجود) ان تینوں کی پوجا کرتے ہیں اور اس میں ایک معبود کا تصور کرتے ہیں،

ایک ہندو اپنے گھر میں اپنے معبودوں کا استقبال ایک معزز مہمان کی طرح کرتا ہے وہ جب مندر میں داخل ہوتا ہے تو اپنے ساتھ پھل پھول کا تحفہ لے جاتا ہے تاکہ اس کو اپنے "شاہنشاہ" کی خدمت میں پیش کر سکے، عبادت کے تمام طریقوں میں بھی فرائض میزبانی کی پوری نقل کی جاتی ہے، وہ اپنے معبود کو خوش آمدید کہتا ہے اس کیلئے ایک جگہ متعین کر دیتا ہے اسکے پیر دھوتا ہے اور اس کے سامنے محبت و احترام کے طور پر صندل اور چاول پیش کرتا ہے، مورتی کی گردن میں ایک مالا ڈالتا ہے اور اس کی پیشانی پر قشقہ لگاتا ہے اس کی خدمت میں خوشبو اور لوبان وغیرہ پیش کرتا ہے، چراغ جلا کر اس کے چاروں طرف گھماتا ہے، اسکے سامنے کھانا رکھتا ہے اس کے بعد پان پیش کرتا ہے، کافور جلاتا ہے اور اس کی خدمت میں ہدیہ کے طور پر سونا پیش کرتا ہے جس کو (کرن پھول) کہتے ہیں اور آخر میں اپنے دیوتا یا دیوی کو رخصت کرتا ہے،

مندروں میں دیوی دیوتاؤں سے ایسا معاملہ کیا جاتا ہے جیسا بادشاہوں کے ساتھ کیا جاتا ہے، موسیقی اور گانے سے ان کو بیدار کیا جاتا ہے، روایتی غسل کے بعد ان کو شاہانہ پوشاک پہنائی جاتی ہے، پھولوں اور زیورات سے ان کو آراستہ کیا جاتا ہے مختلف قسم کی رنگ برنگی روشنیاں ان کے چاروں طرف پھرائی جاتی ہیں، ان کے کھانے پینے کے لئے بھی

اوقات متعین ہیں، وہ روزانہ شاہانہ مجلس کرتے ہیں اور اپنے "بندوں" کو اپنے مشاہدہ کی عزت بخشتے ہیں، ان کی شکایتیں سنتے ہیں اور ان کو اپنی رحمت و شفقت کے سایہ میں لیتے ہیں، مختلف تہواروں کے موقع پر وہ شاہانہ جلوس کے ساتھ نکالے جاتے ہیں،

یہ مبہم انسانی ڈرامہ تقریباً ہندوستان کے ہر گھر میں دیکھا جاسکتا ہے اور اس کا مقصد ان لوگوں کو اپنے دامِ فریب میں لانا ہے جو اس اکتا دینے والی زندگی کے راستوں سے گہری تاریکی کے علاقوں تک لے جاتے ہیں چھٹکارا نہیں پاسکتے"[1]

ہندو نظام عبادت کی تصویر ایک یوروپین مصنف نے بھی کھینچی ہے اور یہ بھی اس تصویر کے مطابق بلکہ اس سے زیادہ واضح اور مفصل ہے جتنی اس ہندو مصنف نے پیش کی ہے (Louis Renon) اپنی کتاب Hinduism میں لکھتا ہے،

"باوجودیکہ قدیم زمانہ میں بتوں کی پوجا نہیں تھی لیکن مجسمہ سازی اور سنگ تراشی کے فن کی ترقی کے ساتھ بتوں کی پوجا کی رسم بھی ترقی کرتی گئی اور امتداد زمانہ کے ساتھ مجسمہ سازی اور کسی موزوں مقام پر اس کو نصب کرنا اور ایک زندہ وجود کی حیثیت سے اس کا دھیان اور تیل سے اس کی مالش بہت اہم روایتیں بن گئیں،

دینی گرمجوشی اور سرگرمی کا بنیادی پہلو اور اظہار کا طریقہ عبادت ہے اور دینی حلقوں میں اس کا معروف طریقہ یہ ہے کہ معبود کے ساتھ ایک معزز مہمان کا سا برتاؤ کیا جاتا ہے، پجاری اس کو نہلاتا ہے، کپڑے پہناتا ہے، آراستہ کرتا ہے، خوشبو لگاتا ہے، پھر اس کو کھانا پیش کرتا ہے اس پر پھول نچھاور کرتا ہے اور ایک جلتی ہوئی شمع یا دیا لے کر گاتا ہوا اور منتر پڑھتا ہوا اس کا طواف کرتا ہے، کبھی ایک شاندار جلوس میں اس کو لے کر نکلتا ہے' یہ وہ

---

[1] Outlines of Hinduism-pages 48 to 50.

جگہ ہے جہاں قدیم مذہبی کہانیاں عوامی داستانوں سے مل جاتی ہیں، یہ رسمیں عوامی اجتماعی شکل میں مندروں میں انجام دی جاتی ہیں اور اس میں کوئی شخص اپنا شخصی فریضہ ادا کرنے سے قاصر نہیں رہتا،

بعض لوگ بلکہ شاید عوام کا ایک بہت بڑا طبقہ ان بتوں کو معبود ہی سمجھتا ہے اور اسی لئے "مورتی پوجا" کا لفظ مستعمل ہے، بعض لوگوں کے نزدیک بت صرف مخصوص اقدار کا رمز ہوتے ہیں، ان کی عبادت یا ان کی تقدیس دراصل معنوی اقدار کی مادی شکل کا مظاہرہ ہے اور بس،

اگر پوجا کرنے والا کٹر مذہبی ہوتا ہے تو وہ پوجا شروع کرنے سے پہلے زبردست تیاریاں کرتا ہے، غسل کرتا ہے اور پاک ہوتا ہے اور برت کے ذریعہ اپنی غذا بھی کم کر دیتا ہے، ریاضت بھی کرتا ہے اور سانس روک کر جسم کی مخصوص ہیئت کے ساتھ بیٹھتا ہے اور تصور کرتا ہے کہ اس کا معبود اس پر حاوی اور اس میں جاری وساری ہو گیا ہے، وہ خاموشی کے ساتھ مقدس الفاظ "منتر" پڑھتا ہے کبھی وہ ایک لفظ سے زیادہ نہیں ہوتا اور کبھی سو سو لفظ یا اس سے بھی بڑھ جاتا ہے اگر یہ کلمات طویل ہوں اور ان کو بار بار دہرایا جائے تو پھر حرف وصوت کی اہمیت باقی نہیں رہ جاتی، وہ مجرد شکل ہو جاتے ہیں، کبھی کبھی معانی سے محروم بھی ہو جاتے ہیں، کبھی کبھی صرف "رام رام" پر اکتفا کر لی جاتی ہے، اس طرح یہ عبادت خیال کو ایک نقطہ پر مرکوز کرنے میں مدد دیتی ہے اور ان کا عقیدہ ہے کہ اس میں انسان کو امان ملتی ہے، اس کی نذریں پوری ہوتی ہیں اور گناہ معاف ہوتے ہیں۔

عبادت کے دوسرے مراسم میں مقدس کتابوں کی تلاوت اور اس سے آگے بڑھ کر مخصوص طریقے سے مراقبہ بھی شامل ہے جسکی تشریح وتفصیل یوگ کی کتابوں میں ملتی ہے یہ ممکن ہے کہ یہ مراقبہ بے خودی اور انانیت سے آزادی کی ایک کیفیت پیدا کر دیتا ہو اور روح اس کے ذریعہ

کسی حد تک ابدی اور لامحدود صداقت کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتی ہو، اور یہی وہ چیز ہے جسکو ہندوستان کے تمام مذاہب مقصد اصلی اور آخری وحقیقی منزل سمجھتے ہیں،

ایک حد تک فرض عبادت وہی ہے جو ایک فرد اپنے گھر میں دن میں تین بار ادا کرتا ہے (صبح، دوپہر، شام) بہت سے لوگ اپنے معبودوں، دیویوں دیوتاؤں اور بزرگوں کے لئے نذریں بھی پیش کرتے ہیں[1]؛

عبادت کے ان طریقوں اور رسموں کے (جو ہندوستان کے مختلف حصوں اور مختلف ماحول سے تعلق رکھتی ہیں) ایک جائزہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ دو چیزیں ایسی ہیں جن میں یہ سارے طریقے (خواہ وہ ملک کے کسی حصہ میں ہوں) متحد ہیں۔

پہلی چیز موسیقی اور گانے سے حد سے بڑھی ہوئی دلچسپی ہے، مشکل سے کوئی مندر اور معبد، خاص طریقہ سے تالی پیٹنے اور گانے بجانے سے خالی ملے گا، موسیقی اور گانے ہندو مذہب کے خمیر میں شامل ہیں اور اسکے نظام میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں ہندو مذہب کے فلسفیوں، پنڈتوں اور پروہتوں نے پوجا کرنے والوں کے دلوں میں سوز وگداز پیدا کرنے کیلئے ہمیشہ اس کا سہارا لیا' درحقیقت اس میں وہ تمام مذاہب شامل ہیں جو انسانی تجربات پر اپنی اساس رکھتے ہیں اور تحریف کا شکار ہو چکے ہیں اور ان میں شرک داخل ہو گیا ہے،

اللہ تعالیٰ عہدِ جاہلیت کے عربوں کے متعلق ارشاد فرماتا ہے،

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَتَصْدِيَةً[2]،	اور (خود) ان کی نماز (ہی) خانہ (کعبہ) کے پاس کیا تھی بجز سیٹی اور تالی بجانے کے۔

---

[1] Louis Renon–Hinduism: p. 14, 15, 16

[2] سورہ انفال پ ۳۵ ۔ روح المعانی میں علامہ آلوسیؒ لکھتے ہیں کہ "عرب جاہلیت میں برہنہ طواف کرتے تھے انگلیوں میں انگلیاں ڈالے ہوئے سیٹی بھی بجاتے تھے اور تالیاں بھی پیٹتے جاتے تھے، نیز ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر جز ثانی صـ ۳۰۷"

اگران دلسوز گانوں، پرسوز موسیقی اوران دلنواز تالیوں سے بعض لوگوں کے خیال کے مطابق دلوں میں کچھ محبت وگداز ضرور پیدا ہوتا ہے تو دوسری طرف ان سے خشوع وخضوع، سکینت وطمانیت، اور وقار وسنجیدگی کے مقصد کو جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کیلئے بیحد ضروری ہے بڑا نقصان پہونچا ہے،

دوسری وحدت، جو زمان ومکان اور طرز عبادت کے اختلاف کے باوجود تمام فرقوں اور طبقوں میں پائی جاتی ہے وہ مورتی پوجا ہے اور ہندو فلسفہ کا اس کی افادیت پر اصرار ہے، سب سے زیادہ تعجب اس پر ہوتا ہے کہ چھٹی صدی مسیحی میں ہندو مذہب کے ایک بہت بڑے مصلح شنکراچاریہ نے بھی (جنھوں نے ہندوستان سے بودھ مت کا خاتمہ کرکے قدیم ہندو مذہب کو پھر سے زندہ اور رائج کیا) بتوں اور مجسموں کی عبادت کی پرزور وکالت کی ہے اور وہ اس کو مذہبی فکر کی ترقی کا ایک طبعی اور ناگزیر مرحلہ سمجھتے ہیں V. S. Ghate جو بمبئی یونیورسٹی میں ہندو مذہب کے شعبہ کے صدر ہیں وہ "مذاہب و اخلاق کے انسائیکلوپیڈیا" میں اپنے مقالہ میں لکھتے ہیں۔

"شنکراچاریہ نے مورتیوں کی پوجا کے عقیدہ کی مخالفت نہیں کی، وہ مجسمہ کو رمز اور مظہر سمجھتے ہیں، انھوں نے قدیم رسومات کے نظام (Ritualism) اور مکافات عمل (کرم) کے قانون کی مذمت کی ہے لیکن ہندو عوام کے مقبول دیوی دیوتاؤں کی طرف سے دفاع کیا ہے وہ کہتے ہیں:۔

"اصنام پرستی تغیر وانقلاب کے خاص مرحلہ میں ہماری ایک فطری ضرورت ہے، جب دینی روح اپنے کمال کو پہونچ جائے گی اور پختہ ہوجائے گی اس وقت انسان وثنیت سے مستغنی ہو جائے گا اور اس وقت اس کیلئے ان رموز و مظاہر سے نکل آنا ضروری ہوگا"[1]

مورتی پوجانے (خواہ ہندوستان کے دانشور اور فلسفی اس کی کیسی ہی حکمتیں بیان کریں اور اس کو کتنا ہی رمز اور عبوری مرحلہ قرار دیں) توحید کے خالص عقیدہ خدائے واحد کے ساتھ تعلق کو سخت نقصان پہونچایا ہے، یہ پجاری

---

[1] ملاحظہ ہو مقالہ شنکراچاریہ (چوتھا ایڈیشن ۱۹۵۸ء جلد ۱۱) Encyclopaedia of Religion and Ethics-(Fourth Edition) 1958, Vol. II.

بلا صرف انھیں مورتیوں کے ہو کر رہ گئے ہیں جن کی یہ پوجا کرتے ہیں اور ان ہی پر جینا مرنا چاہتے ہیں، وہ انکے سوا کسی اور چیز سے آشنا نہیں، ضرورت اور مصیبت کے وقت ان کو اس خدا کی طرف رجوع کرنے اور اسکو یاد کرنے کی نوبت بھی نہیں آتی جس کو وہ اصل حقیقت اور اصلی غرض و غایت بتاتے ہیں، جو شخص اس عبوری مرحلہ کو عبور کر کے "حقیقت ابدی" تک پہونچتا ہے اور (ان فلسفیوں کے نزدیک) عبادات کے مقصود تک رسائی حاصل کرتا ہے اور عبادت و دعا میں اخلاص پیدا کرتا ہے، وہ معدوم کے حکم میں داخل ہے اور ہو سکتا ہے کہ ان ملکوں اور قوموں میں ان کی تعداد انگلیوں پر شمار کی جا سکے، حضرت ابراہیمؑ کی زبان پر بے اختیار جو شکوہ اور فریاد جاری ہو گئی تھی اور جس کو قرآن مجید نے نقل کیا ہے وہ درحقیقت ہر زمانہ کے نظام شرک و بت پرستی پر صادق آتی ہے "رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ" (اے میرے پروردگار ان (بتوں) نے بہت سے لوگوں کی راہ ماری ہے) یہ بت ان کے دل و دماغ پر چھا چکے ہیں، ان کے ریشہ ریشہ میں سرایت کر گئے ہیں، ان کو اپنے معبود برحق سے بالکل غافل کر دیا ہے اور اس کے نتیجہ میں وہ خدا کی عبادت کی دولت و سعادت سے یکسر محروم ہو گئے ہیں؛

سنن و نوافل اور وتر کی نماز

دوسرے مذاہب میں نماز کی شکلوں کا جائزہ لینے کے بعد اب ہم پھر اسلامی نماز کی طرف واپس چلتے ہیں۔

نمازیں فرائض سے پہلے اور فرائض کے بعد کچھ اور نمازیں بھی ہیں جن کو "سنن راتبہ" کہتے ہیں، یہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں اور آپ نے زمانۂ اقامت میں ان کو پابندی سے ادا فرمایا ہے، ان کی مثال ان

ؔ فاضل گرامی مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے اپنے ایک مضمون میں بڑی خوبی کے ساتھ اس نکتہ کی طرف متوجہ کیا ہے کہ "رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ" کا مطلب یہ ہے کہ ان بتوں اور مورتیوں نے ہزارہا ہزار مخلوق کو اپنے ساتھ الجھا لیا ہے اور اپنے میں اس طرح مشغول کر لیا ہے کہ ان کو برسوں اور صدیوں معبود حقیقی کی طرف توجہ کرنے اور اس سے براہ راست تعلق پیدا کرنے کا خیال ہی نہیں پیدا ہوتا اور نہ اس کی بھی توفیق ہوتی ہے؛

خندقوں کی طرح ہے جو کسی قلعہ اور فصیل کی حفاظت کیلئے اس کے چاروں طرف کھودی جاتی ہیں، یا اس شہر پناہ کی طرح جو شہر کی حفاظت کیلئے تعمیر کی جاتی ہے اور جن کو پار کئے بغیر دشمن قلعہ یا شہر میں داخل نہیں ہو سکتا، جو سنتوں کی حفاظت اور اہتمام کرتا ہے وہ فرض نماز کا بدرجہ اولیٰ اہتمام کرے گا اور سب سے زیادہ اس کی فکر رکھے گا اس کے علاوہ سنن فرائض کی کمزوریوں اور نقائص کو پورا کرتی ہیں اور اس میں جو کمی یا بھول رہ جاتا ہے اسکی تلافی کر دیتی ہیں[1]۔

حضرت ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ "میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دو رکعت ظہر سے پہلے، دو رکعت اس کے بعد، دو رکعت مغرب کے بعد آپ کے گھر میں، دو رکعت عشا کے بعد آپ کے گھر میں پڑھی، فرماتے ہیں کہ حضرت حفصہؓ نے مجھ سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فجر کے وقت دو ہلکی رکعتیں پڑھتے تھے[2]۔"

ایک اور حدیث میں ہے کہ "جو شخص دن اور رات میں بارہ رکعتیں پڑھے گا اس کیلئے جنت میں ایک مکان تیار کیا جائے گا، چار رکعتیں ظہر سے قبل، دو رکعتیں اس کے بعد، دو رکعت بعد مغرب، دو رکعت بعد عشا اور دو رکعت فجر کی نماز سے پہلے[3]"۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ "جو بارہ رکعت سنتوں پر مداومت کرے گا، اللہ تعالے اس کیلئے جنت میں ایک گھر تعمیر فرمائے گا، چار رکعتیں ظہر سے قبل، دو اس کے بعد، دو رکعتیں مغرب کے بعد، دو رکعتیں عشا کے بعد

---

[1] ترمذی اور نسائی میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "سب سے پہلی چیز جس کا قیامت کے روز بندہ سے محاسبہ کیا جائے گا وہ نماز ہے اگر وہ ٹھیک رہی تو کامیاب ہوا، اگر وہ خراب نکلی تو ناکام و نامراد ہوا، اگر اس کے فرائض میں کچھ کمی نظر آئے گی تو اللہ تعالے ارشاد فرمائیں گے دیکھو میرے بندہ کے نامہ اعمال میں کچھ نفلی نمازیں ہیں؟ پھر اس سے فرائض کی کمی کو دور کیا جائے گا اور باقی اعمال کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوگا"۔ [2] صحیحین

[3] ترمذی عن ام حبیبہؓ

اور دو رکعتیں فجر سے پہلے "[51]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ" آپ میرے گھر میں ظہر سے پہلے چار رکعت پڑھتے تھے، پھر باہر آکر نماز پڑھاتے تھے پھر واپس آکر دو رکعت پڑھتے، مغرب کی نماز پڑھا کر گھر تشریف لاتے اور دو رکعت پڑھتے، پھر عشا کی نماز پڑھاتے اور گھر آکر دو رکعت پڑھتے، فجر میں بھی دو رکعت پڑھتے "[52]

آپ عشا کے بعد یا تہجد کے بعد وتر پڑھتے تھے اور اس کو سفر و حضر میں کبھی نہیں چھوڑتے تھے، صحیح روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ" وتر حق ہے" جس نے وتر ترک کر دیا وہ ہم میں سے نہیں ہے، وتر حق ہے، جس نے وتر ترک کر دیا وہ ہم میں سے نہیں ہے، وتر حق ہے، جس نے وتر ترک کر دیا وہ ہم میں سے نہیں ہے[53]، ایک دوسری روایت میں ہے کہ" اللہ نے تم کو ایک اور نماز کا عطیہ دیا ہے، وہ تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے، وہ وتر ہے، اللہ نے اس کو نماز عشا کے بعد سے طلوع فجر سے پہلے پہلے رکھا ہے[54] "

ان سنتوں میں سب سے اہم سنت طلوع فجر کے بعد کی دو رکعتیں ہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ارشاد ہے کہ" رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرائض کے بعد کسی چیز کا اتنا اہتمام نہیں فرماتے تھے جتنا فجر کی ان دو رکعتوں کا[55] "

ابوداؤد میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ" ان کو ترک نہ کرو خواہ گھوڑے تم کو روند ڈالیں[56] "

---

[51] ترمذی ونسائی [52] مسلم وابوداؤد (باختصار) [53] ابوداؤد عن بریدہ رضی اللہ عنہ [54] ترمذی وابوداؤد، روایت خارجہ ابن حذیفہ رضی اللہ عنہ [55] صحاح ستہ

[56] علامہ ابن القیم کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سفر میں فجر کی سنت اور وتر کا تمام سنن سے زیادہ اہتمام فرماتے تھے، سفر میں آپ سے ان دو کے علاوہ کسی کا اس قدر التزام مروی نہیں (زاد المعاد) دوسری جگہ کہتے ہیں کہ اصحاب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم (صحابہ کرامؓ) جب سفر کرتے تھے تو فرض سے پہلے اور فرض کے بعد نوافل پڑھتے تھے، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، جابرؓ، انسؓ، حضرت ابن عباسؓ اور ابوذر رضی اللہ عنہم سے یہی روایت ہے، البتہ ابن عمر فرض سے قبل یا بعد، نفل کے قائل

(باقی حاشیہ صفحہ ١٠٠ پر)

نمازوں کا تنوع اور انکے مختلف اغراض و مقاصد

نماز ایک ایسی چیز ہے جس کو ادا کر کے نہ آدمی آزاد اور اپنی تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جاتا ہے اور نہ اس کو چھوڑ کر کسی اور چیز سے اس کی تلافی کر سکتا ہے، یہ مومن کی ڈھال بھی ہے مومن کی شمشیر بھی، یہ وہ "شاہ کلید" ہے جس سے ہر قفل کھل سکتا ہے اور ہر مصیبت ٹل سکتی ہے اور ہر قسم کا تردد، اضطراب اور حزن و یاس دور ہو سکتا ہے، اسی وجہ سے خوف کیلئے، استسقاء کیلئے، سورج گرہن کیلئے، استخارہ کیلئے، کسی ضرورت کی تکمیل کیلئے، نیز موت و شہادت کی تیاری کیلئے علیحدہ علیحدہ نمازیں ہیں۔[۱۵]

نماز کے بارہ میں اسلاف کا نقطۂ نظر اور طرز عمل

ایک مسلمان کیلئے ضروری ہے کہ وہ نماز کو اپنا مونس و غمخوار، معین و مددگار سمجھے، اور جب بھی اس کو کوئی مشکل پیش آئے، کوئی فکر و پریشانی لاحق ہو یا کسی مصیبت و آزمائش کا سامنا کرنا پڑے تو فوراً اس کریم کا دروازہ کھٹکھٹائے اور جب تک اس کی مراد پوری نہ ہو اس کے در پر پڑا رہے، صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کا معاملہ نماز کے ساتھ یہی تھا، ان کو نماز پر اس سے زیادہ ناز اور اعتماد تھا جتنا سپاہی کو اپنی شمشیر پر، مالدار کو اپنی دولت پر، اور بچہ کو اپنی فریاد اور آہ و بکا پر ہوتا ہے اور وہ بڑی آسانی کے ساتھ ماں کی شفقت کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے، یہ ان کا مزاج اور طبیعت ثانیہ بن گئی تھی، جس کیلئے ان کو کسی تکلف، تصنع اور آورد کی ضرورت نہ تھی جب بھی ان کو کسی قسم کا اضطراب یا خوف لاحق ہوتا یا معاملہ الجھتا نظر آتا دشمن کی فوجیں ہر طرف

(باقی حاشیہ صفحہ ۹۹ کا) نہ تھے، اور دات میں وتر کے ساتھ نفل پڑھتے تھے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ظاہر طریقہ سے بھی یہی ثابت ہے کہ آپ فرض سے قبل یا بعد نفل نہ پڑھتے تھے نہ اسکے پڑھنے سے منع فرماتے تھے بلکہ وہ نفل مطلق کی طرح ہے وہ قیام کی طرح سنت راتبہ نہیں ہے (زاد المعاد ج ۱ صفحہ ۱۲۹)

[۱۵] امام بخاری نے "باب کرامۃ الاولیاء و فضلہم" کے عنوان سے حضرت ابوہریرہؓ کی یہ حدیث درج کی ہے کہ جب حضرت خبیبؓ قتل کیلئے حدود حرم سے باہر لے جائے گئے تو انھوں نے کہا کہ مجھے دو رکعت پڑھ لینے دو، انھوں نے انکو چھوڑ دیا حضرت خبیبؓ نے دو رکعتیں پڑھیں اور کہا کہ اگر اس کا خیال نہ ہوتا کہ تم لوگ مجھے بزدل سمجھو گے تو میں اور پڑھتا، چنانچہ حضرت خبیبؓ ہی یہ سنت رائج ہوئی

سے ان پر یلغار کرتیں یا فتح و نصرت میں تاخیر ہونے لگتی تو وہ فوراً نماز کیلئے دوڑ پڑتے اور اس کی پناہ میں آجاتے،
درحقیقت ائمہ اسلام، اولیاء امت اور مصلحین ملت کا ہر زمانہ میں یہی حال رہا ہے، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ
کے متعلق آتا ہے کہ جب کوئی بات انکی سمجھ میں نہ آتی یا کوئی عقدہ حل نہ ہوتا تو وہ کسی ویران اور دور افتادہ مسجد میں چلے
جاتے، نماز پڑھتے اور اپنی پیشانی خاک پر رکھتے اور دیر تک سجدہ میں پڑے رہتے اور کہتے "یا معلم ابراھیم علمنی"
(اے ابراہیمؑ کے سکھانے والے مجھے بھی یہ علم سکھا دے) بڑے درد و سوز کے ساتھ دعا کرتے اور خدا کے
حضور سر نیاز جھکا کر اور گڑگڑا کر سوال کرتے اور اس پر خوش ہوتے کہ وہ اس در کے فقیر اور بھکاری ہیں اور
پشت در پشت سے ان کا یہی پیشہ ہے جو باپ دادا سے ورثہ میں ان کو ملا ہے کبھی کبھی وہ اپنی دعا و مناجات
میں یہ شعر بھی پڑھتے تھے ؎

أنا المكدي وابن المكدي … وهكذا كان ابي وجدي[1]

میں بھکاری ہوں میں بھکاری ہوں … اور اسی طرح میرے باپ اور دادا بھی بھکاری تھے

تہجد، اسکے اثرات و فوائد، اسکے ساتھ اسلاف کا معاملہ اور اہلِ دعوت و اصلاح کیلئے اسکی اہمیت

روح کی تقویت کا سب سے بڑا ذریعہ اور دل کو حرارت پہونچانے اور گرم رکھنے کا سب سے موثر
طریقہ قیام اللیل یعنی تہجد کی نماز ہے جس کی قرآن مجید نے بار بار ترغیب دی ہے، اور تہجد پڑھنے والوں کی اس
انداز میں تعریف کی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی فرض سے کم اہم نہیں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سفر و حضر دونوں
میں اس کی پابندی فرماتے تھے[2]، چنانچہ بہت سے علماء کی رائے یہ ہے کہ تہجد کی نماز آپ پر فرض تھی[3]

---

[1] مدارج السالکین ج ۱ صفحہ ۲۹۶ مطبع المنار مصر [2] علامہ ابن القیم فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قیام اللیل (تہجد کی نماز) کو سفر و حضر دونوں میں نہیں چھوڑتے تھے جب آپ پر نیند یا مرض کا غلبہ ہوتا تھا تو دن میں بارہ رکعت پڑھ لیتے تھے (زاد المعاد ج ۱ ص ۸۱)

[3] علامہ بحر العلوم لکھتے ہیں کہ اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ تہجد کی نماز آپ پر فرض تھی یا نفل، ایک جماعت اولی الذکر (باقی حاشیہ صفحہ ۱۰۲ پر)

اللہ تعالے کا ارشاد ہے،

يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ، قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا، نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا، اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا، اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا، اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّ اَقْوَمُ قِيْلًا، اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا، وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا، رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا[1]

اے کپڑوں میں لپٹنے والے رات کو (نماز میں) کھڑے رہا کیجئے مگر ہاں تھوڑی رات یعنی آدھی رات یا اس سے کچھ کم کیجئے یا اس سے کچھ بڑھا دیجئے اور قرآن خوب صاف صاف پڑھئے، ہم آپ پر عنقریب ایک بھاری کلام ڈالنے کو ہیں، بیشک رات کے وقت اٹھنے میں (دل و زبان کا) خوب میل رہتا ہے، اور بات خوب ٹھیک نکلتی ہے، بیشک آپ کیلئے دن میں بہت مشغولی ہے اور آپ اپنے پروردگار کے نام کو یاد کرتے رہئے، اور سب سے ٹوٹ کر اسی کی طرف متوجہ رہئے، وہ پروردگار ہے مشرق و مغرب کا کوئی معبود اس کے سوا نہیں، اسی کو اپنا چارہ ساز بنائے رکھئے۔

دوسرے موقع پر ارشاد ہے۔

وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ، عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا[2]

اور رات کے کچھ حصہ میں بھی، سو اس میں تہجد پڑھ لیا کیجئے (جو) آپ کے حق میں زائد چیز ہے، عجب کیا کہ آپ کا پروردگار آپ کو مقام محمود میں جگہ دے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تہجد کی نماز کی بہت پابندی کرتے تھے اور اس کا بڑا اہتمام فرماتے تھے، ایسا

(باقی حاشیہ صفحہ ۱۰۱ کا) کو ترجیح دیتی ہے اور اہل اصول بھی اسی میں شامل ہیں، قسطلانی کہتے ہیں کہ اکثر علما رشوافع بھی اسی مسلک پر ہیں، البتہ ایک جماعت موخر الذکر کو ترجیح دیتی ہے (رسائل الارکان صہ ۱۳۴ طبع لکھنؤ) [1] سورہ مزمل۔ ا تا ۹ [2] سورہ بنی اسرائیل۔ ۷۹

معلوم ہوتا تھا کہ آپ کو اس سے بہت خاص تعلق اور لگاؤ ہے آپ اس نماز میں اتنا طویل قیام اور رکوع فرماتے کہ آپ کے قدم مبارک پر ورم آجاتا، مغیرہ بن شعبہؓ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اتنی دیر قیام فرمایا کہ آپ کے قدم مبارک متورم ہوگئے، عرض کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے تو آپ کے اگلے پچھلے تمام گناہ معاف کردئے ہیں، آپ نے فرمایا کہ "کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں[1]" ترمذی نے حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے کہ "آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک دن ساری رات ایک آیت میں گزار دی"

صحابہ کرام کے حالاتِ زندگی اور حدیث، سیرت اور تاریخ کی کتابوں پر جس کی نظر ہے وہ اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کہ تہجد کی نماز کا صحابہ کرام میں عام رواج تھا بلکہ تہجد ان کا شعار بن گیا تھا چنانچہ شاہ روم ہرقل اور اس کے ساتھیوں کے سامنے ان کی جو پہچان بتائی گئی وہ یہی تھی یعنی "رات کے عبادت گزار اور دن کے شہسوار"

امام حسن بصریؒ سے زیادہ صحابہ کرامؓ سے واقف اور کون ہوگا وہ کہتے ہیں:-

"مومنوں کے پاس جب یہ دعوت حق آئی تو انھوں نے اس کی فوراً تصدیق کی اس کا یقین ان کے دل کی گہرائیوں میں اتر گیا، نہ صرف ان کے قلوب بلکہ ان کے جسم، عقلیں اور نگاہیں خشوع و انابت کے ساتھ جھک گئیں، خدا کی قسم اگر تم ان کو دیکھتے تو تم کو ایسی جماعت نظر آتی جس کے متعلق گمان ہوتا کہ شاید اس نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے وہ اہل جدال اور اہلِ باطل کے طرز کے نہ تھے، وہ ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے اللہ کی بات سنی اور تسلیم خم کردیا اور اللہ تعالے نے قرآن مجید میں ان کی بہت تعریف فرمائی،

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ	اور (خدائے) رحمٰن کے (خاص) بندے، وہ ہیں
عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا[2]،	جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلتے ہیں۔

---

[1] بخاری و مسلم، ترمذی و نسائی [2] سورہ الفرقان - ۶۳

پھر ان کی راتوں کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا،

وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا[1] — اور جو راتوں کو اپنے پروردگار کے سامنے سجدہ و قیام میں لگے رہتے ہیں،

یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے لئے اپنے پیروں پر سرو قد کھڑے رہتے ہیں اور اپنے چہروں کو اللہ تعالیٰ کیلئے خاک آلود کرتے ہیں، آنسو انکے چہروں کو بھگوئے ہوتے ہیں اور خدا کا خوف ان کے دل میں جاگزیں ہوتا ہے"

...پھر امام حسن بصریؒ کہتے ہیں کہ کوئی بات ہی تو تھی جس کے لئے انھوں نے اپنی راتوں کی نیند حرام کی اور کوئی بات ہی تو تھی جس کے لئے دن بھر خوف خدا سے لرزتے رہے[2]،،

تہجد کی نماز ہر زمانہ اور ہر طبقہ میں صلحا اور اہل اللہ، علماء و مجاہدین اور مصلحین و اہلِ دعوت کا شعار اور پہچان بن گئی تھی، وہ اپنے دن بھر کی محنت و مجاہدہ اور اپنے مشاغل و سرگرمیوں کیلئے جن کیلئے غیر معمولی قوت برداشت اور صبر و تحمل کی ضرورت ہوتی ہے، اسی شب بیداری و سحر خیزی سے قوت و غذا یا دوسرے الفاظ میں ایندھن حاصل کرتے تھے، جس نے رات کے اندھیرے اور سناٹے میں جب ساری مخلوق محو خواب ہوتی ہے ان کا اپنے رب سے راز و نیاز اور دعا و مناجات اور ان کی عبدیت و محویت نہ دیکھی ہو وہ یہ سمجھ ہی نہیں سکتا کہ ان علماء حق اور مصلحین امت میں اتنی غیر معمولی قوت کہاں سے آگئی، اور تعلیم و تدریس اور اصلاح و تربیت کے میدان میں ان کی شبانہ روز اور مسلسل محنت اور مشکلات و مصائب کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرنے کی صلاحیت کا اصل سرچشمہ اور راز کیا ہے؟ یہاں تک کہ وہ علماء بھی جنکو بعض حقیقت ناشناس علماء ظاہر سمجھتے ہیں اور ان پر خشکی اور سختی کا الزام لگاتے ہیں، تہجد اور ذکر و تسبیح کے بیحد پابند تھے، اس سے اندازہ کرنا چاہئے کہ ان علماء کا اس معاملہ میں کیا حال ہوگا جو کثرت عبادت، شدت زہد، رقت قلب اور خلق خدا کی اصلاح و ہدایت اور روحانی تعلیم و تربیت میں مشہور و معروف ہیں، مثلاً حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، شیخ شہاب الدین سہروردیؒ، امام ربانی مجدد الف ثانیؒ

---

[1] سورہ الفرقان - ۶۴ [2] کتاب قیام اللیل (از محدث کبیر محمد بن نصر المروزی (م ۲۹۴ھ) طبع لاہور

اور حضرت سید احمد شہیدؒ وغیرہ،

علامہ ابن القیم اپنے استاد اور شیخ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے متعلق شہادت دیتے ہیں کہ:۔

"ایک مرتبہ شیخ الاسلام صبح کی نماز سے فارغ ہوئے اور ذکر کے لئے بیٹھ گئے یہاں تک کہ قریب قریب نصف دن چڑھ آیا، پھر میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ یہ میرا ناشتہ ہے اگر میں یہ ناشتہ نہ کروں تو میری ساری قوت ختم ہو جائے یا اس طرح کی کوئی بات فرمائی"[1]

یہی حال ان کے شاگرد ابن قیم کا بھی تھا، مشہور مورخ ابن کثیر ان کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"اس زمانہ میں عبادت میں ان سے بڑھ کر میری نظر میں اور کوئی نہیں، نماز میں ان کا خاص انداز تھا، بہت طویل نماز پڑھتے تھے اور رکوع وسجود دونوں بہت طویل کرتے تھے ان کے بہت سے ساتھی اس پر ان کو ہدف ملامت بھی بناتے تھے لیکن وہ اس سے باز نہ آتے تھے"[2]

علامہ ابن رجب حنبلی کہتے ہیں کہ "وہ عبادت وتہجد اور طول صلوٰۃ میں آخری حد تک پہونچ گئے تھے، ذکر الٰہی سے وابستگی، محبت وانابت کی کیفیت اور اللہ تعالیٰ کے سامنے دل شکستگی، اپنی عاجزی واحتیاج کا استحضار واظہار اور اس کی عبودیت کی چوکھٹ پر پڑے رہنے کا خاص ذوق اور حال رکھتے تھے، میں نے اس چیز میں ان جیسا کسی اور کو نہیں پایا"[3]

اس سے زیادہ عجیب معاملہ علامہ ابن جوزی کا ہے جو ناقدین کے سرخیل اور زہاد وعباد کی تردید وتنقید کے علمبردار سمجھے جاتے ہیں، ان کے پوتے ابو المظفر بیان کرتے ہیں کہ "وہ سات دن میں ایک قرآن ختم کرتے تھے، ابن النجار کہتے ہیں کہ ان کو اذواق صحیحہ اور دعا ومناجات کی حلاوت کا حظ وافر ملا تھا، ابن القادسی کا بیان ہے کہ وہ تہجد کے پابند تھے اور کسی حال میں ذکر اللہ کو ترک نہ کرتے تھے"[4]

---

[1] الوابل الصیب از ابن القیم ص ۱۹، [2] البدایہ والنہایہ ج ۱۴ ص ۲۳۵ [3] البدایہ والنہایہ ج ۱۴ ص ۲۳۵

[4] التاج المکلل ص ۱۴۷ بحوالہ طبقات الحنابلہ۔

مسلمانوں کے تمام ائمہ قائدین، مصلحین، اور علماء روزگار جن کے نفوس قدسیہ اور انفاس طیبہ کی برکت سے مسلمانوں کو کسی قسم کا فائدہ پہونچا، یا جن کے کارناموں اور ذخائر علمی کو اللہ تعالےٰ نے قبول عام اور بقاء دوام عطا فرمایا، ان سب کا نماز کے معاملہ میں یہی حال تھا، وہ سب اسی طرح عبادت گزار، شب بیدار اور سحر خیز تھے اور اللہ تعالےٰ سے خاص روحانی تعلق رکھتے تھے، اس عہد میں یہی امت کا معیار اور دستور تھا، اور یہی معیار و دستور آج بھی اس کیلئے نشانِ راہ ہے اور مشیت الٰہی کا فیصلہ ہے کہ غفلت سے بیداری، موت سے زندگی، قساوت سے لطافت اور جمود سے حرکت نہ آج تک پیدا ہوئی ہے اور نہ کبھی ہوسکتی ہے،

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا[1]،

اللہ کا یہی دستور رہا ہے ان لوگوں میں بھی جو (ان سے) بیشتر گزر چکے ہیں، اور آپ اللہ کے دستور میں ردوبدل نہ پائیں گے،

نوافل اور کثرت عبادات کے ثمرات ونتائج

نمازوں کا (اس کی روح اور ظاہری ہیئت دونوں کے ساتھ) اہتمام، نوافل کی کثرت، اور ذوق عبادت، صفاء نفس، روحانی بالیدگی، عالم قدس سے اتصال، اور تجلیات ربانی کے حصول میں جو حصہ ہے وہ کسی اور چیز میں نہیں، حدیث شریف میں آتا ہے کہ

اما انکم سترون ربکم کما ترون ھذا[2] لا تضامون فی رویته فان استطعتم ان لا تغلبوا علی صلوٰة قبل طلوع الشمس وقبل غروبھا فافعلوا ثم قال "فسبح بحمد ربك قبل طلوع الشمس وقبل

تم اپنے رب کو اس طرح دیکھو گے جس طرح اس کو دیکھ رہے ہو اس کے دیکھنے میں تم کو کوئی شبہ نہیں ہوتا، پس اگر تم ایسا کرسکو کہ طلوع آفتاب اور غروب آفتاب سے پہلے والی نماز تم سے فوت نہ ہوسکے تو ایسا ضرور کرو، پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی فسبح الخ (ترجمہ)

---

[1] سورہ احزاب - ٦٢   [2] یہ فرماکر آپ نے چاند کی طرف اشارہ فرمایا،

پس پاکی بیان کرو اپنے رب کی طلوع آفتاب اور غروب آفتاب سے قبل، غروبہا[1]،

بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ "نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فجر کی نماز کے وقت حضرت بلالؓ سے فرمایا کہ بلال مجھے اپنا وہ عمل بتلاؤ جس سے تم کو اپنے اسلام میں سب سے زیادہ امید ہو اس لئے کہ میں نے تمہارے قدموں کی چاپ جنت میں سنی ہے، انھوں نے کہا کہ میں نے کوئی ایسا عمل نہیں کیا جس سے مجھے امید ہوتی، البتہ میں جب دن رات کے کسی حصہ میں وضو کرتا تھا تو اس وضو سے جس قدر توفیق ہوتی نماز ضرور پڑھ لیتا[2]،

نوافل وعبادات قلب میں محبت الٰہی راسخ کرنے اور اس کی رحمت ورضامندی کے حصول کا بہت بڑا ذریعہ ہیں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان صحابی کو جو آپ سے جنت میں رفاقت کے خواستگار ہوئے تھے کثرت نوافل اور کثرت سجود کی ہدایت فرمائی تھی،

مسلم میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خادم ابوفراس ربیعہ ابن کعب الاسلمی سے جو اہل صفہ میں سے تھے روایت ہے کہتے ہیں کہ "میں شب میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر رہتا تھا اور وضو اور دوسری ضروریات کا خیال رکھتا تھا، ایک دن آپ نے فرمایا کچھ مانگو، میں نے عرض کیا کہ میں جنت میں آپ کی رفاقت چاہتا ہوں، آپ نے فرمایا اس کو چھوڑ کر اور کچھ نہیں؟ میں نے عرض کیا کہ بس تو یہی چاہتا ہوں آپ نے فرمایا بس کثرت سجود کے ذریعہ میری مدد کرو[3]"،

نوافل وطاعات سے مشیت الٰہی کے سامنے بندہ کا عجز اور فنائیت نیز خدا کا خوف اور خدا کی محبت پیدا ہوتی ہے اور ان بہیمانہ صفات اور حیوانی عادات سے رہائی نصیب ہوتی ہے جو ہر ظلم وزور دستی معصیت و سرکشی، نفس پرستی اور امر الٰہی سے سرتابی کا سرچشمہ اور ظلم وفساد کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں،

---

[1] بخاری ومسلم [2] بخاری (ج ۱ باب فضل الوضوء) [3] مسلم۔

حدیث صحیح میں آتا ہے کہ جن چیزوں سے میرا بندہ مجھ سے تقرب حاصل کرتا ہے ان میں میرے نزدیک فرائض سے زیادہ محبوب اور کوئی چیز نہیں، اور میرا بندہ برابر نوافل کے ذریعہ مجھ سے قریب ہوتا جاتا ہے، یہانتک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں اور جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کا کان ہو جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے ہاتھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ مقابلہ کرتا ہے، پیر ہو جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے، جب مجھ سے کسی چیز کا سائل ہوتا ہے تو میں اس کو ضرور دیتا ہوں اور پناہ چاہتا ہے تو ضرور پناہ دیتا ہوں[۱]"

نمازیں جُدا ہیں اور نمازیوں کے مرتبے بھی جُدا

نماز کوئی ایسا آہنی سانچہ یا چوب خشک کی طرح کوئی جامد اور محدود چیز نہیں جس میں سب یکساں ہوں اور ہر نمازی ایک سطح پر رہنے کیلئے مجبور اور اس سے آگے بڑھنے سے قاصر ہو وہ دراصل ایک بہت بڑا اور وسیع و عریض میدان ہے جہاں نمازی ایک حال سے دوسرے حال تک اور عروج سے کمال تک اور کمال سے ان منزلوں تک پہونچتا ہے جو اس کے تصور و خیال سے بھی ماوراء ہیں، اس میں لوگوں کا مرتبہ و مقام ایک دوسرے سے بہت مختلف اور جدا ہے اور سب کی سطح الگ ہے غفلت اور جہالت والی نماز استحضار اور تفقہ والی نماز کا مقابلہ کیسے کر سکتی ہے؟ اسی طرح عامۃ المسلمین اور عارفین واہل یقین کی نماز ایک درجہ پر کیسے رکھی جاسکتی ہے پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ آج کی نماز کل والی

۱؎ علامہ ابن حجر عسقلانی اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے بعض عارفین سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے اس کو فنا و محو پر محمول کیا ہے اور اس کو ایسی غایت قرار دیا ہے جس کے بعد کوئی اور منزل نہیں، اور وہ یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالےٰ سے تعلق قائم کرنے سے اسکی نظر سے دیکھنے والا بن جائے اور اس میں کوئی ایسی چیز باقی نہ رہ جائے جس کا اسکے نام و نشان سے کچھ علاقہ ہو اسکے معنی یہ ہیں کہ وہ اللہ تعالےٰ کے قیام کے ساتھ اپنے قیام، اس کی مشیت کے ساتھ اپنی طلبیت، اور اپنی ذات پر اسکی نگاہ کا مشاہدہ خود کرنے لگے (فتح الباری) ج ۱۱ ص ۲۹۶

نماز سے یا چند ماہ اور چند سال پیشتر والی نماز سے مشابہ ہو اور نمازی ہمیشہ ایک ہی معیار کی نماز پڑھتا ہے۔

اسی لئے قرآن مجید میں نمازوں کا ذکر دو طرح آتا ہے، ایک کا برائی کے ساتھ ایک کا اچھائی کے ساتھ، اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے،

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلٰوتِهِمْ سَاهُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ[1] ۝	سو بڑی خرابی ہے ایسے نمازیوں کیلئے جو اپنی نماز کو بھلا بیٹھتے ہیں (اور) جو ایسے ہیں کہ ریاکاری کرتے ہیں اور حقیر چیزوں تک روکے رہتے ہیں،

دوسری قسم کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے،

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلٰوتِهِمْ خَاشِعُوْنَ[2] ۝	یقیناً (وہ) مومنین فلاح پا گئے جو اپنی نمازیں خشوع رکھنے والے ہیں،

اسی طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی دو قسم کی نمازوں کا ذکر فرمایا ہے ایک خشوع وخضوع اور رقت وکیفیت والی نماز، اور ایک غفلت ولاپرواہی والی ناقص نماز، پہلی قسم کے متعلق رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

وقد توضأ فأحسن الوضوء (ثم قال) من توضأ وضوئی هذا ثم یصلی رکعتین لا یحدث فیهما بشیٔ غفرله ماتقدم من ذنبه[3]۔	آپ نے وضو کیا اور اچھا وضو کیا (پھر ارشاد ہوا) جو میرے وضو کی طرح وضو کرے اور دو رکعت پڑھے اور اس میں اپنے دل کے اندر کوئی خیال نہ لائے تو اس کے سارے گذشتہ گناہ معاف کردئے جائیں گے۔

---

[1] سورہ ماعون آیت ۴-۵-۶-۷ [2] سورہ مومنون - ۱-۲ [3] بخاری ومسلم روایت حضرت عثمان بن عفانؓ

عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو مسلمان بھی اچھی طرح وضو کرتا ہے پھر کھڑے ہو کر دو رکعت ادا کرتا ہے اور اپنے دل اور چہرہ دونوں کے ساتھ نماز کی طرف متوجہ رہتا ہے تو اس پر جنت واجب ہو جاتی ہے[1]"

دوسری نماز کے متعلق عمار بن یاسرؓ آپ سے روایت کرتے ہیں کہ "میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ آدمی نماز سے فارغ بھی ہو جاتا ہے اور اس کو اس کی نماز کا صرف دسواں حصہ نصیب ہوتا ہے، اور بعض اوقات نواں، آٹھواں، ساتواں، چھٹا، پانچواں، چوتھائی، تہائی اور نصف[2]"

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ "سب سے بُرا آدمی وہ ہے جو اپنی نماز چرالیتا ہے صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ اپنی نماز کس طرح چراتا ہے؟ آپ نے فرمایا نہ رکوع ٹھیک کرتا ہے، نہ سجدہ[3]"

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "یہ منافق کی نماز ہے جو بیٹھا آفتاب کو دیکھتا رہتا ہے جب آفتاب زرد ہو جاتا ہے اور شیطان کی دونوں سینگوں کے بیچ میں پہونچ جاتا ہے تو کھڑا ہو کر جس طرح مرغی چونچ مارے اس طرح عجلت کے ساتھ چار رکعت پڑھتا ہے جس میں اللہ تعالےٰ کی یاد کم ہی ہوتی ہے[4]"

نمازیں لوگوں کے مراتب مختلف ہیں، ایک کی نماز کو دوسرے کی نماز پر قیاس نہیں کیا جاسکتا چنانچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نماز سب سے زیادہ افضل، اکمل اور اعلیٰ وارفع تھی اور خدا کی میزان میں اس کا وزن سب سے زیادہ تھا، حضرت ابوبکرؓ کی نماز کسی دوسرے کی نماز کی بہ نسبت حضورؐ کی نماز سے سب سے زیادہ مشابہ اور قریب تھی، اسی لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مرض وفات میں ان کو اپنی جگہ امامت کا حکم فرمایا، اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس رائے کے باوجود کہ حضرت

---

[1] مسلم [2] ابوداؤد و نسائی [3] مسلم [4] نسائی۔

عمرؓ نماز پڑھائیں، آپ نے فرمایا" ابوبکر سے کہو نماز پڑھائیں"[1] چنانچہ اسی پر عمل ہوا،

اس کے علاوہ لوگوں کے درجہ اور مرتبہ کا صحیح اندازہ نماز سے جتنا ہو سکتا ہے اتنا کسی اور چیز مثلاً علم، ذہانت اور کسی علمی خدمت سے نہیں ہو سکتا، نماز ہی وہ صحیح پیمانہ ہے جس پر انسان کے دین کا اور اسلام میں اس کے مقام کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، اسلامی تاریخ میں جن شخصیتوں کا نام زندہ جاوید ہے اور جو اپنے ہمعصروں میں بہت ممتاز نظر آتی ہیں ان کو یہ مرتبہ و مقام اور یہ بقاء دوام اسی نماز میں امتیاز و خصوصیت پیدا کرنے اور اس کے درجۂ احسان تک پہونچنے سے حاصل ہوا ہے۔

ختم نبوت اور حضورؐ کی وفات کے بعد نماز اور قرآن کی اہمیت و فضیلت

نبوت ایک ایسا آفتاب عالمتاب تھی جسکی کرنیں کائنات کے گوشہ گوشہ کو منور کرتی تھیں اور دلوں کو روشنی و حرارت اور زندگی و قوت بخشتی تھیں، اسلئے بہت کم وقت میں (لیکن بہت بڑی تعداد اور بہت بڑے رقبہ میں) خالق و مالک سے اس کے بندوں کا رشتہ استوار ہوتا اور جس کے ساتھ اللہ تعالےٰ کی توفیق ہوتی وہ غفلت اور سستی اور جہالت اور گمراہی کی پستیوں سے نکل کر علم و حکمت، عالی حوصلگی و بلند ہمتی، وصول و کمال، اور قرب و ولایت کی آخری بلندیوں تک پہونچ جاتا، نبوتوں کا یہ سلسلہ برابر قائم رہا یہاں تک کہ کچھ وقفہ کے بعد حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی (تمام انبیاء کرام میں) آپ کی شخصیت سب سے زیادہ طاقتور، آپ کی دعوت .... سب سے زیادہ جامع اور مکمل، اور آپ کی صحبت اس قدر کیمیا اثر تھی کہ اس کی وجہ سے شدید عداوت بھی محبت و فنائیت میں، خدا سے دوری و مہجوری اور بعد و وحشت، اس کے قرب و وصال اور انس و الفت میں تبدیل ہو جاتی تھی، آپ کی صحبت میں لوگوں کو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی برقی لہر ان کے وجود میں دوڑنے لگی ہے، وہ چند لمحوں کے اندر

---

[1] بخاری

ظن وتخمین سے گزر کر ایمان ویقین کی بڑی سے بڑی منزل طے کر لیتے تھے[۱] اس وقت امت میں آپ کا مبارک وجود وصول الی اللہ اور قرب وولایت کا سب سے طاقتور ذریعہ تھا،

لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت وقانون میں اس پاک زندگی کی بھی ایک حد اور انتہا مقرر تھی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے،

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ[۲] — اور محمدؐ تو بس ایک رسول ہی ہیں ان کے قبل اور بھی رسول گزر چکے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذریعہ اپنے دین کی تکمیل اور اپنے انعامات کو مکمل فرمایا اور یہ آیت نازل ہوئی،

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا[۳] — آج میں نے تمہارے لئے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو بہ طور دین کے پسند کر لیا،

اور آپ ہی پر سلسلۂ نبوت کو ختم فرما دیا، ارشاد ہے،

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ[۴] — محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں البتہ اللہ کے رسول ہیں اور (سب) نبیوں کے ختم پر ہیں۔

---

[۱] اس کا صحیح اندازہ ہمیں کتب سیر و حدیث کے مطالعہ سے ہوگا مثلاً فضالہؓ کے عمرۂ قضا کا واقعہ جس میں وہ طواف کے دوران حضورؐ کو شہید کرنے کے ارادہ سے آئے تھے، اسی طرح عمرو بن العاصؓ کے وہ کلمات جو انھوں نے اپنے انتقال کے وقت فرمائے، نیز عکرمہ بن جہل کی قوت ایمانی اور جوش اسلامی کا واقعہ،،

[۲] سورہ آل عمران - ۱۴۴ [۳] سورۂ مائدہ - ۳ [۴] سورۂ احزاب (۴۰)

آپ کے بعد اس زمین کا آسمان سے وہ رشتہ ختم ہوگیا جو نئی وحی اور نئی رسالت کے لیئے قائم ہوا تھا، ختم نبوت اور وحی و رسالت کے انقطاع اور حضورؐ کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد اس کی ضرورت تھی کہ اس خلا کو پُر کیا جائے جس کے ذریعہ مخلوق و خالق کے درمیان براہِ راست اور مضبوط تعلق قائم ہوتا تھا، ان کے قلوب سے ایمان و حکمت اور روحانی قوت کے چشمے پھوٹتے تھے اور دیکھتے دیکھتے وہ ایمان و یقین اور قرب و ولایت کی آخری اور بلند ترین سطح تک پہونچ جاتے تھے،

اس خلا کو پُر کرنے اور اس کام میں حضورؐ کی نیابت و خلافت کیلئے امت کو دو چیزیں دی گئیں، ایک یہ ابدی کتاب (قرآن مجید) جس کا حرف حرف زندگی و قوت سے لبریز ہے جس سے تازگی کبھی زائل نہیں ہوتی، اور جس کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہوتے، دوسری چیز نماز جو قرآن ہی کی طرح زندگی و قوت سے بھرپور ہے اور اس کو وصول الی اللہ، تعلق مع اللہ اور تقرب و ولایت کے حصول میں جو کمال درجہ تاثیر اور غایت درجہ اہمیت حاصل ہے وہ پورے نظام شریعت میں کسی اور چیز میں نہیں، ان دونوں چیزوں کے ذریعہ اس امت کے محققین و مجاہدین ہر نسل اور ہر دور میں ایمان و یقین، علم و معرفت، روحانیت و للّٰہیت اور قرب و ولایت کے ان درجات تک پہونچ گئے جہاں اہلِ ذہانت کی دقیقہ رسی اور حکماء و عقلاء کا تصور و خیال بھی نہیں پہونچ سکتا، ان کی اتنی بڑی تعداد ہے جو شمار و قطار اور حساب و کتاب سے ماوراء ہے اور ان کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا، یہ دونوں چیزیں امت کی تمام نسلوں کے حق میں ایک ایسا "آب حیات" ہیں جس کے ذریعہ زندگی و حرکت، تازگی و نشاط اور سچی و طاقتور روحانیت ہمیشہ ابرِ رحمت کی طرح برستی ہے اور اس نے ان کو کسی نئی نبوت اور نئی بعثت سے ہمیشہ کیلئے بے نیاز کر دیا ہے، اس کی بدولت ہر دور اور تاریخ کے ہر دور میں ان کا خدا سے

وہی ربط و تعلق قائم رہا اور ان کی قلبی طاقت اور روحانی قوت کی وہ غذا برابر ملتی رہی اور اس کے ذریعہ انھوں نے اپنی معاصر دنیا کی ہدایت و رہنمائی کا فریضہ پوری اہلیت و سچائی کے ساتھ انجام دیا، اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے،

وَجَاهِدُوا فِي اللهِ حَقَّ جِهَادِهِ ط هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ، مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ ط هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِنْ قَبْلُ وَفِي هٰذَا لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ فَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوا بِاللهِ هُوَ مَوْلَاكُمْ، فَنِعْمَ الْمَوْلَىٰ وَنِعْمَ النَّصِيرُ [1]o۔

اور اللہ (کے کام) میں کوشش کرتے رہو جو اس کی کوشش کا حق ہے، اس نے تمہیں برگزیدہ کیا اور اس نے تم پر دین کے بارہ میں کوئی تنگی نہیں کی، تم اپنے باپ ابراہیم کی ملت (پر قائم رہو) اس نے تمہیں مسلم قرار دیا ہے پہلے بھی اور اس (قرآن) میں بھی تاکہ رسول تمہارے اوپر گواہ ہوں اور تم (سب) لوگوں کے مقابلہ میں گواہ ٹہرو، سو تم لوگ نماز کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ ہی کو مضبوط پکڑے رہو وہی تمہارا کارساز ہے سو کیسا اچھا کارساز ہے اور کیسا اچھا مددگار،

نماز کی ظاہری و باطنی دونوں حیثیتیں اور شکلیں مطلوب ہیں

نماز نبوت کی میراث ہے جس کو اپنے تمام اشکال و آداب اور احکام و تفصیلات کے ساتھ بحفاظت ایک نسل سے دوسری نسل اور ایک عہد

---

[1] سورہ حج ۔ ۷۸

سے دوسرے عہد تک منتقل ہوتے رہنا چاہئے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ عمل امت کی تاریخ میں برابر جاری رہا، محدثین وفقہاء نے اس کی احادیث کی تخریج، احکام کے استنباط اور فرض وواجب مندوب ومستحب، سنت ونفل اور جائز وناجائز کی تفصیلات مرتب کرنے میں نہایت دقت نظر اور باریک بینی سے کام لیا اور اس کا کوئی پہلو تشنہ نہ چھوڑا،

لیکن جس طرح نماز کے آداب واشکال ہم حفاظت کے ساتھ آئندہ نسلوں تک منتقل کرنے کے ذمہ دار ہیں اسی طرح ہمارے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اس کی روح اور حقیقت، خشوع وانابت اور رقت وسوز بھی اپنی آئندہ نسلوں تک بحفاظت اور اسی اہتمام کیساتھ منتقل کرتے رہیں، اس لئے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نماز ظاہری شکل وصورت اور اس کی روح وحقیقت اور خشوع ورقت دونوں کی جامع تھی، آپ سے "احسان" کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا۔

أن تعبد الله كأنك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك[1]	کہ اللہ تعالےٰ کی عبادت اس طرح کرو جیسا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو اور اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نماز اس احسان کا مکمل اور اعلیٰ نمونہ تھی، مطرفؒ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا، آپ کے سینۂ پاک سے گریہ کی وجہ سے ایسی آواز نکل رہی تھی جیسے چکی چل رہی ہو۔"[2]

خلفاء راشدین، صحابہ کرام، تابعین عظام اور ان کے بعد جتنے مخلصین اولیاء اللہ

---

[1] صحیحین [2] ابو داؤد

اور اہلِ قلوب تھے ان کی نماز پر اسی نبوی نماز کا پرتو تھا اور ان کے آئینہ نے اس کے عکس کو ہو بہو اتار لیا تھا، تاریخ اور طبقات و تراجم کی کتابوں میں ان نمازوں کے حسن و طول، اور رقت و خشوع کا ذکر بار بار آتا ہے، حدیث ہجرت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے فرماتی ہیں کہ "ابوبکر رضی اللہ عنہ بہت رقیق القلب تھے جب بھی قرآن پڑھا جاتا ان کو اپنے آنسوؤں پر قابو پانا مشکل ہو جاتا"[1] اور جب حضورؐ نے شدت مرض میں یہ حکم دیا کہ ابوبکر نماز پڑھائیں اور یہ فرمایا کہ "مروا ابا بکر فلیصل بالناس" (ابوبکر کو حکم دو کہ نماز پڑھائیں) تو حضرت عائشہؓ نے کہا کہ "ابوبکر بہت رقیق القلب ہیں اور جب تلاوت کرتے ہیں تو ان پر گریہ طاری ہو جاتا ہے"[2]۔

حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ رات کو اپنی عبادت کے دوران کبھی کبھی (انذار و وعید کی) کسی آیت سے گزرتے تو رونے لگتے یہاں تک کہ شدت اثر سے گر پڑتے اور بیمار پڑ جاتے اور اس بیماری کی وجہ سے لوگ ان کی عیادت کو آتے، ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ "حضرت عمرؓ پر ایک مرتبہ صبح کی نماز میں اس قدر گریہ طاری ہوا کہ میں نے تیسری صف کے بعد ان کے گریہ کی آواز سنی"، علقمہ بن وقاصؓ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ عشا کی نماز میں سورۂ یوسف پڑھ رہے تھے اور میں آخری صف میں تھا جب یوسف علیہ السلام کا ذکر آیا تو میں نے ان کے رونے کی آواز سنی[3]، عبداللہ بن شداد سے روایت ہے کہ "میں نے

---

[1] بخاری ج ۱ (باب ہجرۃ النبی صلے اللہ علیہ وسلم و اصحابہ الی المدینۃ المنورہ)

[2] صحیح بخاری (باب اہل العلم والفضل احق بالامامۃ) تاریخ عمر ابن الخطابؓ، ابن الجوزی۔

[3] بخاری۔

حضرت عمرؓ کا گریہ آخری صفت میں سنا، وہ یہ آیت پڑھ رہے تھے "اِنَّمَا اَشْکُوْا بَثِّیْ وَ حُزْنِیْ اِلَی اللّٰہِ"[1]،

مصلحین امت، ماہرین تعلیم و تربیت اور دینی تحریکات کے علمبرداروں کا فرض

اس امت اور خاص طور پر اس کے علماء اور اہل اصلاح کا فرض ہے کہ وہ اس میراث اور اس قیمتی دولت کو ہاتھ سے نہ جانے دیں اور تغیر و انقلاب اور مادیت کے تیز و تند تھپیڑوں کے باوجود اس روشنی کو کسی قیمت پر نہ بجھنے دیں، اس لئے کہ اس خسارہ کی تلافی، احکام فقہ کے بڑے سے بڑے ذخیرہ، اسرار شریعت کے علم، سحر بیانی اور زور قلم، کسی چیز سے نہیں ہو سکتی، تجدید و احیاء اور اصلاح و انقلاب کی کوشش اور تحریک اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب امت کے عوام اور علماء میں عشق و محبت اور ایمان و یقین کی اس چنگاری کو دوبارہ بھڑکایا جائے اور دعوت و تربیت، جہاد و مجاہدہ اور اس حقیقی پرسوز اور خشوع و خضوع والی نماز کی کچھ جھلکیاں امت میں پھر پیدا ہوں جو قرون اولے کے مسلمانوں کی سب سے بڑی خصوصیت اور طاقت تھی، اور جس نے ان کو دشمن کے سامنے بہادری کے ساتھ ثابت قدم رہنے سے پہلے اپنے رب کے سامنے ادب و محبت اور امید و خوف کے ساتھ کھڑا رہنا سکھا دیا تھا، امام دار الہجرت مالک بن انسؒ نے بالکل صحیح فرمایا ہے۔

لن یصلح اٰخر ھذہ الامۃ الا ما أصلح أولھا۔

اس امت کے آخری حصہ کو وہی چیز درست کر سکتی ہے جس نے اس کے پہلے حصہ کو درست کیا تھا۔

---

[1] بخاری۔

اللہ تعالےٰ کا رشاد ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلٰوتِهِمْ خَاشِعُوْنَ[۱]۔

یقیناً (وہ) مومنین فلاح پاگئے جو اپنی نمازیں خشوع رکھنے والے ہیں۔

---

[۱] سورہ المومنون ۔ ۱-۲

زکوٰۃ

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَاِخْوَانُکُمْ فِی الدِّیْنِ ط

(لیکن اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز کے پابند ہو جائیں اور زکوٰۃ دینے لگیں تو وہ تمہارے بھائی ہو جائیں گے دین میں)

سورہ توبہ - ۱۱

زکوٰۃ

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَاِخْوَانُکُمْ فِی الدِّیْنِ[1]

(لیکن اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز کے پابند ہو جائیں اور زکوٰۃ دینے لگیں تو وہ تمہارے بھائی ہو جائینگے دین میں)

ربّ اور بندہ کا تعلق اور اس تعلق کا تقاضا

رب اور بندہ کے درمیان جو تعلق قائم ہے وہ (جیسا کہ باب اول میں بیان کیا جاچکا ہے) ایسا تعلق ہے جس کیلئے کوئی نظیر، اساس یا پیمانہ ہمارے ان تعلقات میں موجود نہیں جن سے ہم آشنا ہیں، ہم زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک رحیم و کریم اور منعم و فیاض مالک، اور فقیر و ذلیل و مفلس و محتاج اور عاجز و درماندہ انسان کا تعلق ہے، اور اس رب کریم کی صفات کمال، افعالِ قدرت، ربوبیت تامہ اور اس کی محبت و رافت اور لطف بے نہایت کا یہ ادنیٰ تقاضا ہے کہ بندہ دل و جان سے اس پر قربان ہو جائے اور نہ صرف مال و زر بلکہ روح و دل ہر چیز اس پر بصد شوق نثار کرنے کیلئے تیار رہے،

مظاہر ربوبیت اور لطف و عنایت

اب ہمیں اس کی ربوبیت عامہ، رحمت و ہدایت، لطف و عنایت، اور کرم و بخشائش کے مظاہر پر

[1] سورہ التوبۃ ۔ ۱۱

غور کرنا چاہیئے، یہ اللہ تعالےٰ ہی تو ہے جس نے انسان کو یہ متناسب و موزوں لباس وجود عطا کیا اور اس کو زمین کے خزانوں اور ذخیروں، اور اسکے وسیلوں اور سرچشموں سے فائدہ اٹھانے کی طاقت بخشی اور اس غرض سے اس کے اندر نہایت لطیف، نازک اور حکیمانہ و معجزانہ نظام قائم فرمایا، اس کے اندر بحث و جستجو کا ذوق، ان وسائل و ذخائر کے استعمال، ان کی تنظیم، تبادلہ، باہمی تعاون اور لین دین کی صلاحیت پیدا فرمائی،

اللہ تعالےٰ کی یہ صفت ربوبیت و ہدایت کائنات کے تمام انواع و اجناس اور اصناف و موجودات میں جلوہ گر ہے " اَلَّذِیْ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی [۱] (جس نے ہر چیز کو اسکی بناوٹ عطا کی پھر اس کی رہنمائی کی) لیکن انسان کو (جو اس زمین پر اللہ تعالےٰ کا خلیفہ بھی ہے) اس کا سب سے بڑا حصہ ملا ہے اور وہی اس کا سب سے بڑا مظہر اور مرکز تجلی ہے،

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰی كَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا [۲]	اور ہم نے بنی آدم کو عزت دی ہے اور ہم نے انھیں خشکی اور دریا (دونوں) میں سوار کیا اور ہم نے ان کو نفیس چیزیں عطا کیں، اور ہم نے ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر بڑی فضیلت دی ہے۔

اس نے اس کیلئے زمین کو ہموار اور فضا کو سازگار بنایا اور زمین کی مخفی طاقتوں، پوشیدہ خزانوں آبی ذخیروں اور خام معدنیات سے فائدہ اٹھانے کا جذبہ، شوق اور استعداد پیدا کی،

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ [۳] ط	وہ وہی ہے جس نے زمین کو تمہارے لئے مسخر کر دیا سو تم اس کے راستوں پر چلو پھرو اور اللہ کی (دی ہوئی) روزی میں سے کھاؤ (پیو)

اس لئے انسان کیلئے زندگی کی ان ضروری اشیاء کو جو (شہری و دیہاتی، ترقی یافتہ اور پسماندہ) ہر قوم کیلئے

---

[۱] سورہ طٰہٰ ـ ۵۰ [۲] سورہ اسراء ـ ۷ [۳] سورہ ملک ـ ۱۵

زندگی کا آسرا اور غذا کا سرچشمہ ہیں اور جن کے بغیر زندگی کا وجود ناقابل تصور ہے یعنی غلہ پانی اور آگ کو نہ صرف مسخر کیا بلکہ عام وارزاں بنادیا۔

أَفَرَأَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ ۝ أَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ ۝ لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُونَ ۝ إِنَّا لَمُغْرَمُونَ ۝ بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُونَ ۝ أَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ ۝ أَأَنتُمْ أَنزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنزِلُونَ ۝ لَوْ نَشَاءُ جَعَلْنَاهُ أُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُونَ ۝ أَفَرَأَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ ۝ أَأَنتُمْ أَنشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا أَمْ نَحْنُ الْمُنشِئُونَ ۝ نَحْنُ جَعَلْنَاهَا تَذْكِرَةً وَمَتَاعًا لِّلْمُقْوِينَ ۝[51]

اچھا پھر یہ بتاؤ کہ جو کچھ تم بوتے ہو اسے تم اگاتے ہو یا (اسکے) اگانے والے ہم ہیں، اگر ہم چاہیں تو اس (پیداوار) کو چورا چورا کردیں پھر تم حیرت کرنے لگو، (اب کی تو) ہم پر تاوان پڑ گیا۔ بلکہ ہم (بالکل ہی) محروم رہ گئے، اچھا پھر یہ بتاؤ کہ جس پانی کو تم پیتے ہو اس کو بادل سے تم برساتے ہو یا (اس کے) برسانے والے ہم ہیں؟ اگر ہم چاہیں اس کو کڑوا کر ڈالیں، تو تم شکر کیوں نہیں کرتے، اچھا پھر یہ بتلاؤ کہ جس آگ کو تم سلگاتے ہو اس کے درخت کو تم نے پیدا کیا ہے یا ہم پیدا کرنے والے ہیں؟ ہم نے اس کو یاددہانی کی چیز اور مسافروں کے نفع کی چیز بنایا ہے۔

فطرت انسانی کا خاصہ اور زندگی و تمدن پر اس کا اثر

اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر جمادات و حیوانات کے برعکس ذوق جمال، حسن و نفاست، قوت نمو اور تنوع و ترقی کا ایک ایسا جذبہ رکھا ہے جس کے دم سے زندگی کی یہ رونق قائم اور اس کا خون رواں اور گرم ہے، اور اس دنیا کی ساری تعمیر و ترقی، تنوع و جدت پسندی اور ایجادات وانکشافات دراصل اسی جذبہ کے مرہون منت ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے،

---

[51] سورہ واقعہ۔ ۶۳ تا ۷۳

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۭ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ۝ اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰي بَعْضٍ ۭ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ۝[۱]

ہم ہر ایک کو بڑھ بڑھ کر دیتے ہیں ان میں سے بھی اور ان میں سے بھی آپ کے پروردگار کی بخشش میں سے، اور آپ کے پروردگار کی بخشش (کسی پر) بند نہیں، تو دیکھ ہم نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر کیسی فضیلت دے رکھی ہے اور آخرت یقیناً بہت بڑی ہے درجات کے اعتبار سے بھی اور بہت بڑی ہے فضیلت کے اعتبار سے بھی

اس نے اس کے اندر ایک دوسرے سے تعاون کرنے، حقوق کا خیال رکھنے، ملک کے امن وسلامتی کو برقرار رکھنے، اکل حلال اور مشترکہ منافع کے حصول کیلئے مہم جوئی وخطر پسندی کا جذبہ اور شوق پیدا کیا، انسانیت کا کوئی طبقہ اور تاریخ کا کوئی دور ایسا نہیں جو اس جذبہ سے خالی اور اس صلاحیت سے محروم رہا ہو،

لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ ۝ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَاۗءِ وَالصَّيْفِ ۝ فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۝ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ڏ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۝[۲]

قریش کو خوگر ہونے کی بنا پر، اپنے جاڑے اور گرمی کے سفر کے خوگر ہونے کی بنا پر چاہیے تھا کہ اس خانہ (کعبہ) کے مالک کی عبادت کریں۔ جس نے ان کو بھوک میں کھانے کو دیا، اور انھیں خوف سے امن دیا۔

کوئی چیز انسان کی حقیقی ملک نہیں

ان مسلمہ حقائق اور فطری صورت حال کا (جس میں انسان کا عجز وافلاس اور اس کا ضعف وبے حقیقتی اپنی آخری شکل میں کھل کر ظاہر ہو رہی ہے اور جس میں خدا کی ربوبیت کاملہ بھی پوری طرح جلوہ گر ہے) نیز عقل، منطق اور ذوق سلیم کا طبعی تقاضا یہ ہے کہ اس کے بعد کوئی چیز انسان کی ملک نہ سمجھی جائے، کوئی چیز اس کی طرف

---

[۱] سورۂ اسراء - ۲۰، ۲۱ [۲] سورہ قریش - ۱ تا ۴

منسوب نہ کی جائے، اور مختصر الفاظ میں اس سے وہ معاملہ کیا جائے جو اس شیرخوار اور چھوٹے بچہ سے کیا جاتا ہے جو اپنے والدین کی گود میں پلتا اور ان کی انگلی پکڑ کر چلتا ہے، بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ انسان اس عظیم کائنات میں اور اس بلند و برتر اور قادر مطلق پروردگار کے سامنے اس بچہ سے بھی زیادہ کمزور و ناتواں اور بے حقیقت ہے جو اپنے والدین کے سایۂ عاطفت میں پلتا بڑھتا اور ان کے قدموں میں گھسٹ گھسٹ کر چلتا ہے، خدا کی شان تو اس مجازی مربی و مالک سے کہیں بلند و برتر ہے،

وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ	اور آسمانوں اور زمین میں اسی کی شان (سب سے)
وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝[۱]	اعلیٰ ہے، اور وہ زبردست ہے حکمت والا ہے۔

اس لئے وہ تمام اشیاء جو انسان کی ملکیت سمجھی جاتی ہیں یا جن املاک کو اس نے اپنے جہل و ناواقفیت کی بنا پر خود اپنی طرف منسوب کرلیا ہے، ان سب کی اضافت صرف اسی کی طرف کرنی چاہیئے جو ان کا پیدا کرنے والا ہے اور جس نے انسان کو ان چیزوں پر اختیار صرف محدود مقاصد کیلئے محدود وقت تک اور محدود طریقہ پر بخشا ہے۔

اسلام کے اقتصادی نظام کا بنیادی تخیل، ہر چیز خدا کی ملکیت ہے

اس حقیقت کے پیش نظر (جو سارے حقائق پر محیط اور دنیا کے تمام دینی، اخلاقی اور معاشی نظاموں میں جاری و ساری ہے) قرآن مجید نے تمام انسانی معاملات کو اللہ تعالےٰ کے حوالہ کردیا ہے، اور انسان کو صرف ایک چیز کا ذمہ دار بنایا ہے اور وہ چیز ہے منصب خلافت،

وہ مسلمانوں سے کبھی اس انداز سے مخاطب ہوتا ہے،

وَآتُوْهُمْ مِنْ مَالِ اللّٰهِ الَّذِىْ آتَاكُمْ ۚ[۲]	اور اللہ کے اس مال میں سے بھی انھیں دو جو اس نے

---

[۱] سورہ روم۔ ۲۷ [۲] سورہ نور۔ ۳۳

. . . . تمہیں عطا کیا ہے۔

کبھی اس طرح:۔

وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ [۱] اور جس مال میں سے اس نے تم کو دوسروں کا جانشین بنایا ہے اس میں سے خرچ کرو۔

آیت بالا میں اس کا اعلان صاف طریقہ پر موجود ہے کہ ان تمام اشیاء کا حقیقی مالک اور حقیقی وارث اللہ تعالےٰ ہے، اس لئے انسان اگر چند پیسے اس کی راہ میں خرچ کر دیتا ہے تو اس کو اس پر فخر و ناز کا کوئی حق نہیں،

وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ [۲] تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ہو درانحالیکہ آسمان اور زمین سب آخر میں اللہ ہی کے رہ جائیں گے۔

اس صورت حال کا تقاضا بلکہ قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ انسان اپنی ہر ملکیت سے دستبردار ہو جائے اور اس کو اپنی زمین و جائداد میں ادنیٰ تصرف کا حق باقی نہ رہے اور وہ بالکل مقید پابند اور معطل ہو جائے،

انسان کی طرف مال کی اضافت کا راز اور اسکے مصالح

لیکن اللہ تعالےٰ کی رحمت و حکمت نے انسان کے ساتھ یہ معاملہ نہیں کیا اور ان اموال و املاک اور انسانی جد و جہد کے ثمرات و نتائج کو صرف خدا کی طرف منسوب کر کے انسان کو اس سے محروم نہیں کیا، اگر ایسا ہوتا تو اس میں تعجب یا چون و چرا کی کوئی بات نہ تھی، لیکن اس سے انسان خود اعتمادی، ولولۂ کار، قوت نمو، جذبۂ مسابقت، ذوق جستجو، اور مختصر الفاظ میں زندگی کے اس کیف اور سرور سے محروم ہو جاتا جو اپنی کوشش کے نتائج اور اپنی محنت کا ثمرہ دیکھ کر اس کو حاصل ہوتا ہے، یہ وہ فطری لذت ہے جو بچوں کو اپنے گھر اور اپنے والدین کی چیزوں کو اپنی طرف منسوب

---

[۱] سورہ حدید - ۷ [۲] سورہ حدید - ۱۰

کرنے سے حاصل ہوتی ہے، اگر انسان اس جذبہ سے محروم ہو جائے تو وہ اخلاص و محبت، خیر خواہی ان اموال و املاک کی حفاظت اور ان کو ترقی دینے کی فکر و امنگ سے محروم ہو جائے گا، زندگی اپنی ساری سرگرمی و جوش عمل، کشمکش اور جذبہ مسابقت اور وہ حوصلہ اور ولولہ کھو دے گی جو انسان کی بقا و ترقی کیلئے ناگزیر ہے، دنیا ایک بڑا کارخانہ بن جائے گی جس میں انسان مشین کے گونگے بہرے کل پرزوں کی طرح متحرک ہوں گے نہ انکے پاس دل ہوگا نہ ضمیر، نہ آسودگی نہ لذت،

اسی لئے اللہ تعالٰے نے قرآن مجید میں مال کا انتساب بار بار انسان کی طرف کیا ہے، اس کے خالق و رازق کی طرف نہیں،

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ[1]

اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طور پر مت کھاؤ اڑاؤ اور نہ اسے حکام تک پہنچاؤ کہ جس سے لوگوں کے مال کا ایک حصہ تم گناہ سے کھا جاؤ درانحالیکہ تم جان رہے ہو۔

. . . .

الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُونَ مَا أَنْفَقُوا مَنًّا وَلَا أَذًى، لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ، وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ[2] . . . . . .

جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں اور جو کچھ خرچ کر چکے ہیں اس کے عقب میں احسان و اذیت سے کام نہیں لیتے ان کیلئے اس کا اجر ان کے پروردگار کے پاس ہے اور ان پر نہ کوئی خوف (واقع) ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

. . . .

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ[3]

اے ایمان والو جو تم نے کمایا ہے اس میں سے عمدہ چیزیں خرچ کرو اور اس میں سے (بھی) جو ہم نے تمہارے

---

[1] سورۃ البقرہ ۱۸۸ [2] سورۃ البقرہ ۲۶۲ [3] سورۃ البقرہ ۲۶۷

. . . . لئے زمین سے نکالی ہیں۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا[۱] — اور کم عقلوں کو اپنا مال نہ دے دو جس کو اللہ نے تمہارے لئے مایۂ زندگی بنایا ہے،

وَإِنْ تُؤْمِنُوا وَتَتَّقُوا يُؤْتِكُمْ أُجُورَكُمْ وَلَا يَسْأَلْكُمْ أَمْوَالَكُمْ[۲] — اور اگر تم ایمان لاؤ اور تقویٰ اختیار کرو تو (اللہ) تم کو تمہارے اجر عطا کرے گا اور تم سے تمہارے مال طلب نہیں کرے گا،

غرض قرآن مجید میں اس طرح کی بکثرت آیات موجود ہیں جن میں نہ صرف مال کی اضافت انسان کی طرف کی گئی ہے بلکہ اللہ تعالےٰ نے اس کو اور وسعت دے کر قرض حسنہ قرار دے دیا ہے، اللہ تعالےٰ کے راستہ میں اور اس کے بندوں کی بھلائی کیلئے انسان جو کچھ بھی خرچ کرتا ہے اسکے نزدیک وہ قرض حسن ہے، ارشاد ہے،

مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَاعِفَهُ لَهُ أَضْعَافًا كَثِيرَةً[۳]، — کون ایسا ہے جو اللہ کو اچھا قرضہ قرض دے، پھر اللہ اسے بڑھا کر اس کے لئے کئی گنا کر دے،

دوسری جگہ ارشاد ہے،

إِنْ تُقْرِضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا يُضَاعِفْهُ لَكُمْ[۴]۔ — اگر تم اللہ کو اچھی طرح قرض دو گے تو وہ اس کو تمہارے لئے بڑھاتا چلا جائے گا،

ایک اور جگہ ارشاد ہے،

وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَأَقْرِضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا[۵] — اور نماز کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو، اور اللہ کو اچھی طرح قرض دو،

---

۱ سورہ نساء ۔ ۵ ۲ سورہ محمد (علیہ الصلوٰۃ والسلام)۔ ۳۶ ۳ سورۃ البقرہ ۔ ۲۴۵ ۴ سورۃ التغابن ۔ ۱۷ ۵ سورۃ المزمل

خلافت و امانت کا تصور

یہ حقیقت کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی ملک مطلق ہے اور وہ اس کائنات کے تمام موجودات کا مالک حقیقی ہے، قرن اول کے مسلمانوں کے رگ و ریشہ میں اس طرح سرایت کر چکی تھی کہ وہ اپنے کو اس مال و دولت کا صرف امین سمجھتے تھے اور اپنی رائے سے اس میں کوئی تصرف نہ کرتے تھے، ان کے مال کے استعمال میں نہ ریاکاری شامل ہوتی تھی نہ فخر، نہ تکبر، نہ ناز،

قرآن مجید نے امانت و خلافت کے تصور کو ان کے دل و دماغ میں مختلف طریقوں سے اچھی طرح راسخ کر دیا تھا اور ان کو یہ یاد کرا دیا تھا کہ اگرچہ یہ مال انھوں نے اپنے زور بازو سے اور خون پسینہ ایک کر کے جمع کیا ہے، تاہم اسلام کے عہدنامہ کی رُو سے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے تمام حقوق اور دعووں سے دستبردار ہونے کے لحاظ سے وہ دوبارہ خدا کی ملکیت میں آ گیا ہے، اور یہی وہ چیز ہے جس کا اقرار انسان اسلام میں داخل ہوتے وقت اور کلمۂ شہادت پڑھتے وقت کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کو اس کا پورا حق حاصل ہے کہ اپنی مستعار دی ہوئی اور ودیعت کی ہوئی چیز جب چاہے واپس لے لے، یہ اس کی خریدی ہوئی چیز ہے، جس کو وہ ہر وقت حاصل کر سکتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے،

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ [۵۱]	بلاشبہ اللہ نے مومنین سے خرید لیا ہے ان کی جانوں اور ان کے مالوں کو اس کے عوض میں کہ انھیں جنت ملے گی۔

وہ ان لوگوں کو بُرے انجام سے ڈراتا اور تنبیہ کرتا ہے جو مال کی محبت میں پوری طرح گرفتار ہو چکے ہیں، اور جہاد فی سبیل اللہ اور ادائیگی فرض کے مقابلہ میں ان کو اپنی راحت اور اپنی خواہشات زیادہ عزیز ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کو اپنے مال و دولت اور املاک و جائدادیں ہر طرح کا

---

[۵۱] سورہ التوبہ — ۱۱۱

تصرف کرنے اس کو بچا بچا کر رکھنے اور اس کی حفاظت کا پورا حق حاصل ہے، ارشاد ہوتا ہے،

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِىْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِىَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۗ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ؀[۱]

آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے لڑکے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے کنبہ اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس کے بگڑ جانے سے تم ڈر رہے ہو اور وہ گھر جنھیں تم پسند کرتے ہو (یہ سب) تم کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ عزیز ہوں تو منتظر رہو، یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم بھیج دے، اور اللہ نافرمان لوگوں کو مقصود تک نہیں پہنچاتا،

وہ مسلمانوں کو اس بات سے آگاہ اور خبردار کرتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کے راستہ میں سخاوت و عالی ہمتی کے ساتھ خرچ کرنے سے پرہیز اس کے لئے جان و مال کی قربانی سے دریغ اور اس کے دین کی نصرت و حمایت سے (جس کے ساتھ ان کی زندگی و بقا وابستہ ہے) کنارہ کشی اپنے کو ہلاکت میں ڈالنے کے مرادف اور آج کل کی تعبیر میں "خودکشی" کے ہم معنی ہے،

وَاَنْفِقُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۚ وَاَحْسِنُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ؀[۲]

اور اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہو اور اپنے کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو اور اچھے کام کرتے رہو یقیناً اللہ اچھے کام کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

---

[۱] سورہ توبہ - ۲۴ [۲] سورہ بقرہ - ۱۹۵

امانت وخلافت کا تصور اولین مسلمانوں میں کیا تھا؟

صحابہ کرام کا اپنے مال و متاع، زمین وجائداد، کھیتی باڑی اور تجارت وکاروبار کے ساتھ بالکل یہی معاملہ تھا، انھوں نے ان سب چیزوں کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اختیار میں دیدیا تھا، ہجرت سے قبل مکہ معظمہ میں انھوں نے یہی کردار ادا کیا، حضرت ابوبکر صدیقؓ، عثمان بن عفانؓ، عبدالرحمٰن بن عوفؓ، صہیب رومیؓ اور ابوسلمہ رضی اللہ عنہم اور دوسرے بڑے بڑے مہاجرین واغنیاء صحابہ نے ہمیشہ اسی طرز عمل کا نمونہ پیش کیا، جس کا مطالبہ قرآن مجید میں کیا گیا ہے، مدینہ طیبہ میں انصار کا طرزِ عمل اور رویہ بھی اسی کے مطابق تھا،

جنگ بدر سے قبل حضرت سعد بن معاذؓ نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے جو گفتگو فرمائی تھی اس میں ہمکو اس تصور کی پوری عکاسی ملتی ہے حدیث میں آتا ہے،

جب حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو قریش کی پیش قدمی کی خبر پہونچی تو آپ نے اپنے صحابہ سے مشورہ فرمایا، مہاجرین سے آپ نے مشورہ فرمایا تو انھوں نے بہت اچھی بات کی، آپ نے دوبارہ مشورہ کیا تو انھوں نے بہت اچھی گفتگو کی، پھر آپ نے ان سے تیسری بار مشورہ کیا تو انصار نے محسوس کیا کہ شاید حضورؐ کی بات کا رخ انصار کی طرف ہے، اس وقت سعد بن معاذؓ نے بڑھ کر عرض کیا کہ شاید حضور کا روئے سخن ہماری طرف ہے، اور حقیقت یہی تھی، اس لئے کہ انصار نے آپ سے اس پر بیعت کی تھی کہ وہ اپنے گھر رہتے ہوئے آپ کی حمایت و نصرت کا حق ادا کریں گے اور دفاع کا فرض انجام دیں گے، جب آپ نے باہر نکل کر مقابلہ کا ارادہ کیا تو آپ نے سب کا خیال معلوم کرنے کیلئے عمومی مشورہ کیا، اس وقت سعد بن معاذؓ آگے بڑھے اور کہا کہ شاید حضور کو اس کا خیال ہے کہ انصار نے صرف اپنے دیار میں حضور کی نصرت کا وعدہ کیا ہے، میں انصار کی طرف سے بولتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ آپ جہاں چاہیں سفر فرمائیں، جس سے چاہیں رشتہ

جوڑیں، جس سے چاہیں قطع تعلق کرلیں، ہمارے مالوں میں سے جتنا جی چاہے لے لیں اور جتنا چاہیں چھوڑ دیں، جو آپ لے لیں گے وہ ہمیں چھوڑے ہوئے سے زیادہ محبوب اور عزیز ہوگا جو آپ حکم فرمائیں گے ہم اس کو بسر وچشم قبول کریں گے، خدا کی قسم اگر آپ "برک غمدان" تک جانا چاہیں گے تو ہم آپ کے ساتھ چلیں گے اور خدا کی قسم اگر آپ سمندر میں جائیں گے تو ہم بھی آپ کے ساتھ اس میں کود جائیں گے"[۱]

انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب اور مسلمانوں کی فیاضی وگرمجوشی

جب یہ عقیدہ مسلمانوں کے دلوں میں اچھی طرح مستحکم ہوگیا بلکہ ان کے رگ وریشہ میں سرایت کرگیا کہ یہ مال اللہ تعالےٰ کا ہے جو بطور امانت ان کے سپرد کیا گیا ہے تو اس وقت ان سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ بنیادی اور شرعی حقوق کی بجاآوری اور ضروریات زندگی کی تکمیل کے بعد جو کچھ بچے اس کو اللہ تعالےٰ کے راستہ میں خرچ کردیں، اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ[۲]

اور (لوگ) آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں آپ کہہ دیجئے کہ جو ضروریات سے بچ رہے۔

انھوں نے اس مطالبہ کو پوری گرمجوشی وفیاضی اور انشراح صدر کے ساتھ پورا کیا، اسی اقرار کے بعد کہ سب مال اللہ تعالےٰ کا ہے اور وہ صرف اس کے امین، متولی، منتظم اور ٹرسٹی ہیں، ہر قربانی ان پر آسان ہوگئی تھی اور یہ بات یہاں تک بڑھ گئی تھی کہ وہ اپنی ضروریات روک کر اور خود تکلیف اٹھا کر دوسروں پر خرچ کرتے تھے، حضرت ابوطلحہ انصاریؓ کی میزبانی کا واقعہ تاریخ میں مشہور ہے اور حق یہ ہے کہ سخاوت وایثار کی نظیر جو انھوں

---

[۱] زادالمعاد ج ۱۔ ص ۱۳۶-۱۳۷۔

[۲] سورہ بقرہ ۲۱۹، ابن کثیر نے "العفو" کی تفسیر یہ کی ہے کہ جو تمہارے گھر کی ضروریات سے فاضل ہو ابن عمرؓ، مجاہد، عطاء، عکرمہ، سعید بن جبیر، محمد بن کعب، الحسن، قتادہ، القاسم، سالم، عطاء خراسانی، ربیع بن انس سے بھی یہی روایت ہے کہ جو ضروریات سے فاضل ہو، ابن بطال کہتے ہیں کہ جو کفاف (ضرورت بھر کا مال) سے بچے۔ ہم نے ترجمہ میں اسی کو اختیار کیا ہے۔

نے قائم کی وہ انسانی تمدن کی پوری تاریخ میں نہایت نادر و کمیاب ہے، ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک آدمی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ اے رسول اللہ مجھے سخت بھوک اور فاقہ ہے، آپ نے اپنے یہاں دریافت فرمایا وہاں کچھ نہ تھا، پھر آپ نے ارشاد فرمایا کہ کوئی آدمی ہے جو اس شخص کی اس رات میزبانی کرے، یہ سُن کر ایک انصاری (حضرت ابوطلحہؓ) کھڑے ہوئے اور کہنے لگے کہ میں ہوں یا رسول اللہ، اسکے بعد وہ اپنے گھر گئے اور بیوی سے کہا کہ یہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مہمان ہیں جو کچھ ہو ان کو پیش کر دیا جائے، انھوں نے کہا کہ صرف بچوں کا کھانا ہے، انھوں نے کہا کہ جب عشا ہو جائے تو بچوں کو کسی طرح بہلا کر سلا دو اور آکر چراغ بجھا دو، ہم لوگ رات اسی طرح گزار دیں گے، انھوں نے یہی کیا صبح ہوئی تو یہ انصاری رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالٰے کو فلاں اور فلاں کا یہ کام بہت پسند آیا یا یہ فرمایا کہ اللہ تعالٰے کو ہنسی آئی، اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۛ[1]	اور اپنے سے مقدم رکھتے ہیں اگرچہ خود فاقہ میں ہی ہوں۔

زکوٰۃ انفاق و صدقات کے معنی میں

زکوٰۃ کا ذکر مکی سورتوں میں بھی آیا ہے جہاں اس سے مراد قدرتی طور پر مطلق خیرات ہے، اللہ تعالٰے کا ارشاد ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِىْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ	یقیناً (وہ) مومنین فلاح پا گئے جو اپنی نماز میں خشوع رکھنے والے ہیں اور جو لغو (بات) سے برکنار رہنے والے ہیں اور وہ لوگ جو زکوٰۃ پر

---

[1] سورہ حشر۔ ۹، صحیح مسلم میں ہے کہ ان انصاری صاحب کا نام ابوطلحہ تھا۔ ۵۲ تفسیر ابن کثیر

فَاعِلُوْنَ[۱]○　　　　عامل ہیں۔

دوسری جگہ ذکر ہے۔

وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ○ الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ　　　　اور بڑی کمبختی ہے مشرکین کے لئے جو زکوٰۃ نہیں دیتے

وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ[۲]○　　　　اور آخرت کے وہ منکر ہی ہیں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور اسلام کے فضائل و احسانات کے ضمن میں بعض شاہان وقت کے سامنے بھی اس کا ذکر اسی معنی میں کیا گیا ہے چنانچہ جعفر بن ابی طالب نے نجاشی کے دربار میں یہ کہا۔

وَاَمَرَنَا اَنْ نَّعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ لَا نُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا وَّاَمَرَنَا بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ وَالصِّيَامِ[۳]　　　　انھوں نے ہم کو اس کا حکم دیا ہے کہ ہم اللہ تعالےٰ کی عبادت کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ کریں اور انھوں نے ہم کو نماز زکوٰۃ اور روزے کا حکم دیا ہے۔

یہ بعثت نبوی کے پانچ سال بعد کا واقعہ ہے،

زکوٰۃ کے ایک ایسے معین اور مخصوص نظام کی ضرورت جو ہر طبقہ اور ہر عہد کا ساتھ دے سکے

جب اسلامی معاشرہ عقیدہ کی پختگی، اخلاقی تربیت، اطاعت و انقیاد، سخاوت و ایثار اور انفرادی و جماعتی انانیت سے آزادی کی آخری سطح تک پہونچ گیا، سوسائٹی بہت وسیع ہوگئی اور اس میں مختلف اخلاقی و روحانی مراتب اور درجات قائم ہو گئے، انسانوں کے مختلف گروہ اور قسمیں ہوگئیں جن میں مالدار بھی تھے، غریب بھی اور متوسط الحال بھی، ایسے فیاض اور سخی بھی تھے کہ داد و دہش ان کا ذوق اور غذا بلکہ مزاج اور طبیعت ثانیہ بن گئی تھی، بخیل اور جز رس بھی تھے، اور میانہ رو و معتدل بھی، ایک طرف ایسی قوت ایمانی تھی جو بڑے سے بڑا خطرہ مول لے سکتی تھی، بڑی سے بڑی قربانی دے سکتی تھی، مشکل سے مشکل مسئلہ حل کرسکتی تھی، دوسری طرف

---

[۱] المومنون ۱-۴　[۲] سورہ حم السجدہ ۶-۷　[۳] سیرت ابن ہشام۔

اس ضعف ایمانی کے نمونے تھے جو عالم اسلام کے دور دراز گوشوں میں اور عہد آخر کی نسلوں میں دیکھے جا سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی بڑی حکمت و رحمت تھی کہ اسنے ایسے متنوع، مختلف الحال معاشرہ کے لئے ایک ایسا واضح اور معین نصاب مقرر کر دیا جس کی مقدار و تعداد، اصول و شرائط اور علامات و نشانات سب پوری طرح واضح اور مقرر ہیں، یہ نصاب نہ اتنا زیادہ ہے کہ متوسط طبقہ اس کے بار سے پریشان ہو جائے نہ اتنا کم کہ امراء و دولتمند طبقہ اور اہل ہمت و اہل خیر کی نگاہ سے گر جائے،

اللہ تعالیٰ کی یہ بھی بڑی حکمت تھی کہ اس کو کسی کی رائے یا شخصی ہمت و حوصلہ پر نہیں چھوڑا گیا، نہ اسکو ان انسانی جذبات کے حوالہ کیا گیا جن میں مد و جزر اور اتار چڑھاؤ ہر وقت ہوتا رہتا ہے، اس کو قانون سازوں اور علماء یا حکام کے حوالہ بھی نہیں کیا گیا اسلئے کہ ان پر بھی کلی اعتماد ممکن نہیں اور وہ بھی ہوائے نفس سے محفوظ و مامون نہیں، ان سب باتوں کے پیش نظر زکوٰۃ اپنے نصاب و مقدار کے ساتھ فرض کی گئی ہے[1]

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب زکوٰۃ کے نصاب کی حکمت اور اس کے تعین کی مصلحت و افادیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"پھر اس کی ضرورت ہوئی کہ زکوٰۃ کی مقدار مقرر کر دی جائے اس لئے کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو

---

[1] ہمارے نزدیک ترجیح اس کو ہے کہ زکوٰۃ ہجرت کے بعد فرض ہوئی اور یہ بات ہجرت کے پانچویں سال سے قبل پیش آئی اور اس کا ایک فریضہ اور اسلام کے ایک رکن کی حیثیت سے ذکر، آیا، ضمام بن ثعلبہ اور وفد عبد القیس کی حدیث (جس کی حاضری پانچویں سال ہوئی) اور ہرقل، اور ابوسفیانؓ کے مکالمہ سے (جو ساتویں سال کے آغاز میں ہوا) یہ بات عیاں ہے، احمد، ابن خزیمہ، نسائی، ابن ماجہ اور حاکم سے قیس بن عبادہ نے جو حدیث روایت کی ہے اس سے اسکی مزید تصدیق ہوتی ہے کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہم کو صدقہ فطر کا حکم دیا قبل اسکے کہ زکوٰۃ کا حکم آئے پھر زکوٰۃ فرض کی گئی اور آپ نے ہمیں اس سے (صدقہ فطر) سے نہ منع فرمایا نہ حکم دیا لیکن ہم اسکی پابندی کرتے رہے، اس حدیث کی سند صحیح ہے، صدقہ فطر کا رمضان سے تعلق ہے جو ہجرت کے دوسرے سال فرض ہوا، آیت اس فریضہ پر دلالت کرتی ہے اور وہ بلا اختلاف رائے مدنی آیت ہے،

اس میں بہت افراط و تفریط اور حدود سے تجاوز کا خطرہ ہے، یہ نہ اتنی کم ہونی چاہیئے کہ ان پر اس کا کوئی اثر ہی محسوس نہ ہو اور ان کے بخل کا کوئی علاج ہی نہ ہوسکے، نہ اتنی زیادہ ہونی چاہیئے کہ اس کا ادا کرنا مشکل ہو جائے، اسی طرح زکوٰۃ کی مدت کا بھی معاملہ ہے، نہ یہ مدت اتنی مختصر مناسب تھی کہ بار بار زکوٰۃ ادا کرنے کی نوبت آتی نہ اتنی طویل کہ بخیلوں کو پوری چھوٹ مل جاتی اور محتاجوں اور ضرورتمندوں کا کوئی بھلا ہی نہ ہوسکتا، مناسب یہی تھا کہ اس کا ایک ایسا قانون بنا دیا جاتا جس طرح عام طور پر بادشاہ اپنی رعایا کیلئے ٹیکس کی حد مقرر کر دیتے ہیں اس لئے کہ عرب و عجم سب اسکے عادی ہیں اور اس کو ایک ناگزیر چیز سمجھتے ہیں اور ان کے احساس کو اس سے کوئی تکلیف نہیں پہونچتی، خاص طور پر مسلمان جو کلفت کے بجائے الفت کا عادی اور خوگر ہے اس حکم کی تابعداری میں سب سے پیش پیش ہوگا[1]

زکوٰۃ کس چیز پر واجب ہے اور اسکے مقدار کے تعین میں کیا حکمت ہے

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ کی مقدار بھی متعین فرما دی ہے، اور ان چیزوں کی نشان دہی بھی کر دی ہے جن پر زکوٰۃ فرض ہے، آپ نے یہ بھی بتا دیا کہ زکوٰۃ کب واجب ہوگی، آپ نے ان چیزوں کی چار قسمیں کی ہیں، اور یہ چاروں ایسی ہیں جن سے تقریباً ہم سب کو واسطہ پڑتا ہے، پہلی قسم کاشت اور باغات، دوسری قسم مویشی (اونٹ گائے بکری وغیرہ) اور تیسری قسم وہ ہے جس پر مالیات کا سارا انظام قائم ہے یعنی سونا، چاندی، چوتھی تجارت کا مال، اپنی تمام قسموں اور شعبوں کے ساتھ،[2]

"زکوٰۃ سال میں ایک بار فرض ہے، البتہ باغات و کاشت کا سال اس وقت پورا سمجھا جائے گا جب یہ باغات اور کھیتیاں پک جائیں اور اپنے کمال کو پہونچ جائیں، اور حقیقت یہ ہے کہ اس سے زیادہ انصاف

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ صـ ۳ [2] ماخوذ از زاد المعاد ج ۱ صـ ۱۴۵ باختصار

ممکن ہی نہیں تھا، اگر زکوٰۃ ہر ہفتہ یا ہر مہینہ ادا کرنی پڑتی تو یہ دولت مند لوگوں کیلئے بہت نقصان دہ ہوسکتی تھی، اور اگر عمر میں ایک بار فرض ہوتی تو غربا اور مساکین کے حق میں مضرت رساں تھی، اس لحاظ سے اس سے زیادہ موزوں اور معتدل حکم کوئی اور نہیں ہوسکتا تھا کہ اس کو ہر سال ادا کیا جائے، زکوٰۃ کی مقدار کا تعین مالکین نصاب کی محنت وجدوجہد اور ان کی سہولت ومشقت کو سامنے رکھ کر کیا گیا ہے، چنانچہ جو مال، و دولت آدمی کو اچانک اور یکمشت دستیاب ہوجائے (مثلاً کان، کوئی معدنی ذخیرہ یا خزانہ) تو اس میں سال گزرنے کا انتظار نہ کیا جائے گا اور جس وقت وہ اس کو حاصل ہوگا اسی وقت اس کا "خمس" (پانچواں حصہ) اس پر واجب ہوجائے گا، البتہ جس کی تحصیل میں خود اس کی محنت اور سعی کو دخل ہوا اور اس نے اس کیلئے محنت ومشقت برداشت کی ہو تو اس پر عشر واجب ہوگا مثلاً کاشت وباغات وغیرہ، اس سے مراد وہ کاشت ہے جس کو بونے جوتنے کا کام تو وہ خود کرتا ہے لیکن نہ اس کی سینچائی اس کو کرنا پڑتی ہے نہ اس کیلئے کنواں کھودنا اور رہٹ لگانا پڑتا ہے، بلکہ اللہ تعالےٰ بارش کے پانی سے اس کی سینچائی فرمادیتے ہیں، ہاں اگر کوئی شخص ڈول کے ذریعہ یا کسی اور طریقہ سے اس کی سینچائی کرتا ہے تو بیسواں حصہ اس پر واجب ہوگا، اگر کوئی۔۔۔ ایسا کام ہو جس کے اضافہ کا انحصار مالک کی محنت پر ہو اس کا انتظام، نگرانی اور حفاظت اس کے ذمہ ہو تو اس پر اسکا بھی نصف یعنی چالیسواں حصہ واجب ہوگا، اس لئے کہ اس میں اس کو کھیتی باڑی سے زیادہ مصروف رہنا پڑتا ہے اور ہر وقت نگرانی کرنی ہوتی ہے، کھیتی باڑی اور باغات وغیرہ میں تجارت سے کم دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے اور اس میں اتنا وقت بھی صرف نہیں ہوتا جتنا کسی دُکان یا کارخانہ اور کمپنی میں ہوتا ہے، اسی طرح بارش سے جو کھیتی پیدا ہوتی ہے وہ سینچائی والی کھیتی سے زیادہ اچھی اور آسان ہوتی ہے، اسی طرح کسی خزانہ کی دریافت ان تمام چیزوں سے زیادہ آسان ہے اور اس میں کچھ بھی کرنا نہیں پڑتا، چنانچہ نقدی کیلئے دوسو درہم (اور سونے کیلئے) بیس مثقال[۱]

---

[۱] رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایک مثقال ایک دینار کے مساوی تھا اور ایک دینار دس درہم کے برابر، اس لحاظ سے بیس مثقال (یا بیس دینار) دوسو درہم کے برابر ہوگئے۔۔۔۔ دوسو درہم اکثر علماء ہندوستان کی تحقیق کے مطابق ساڑھے باون تولہ۔

(باقی حاشیہ صفحہ ۱۳۸ پر)

غلہ اور پھلوں کیلئے پانچ وسق[1] (جو اونٹ کے پانچ بوجھ کے برابر ہوتا ہے) بکری کے لئے چالیس بکریاں، گائے کیلئے تیس گائے، اونٹ کیلئے پانچ مقرر کئے گئے[2]،،

زکوٰۃ کا صحیح مصرف اور اس کے مناسب اوقات

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے زکوٰۃ کے مناسب محل اور اسکے اوقات کی حکمت و مصلحت کی بڑی اچھی وضاحت کی ہے، وہ لکھتے ہیں،

"وہ دروازے جو صالح سلاطین نے بلا کسی تکلیف و مشقت کے زکوٰۃ کیلئے کھولے تھے اور جن کو عقل بھی قبول کرتی ہے چار ہیں، اول یہ کہ اموال نامیہ سے زکوٰۃ لی جائے اس لئے کہ اس کی حفاظت کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے اور نمو ملک کے باہر آنے جانے کے بغیر پورا نہیں ہوتا،

اموال نامیہ کی تین قسمیں ہیں مویشی، کاشت، تجارت، دوسرے یہ کہ خزانہ کے مالکوں اور سرمایہ داروں سے لی جائے اس لئے کہ ان کو چوروں اور ڈاکوؤں سے اپنے مال کی حفاظت کی سب سے زیادہ ضرورت ہے اور ان کی آمدنی کی مدیں اتنی زیادہ ہیں کہ

(باقی حاشیہ صفحہ ۱۳۷ کا) ۲۰ مثقال (یا بیس دینار) **ساڑھے سات تولہ سونے کے مساوی سمجھا گیا ہے۔**

[1] وسق ۶۰ صاع کے برابر ہوتا ہے اور ہر صاع ۸ رطل کے مساوی ہے اور امام مالک امام شافعی، امام احمد اور اکثر علماء کا مذہب یہی ہے، ان کے نزدیک اس سے کم میں زکوٰۃ نہیں ہے، ابن عباسؓ، زید بن علی اور امام ابو حنیفہ کی رائے یہ ہے کہ زکوٰۃ کم یا زیادہ سب میں واجب ہے اور نصاب کا اعتبار نہیں، یہ اختلاف ایک اصولی بحث کے نتیجہ میں ہوا جس کی تفصیل مذاہب کی کتب استدلال، نیز اصول فقہ کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے، ان الفاظ کا مفہوم اور مطلب سمجھنے اور اس سلسلہ کے اقوال و مذاہب سے آگاہی کیلئے امام ابو بکر جصاص (م ۳۸۰ھ) کی کتاب "احکام القرآن" نیز قاضی ابو بکر بن العربی (م ۵۴۲ھ) کی کتاب "احکام القرآن" اور تفسیر "مذاہب اربعہ کی کتب کا مطالعہ مفید ہوگا [2] ماخوذ از زاد المعاد ج ۱ ص ۱۴۶ باختصار

اس نئے خرچ سے ان کو کوئی دشواری نہیں ہو گی،

تیسرے یہ کہ ان اموال سے لی جائے جو بغیر کسی محنت وسعی کے ہاتھ لگ جاتے ہیں مثلاً عہدِ جاہلیت کے خزانے اور قدما رکے دفینے، اس لئے کہ ان کی حیثیت بالکل مفت کی سی ہے اور اس میں سے خرچ کرنا بہت آسان ہے، چوتھے یہ کہ عام تجارت پیشہ لوگوں سے لی جائے اگر سب سے تھوڑا تھوڑا لیا جائے گا تو ان پر زیادہ بار بھی نہ ہو گا اور مجموعہ کافی ہو جائیگا۔

تجارت (مع درآمد برآمد) غلہ اور پھل زکوٰۃ کی سب سے اہم قسمیں ہیں جن میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے، اس لئے اس کیلئے ایک سال رکھا گیا ہے، وجہ یہ ہے کہ درمیان میں مختلف فصلیں اور حالتیں پیش آتی ہیں جن میں پیداوار میں اضافہ کا امکان بہت رہتا ہے اور اس کا اندازہ کرنے کیلئے ایک سال بالکل کافی ہے،

آسان اور مطابق مصلحت یہی ہے کہ زکوٰۃ ان ہی اموال کا ایک جزء ہو مثلاً اونٹ کے گلہ سے ایک اونٹنی، گائے کے ریوڑ سے ایک گائے، بکری کے ریوڑ سے ایک بکری[1]،

زکوٰۃ کے مصارف اور اسکے اجتماعی نظام کا قیام

زکوٰۃ کے مصارف اللہ تعالےٰ نے سورہ برارۃ کی آیت میں بیان فرمائے ہیں، ارشاد ہے،

اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاۤءِ وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ[2]	صدقات (واجبہ) تو صرف غریبوں اور محتاجوں اور کارکنوں کا حق ہیں جو ان پر مقرر ہیں، نیز ان کا جن کی دلجوئی منظور ہے، اور (صدقات کو صرف کیا جائے) گردنوں (کے چھڑانے) میں اور قرضداروں (کے قرضہ

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۳۰ [2] سورہ توبہ - ۶۰

.... ادا کرنے) میں اور اللہ کی راہ میں، اور مسافروں (کی

.... امداد) میں یہ (سب) فرض ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ

.... بڑا علم والا ہے، بڑا حکمت والا ہے،

سورہ براءۃ فتح مکہ کے بعد نازل ہوئی، اس وقت اسلام کی بنیادیں مستحکم ہو گئی تھیں اور لوگ بڑی تعداد میں اسلام قبول کر رہے تھے۔ اس کے بعد زکوٰۃ کا اجتماعی نظام قائم کیا گیا[۱] اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مختلف جگہوں پر اپنے عمال اور محصلین بھیجے اور ان کو اس کی تحصیل کے احکام اور آداب بھی بتائے اور بہت سی ایسی وصیتیں کیں جن میں شفقت، حکمت اور انفرادی مصلحت کے ساتھ اجتماعی مفاد وابستہ تھا[۲] چنانچہ آپ نے معاذ بن جبلؓ کو سنہ ۱۰ھ[۳] میں یمن روانہ کرنے سے پہلے جو ہدایات دیں وہ زکوٰۃ کے قانون کی اساس اور گویا اس کا سرکاری منشور ہیں، آپ نے ارشاد فرمایا،

"تم ایک ایسی قوم کے پاس جا رہے ہو جو اہلِ کتاب ہیں پس دعوت دو ان کو اس بات کی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور میں اللہ کا رسول ہوں، اگر وہ یہ بات قبول کر لیں تو

---

[۱] یہ منصوص مصارف زکوٰۃ کے حکم کے ساتھ دائم اور جاری ہیں سوائے المولفۃ قلوبہم کے، اکثر علماء، ائمہ اور فقہا کا خیال ہے کہ اسلام کی اشاعت اور غلبہ کی وجہ سے اب ان کے حصہ کی ضرورت باقی نہیں رہی وہ دلیل میں حضرت ابوبکرؓ کے عمل کو پیش کرتے ہیں جنھوں نے ایسے لوگوں کو زکوٰۃ نہیں دی، البتہ بعض دوسرے فقہاء اس کے بقا کے قائل ہیں،

اس سلسلہ میں قاضی ابوبکر ابن العربیؒ وغیرہ کی رائے راقم سطور کو زیادہ پسند آئی وہ کہتے ہیں کہ میری رائے یہ ہے کہ اگر اسلام کو غلبہ واقتدار حاصل ہو تو ضرورت نہیں، لیکن اگر اس کی ضرورت محسوس کی جائے تو ان کو اسی طرح دینا چاہیئے جس طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم دیتے تھے حدیث صحیح میں ہے بدأ الاسلام غریبًا وسیعود غریبا کما بدأ (احکام القرآن صد ۳۸۵)

[۲] یہ ہدایت نامے اور فرامین احادیث اور سیرت کی کتابوں میں دیکھے جا سکتے ہیں،

[۳] صحیح بخاری کتاب المغازی کے آخر میں اس سنہ کی تصریح ہے،

ان کو یہ بتاؤ کہ اللہ نے ان پر ایک صدقہ فرض کیا ہے جو ان کے اغنیاء سے لیا جائے گا

اور ان کے فقراء کو دیدیا جائے گا، اگر وہ یہ بات بھی منظور کرلیں پس تم کو چاہیئے کہ ان کے

بہترین مال پر ہاتھ ڈالنے سے احتراز کرو[1]، اور مظلوم کی دعا اور پکار سے ڈرو اس لئے کہ اللہ

اور اسکے درمیان کوئی حجاب نہیں ہوتا[2]،،

زکوٰۃ کے بنیادی مصالح

بہت سے معاصر اہلِ قلم اور اہلِ فکر جو جدید معاشی فلسفوں اور علم الاقتصاد کی غیر معمولی اہمیت اور ہمہ گیری.........

.........سے کم و بیش متاثر اور ذہنی طور پر مرعوب ہیں، سارا زور زکوٰۃ کے اقتصادی اور اجتماعی مصالح و منافع پر دیتے ہیں اور اس کو صرف ایک عادلانہ ٹیکس قرار دیتے ہیں یا زیادہ محتاط الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی تحریروں کو پڑھنے والا کم از کم ایسا محسوس کرتا ہے کہ ان کی رائے زکوٰۃ کے بارہ میں یہ ہے کہ دنیا کے معاشی نظاموں نے اب تک جتنے ٹیکس سوسائٹی پر عائد کئے ہیں، یہ اسلامی ٹیکس ان سب سے زیادہ منصفانہ حکیمانہ اور متوازن ہے، اس لحاظ سے وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ زکوٰۃ اس اشتراکیت (سوشلزم) کی نہایت مستحکم بنیاد ثابت ہوسکتی ہے جسے اسلام نے اپنی ترقی و عروج کے بہترین زمانہ میں دنیا کے سامنے پیش کیا تھا وہ (چند مستثنیات کو چھوڑکر) زکوٰۃ کی اس حقیقی روح کو فراموش کردیتے ہیں جو اسکے پورے نظام میں جاری و ساری ہے، یہ روح ہے عبادت اور تقرب الی اللہ کی، اس طرح وہ اس کے بنیادی مقصد اور اصل مصلحت و حکمت کو نظر انداز کردیتے ہیں، یعنی نفس کو بخل، خود غرضی، انانیت، فقراء کی حق تلفی اور قلب کی قساوت سے پاک و صاف کرنا، اللہ تعالیٰ کی قبولیت و رضا حاصل کرنا اور فقراء و ضعفاء کی دلداری اور ہمدردی کے نتیجہ میں مال میں پاکی اور نورانیت اور خیر و برکت کا ظہور،

---

[1] یعنی یہ مناسب نہیں کہ تم چھانٹ چھانٹ کر سب سے بہتر جانور لے لو،

[2] صحاح ستہ روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بہت اہتمام وتاکید کے ساتھ اس بنیادی مصلحت اور حقیقی فائدہ کا ذکر کیا ہے اور سب سے زیادہ زور اسی مرکزی نقطہ پر دیا ہے،

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا [۱]

آپ ان کے مالوں میں سے صدقہ لے لیجئے اس کے ذریعہ سے آپ انھیں پاک وصاف کر دیں گے۔

زکوٰۃ اور سود کا موازنہ کرتے ہوئے ارشاد ہے،

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ [۲]

اور جو چیز تم اس غرض سے دوگے کہ لوگوں کے مال میں پہنچ کر زیادہ ہو جائے سو وہ اللہ کے آگے نہیں بڑھتی اور جو تم صدقہ دوگے جس سے اللہ کی رضا طلب کرتے ہو گے تو ایسے ہی لوگ عنقریب بڑھاتے رہیں گے،

ابوداؤد میں ہے حضرت ابن عباسؓ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ "نہیں فرض کی اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ مگر اس لئے کہ اس کے ذریعہ تمہارا بقیہ مال و دولت پاک ہو جائے"

اس اساسی مصلحت کے بعد جماعت اور معاشرہ کی مصلحت آتی ہے جس میں معاشرہ کی خود کفالتی، غربا کی اہم ضرورتوں کی تکمیل، سوسائٹی کے ہر ممبر کیلئے باعزت اور شریفانہ زندگی کے مواقع کی فراہمی تاکہ وہ حقوق اللہ اور حقوق العباد ادا کر سکے اور مقصد حقیقی اور کمال اصلی تک پہونچ سکے،

وہ علما جنھوں نے کتاب وسنت اور دوسرے علوم اسلامیہ کا براہِ راست اور گہرا مطالعہ کیا تھا اور اپنے کو خارجی اثرات سے محفوظ رکھا تھا اور جو صرف مدرسۂ نبوت سے واقف تھے اور گویا وہیں کے تعلیم یافتہ تھے، اور جنھوں نے اسلام کے فہم صحیح کیلئے صحیح راستہ منتخب کیا تھا وہ ان مصالح میں ترتیب اور فرق مراتب ہمیشہ ملحوظ رکھتے تھے اور ہر چیز کو وہی حیثیت دیتے تھے جو کتاب وسنت نے مقرر کر دی ہے،

---

[۱] سورۃ التوبہ ۱۰۳ [۲] سورۃ الروم ۳۹

سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اس بات کو صحابہ کرامؓ نے سمجھا پھر ان کے جانشین اس فہم صحیح کو میراث نبوت کی حفاظت کے ساتھ اپنی آئندہ نسلوں تک منتقل کرتے رہے، ہم اس سلسلہ میں اسلام کے بعض ممتاز ترین علماء اور ائمہ کے اقتباسات پیش کرتے ہیں تاکہ ہمیں اس طرز فکر کا صحیح اندازہ ہوسکے،

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب زکوٰۃ کے بنیادی مصالح اور اس کے احکام کے اسرار اور حکمتوں کا ذکر کرتے ہوئے "حجۃ اللہ البالغہ" میں لکھتے ہیں،

"جاننا چاہیئے کہ زکوٰۃ میں سب سے اہم مصالح دو ہیں، پہلی مصلحت تہذیب نفس ہے اس لئے کہ نفس اور حرص وبخل کا چولی دامن کا ساتھ ہے، حرص بدترین اخلاق میں سے ہے، جو معاد میں انسان کو سخت ہلاکت میں ڈال سکتی ہے، جو حریص ہوگا مرتے وقت بھی اس کا دل مال میں اٹکا رہے گا اور اس کی وجہ سے عذاب میں مبتلا کیا جائے گا، اگر زکوٰۃ کی مشق اسکو ہوگی تو یہ حرص اس سے ختم ہوچکی ہوگی، جو بالآخر اس کو نفع پہونچائے گی،

انابت اور رجوع الی اللہ کے بعد معاد میں سب سے اعلیٰ اخلاق سخاوت نفس ہے جسطرح رجوع الی اللہ، انابت وعبودیت دعا اور تضرع سے عالم جبروت سے مناسبت اور قرب پیدا ہوتا ہے، اسی طرح سخاوت خسیس اور پست دنیاوی صورتوں اور شکلوں کو توڑتی ہے، اسلئے کہ وہ بہیمیت کی ضد ہے اور اس کی اصل یہ ہے کہ ملکوتی (فرشتوں والی صفات) غالب ہوں اور بہیمانہ صفات ان سے دب جائیں، بلکہ ان کے رنگ میں رنگ جائیں، اور ان پر بھی اس حکم کا اطلاق ہونے لگے جو ملکوتی صفات پر ہوتا ہے۔ اس کا راستہ یہی ہے کہ مال کو باوجود ضرورت واحتیاج کے راہ خدا میں خرچ کیا جائے، ظالم کو معاف کیا جائے مصائب پر صبر کیا جائے اور دنیاوی تکالیف ومشکلات آخرت کے یقین کی وجہ سے آسان وخوشگوار ہوجائیں،

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ان سب چیزوں کا حکم دیا ہے اور ان کے حدود مقرر فرمائے

ہیں، ان میں ان کا خرچ کرنا بھی ہے جو بہت سے حدود و قیود کے ساتھ وابستہ ہے اور اسکی اہمیت اتنی ہے کہ ایمان اور نماز کے ساتھ قرآن مجید میں جگہ جگہ اس کا ذکر ہے، اللہ تعالےٰ اہلِ نار کے بارہ میں فرماتا ہے،

قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ۝ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ ۝ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ [۱] ۝	وہ کہیں گے ہم تو نہ نماز پڑھا کرتے تھے اور نہ ہم غریب کو کھانا کھلایا کرتے تھے اور مشغلہ میں رہنے والوں کے ساتھ ہم بھی مشغلہ میں پڑے رہتے تھے،

دوسری مصلحت کا تعلق شہر سے ہے اس لئے کہ ضعفار و اہلِ حاجت جمع ہوں گے، اگر ان کی ہمدردی و اعانت کی یہ سنت نہ ہو تو وہ سب بھوک سے ہلاک ہو جائیں اس کے علاوہ شہروں کا نظام مال پر قائم ہوتا ہے اور ان شہروں کی حفاظت کے ذمہ دار اور وہاں کے مدبرین و منتظمین اپنی ان مشغولیات اور ذمہ داریوں کی وجہ سے کوئی باقاعدہ ذریعہ معاش اختیار نہیں کر سکتے، ان کی معیشت کا انحصار بھی اسی پر ہوتا ہے، مشترکہ اخراجات یا چندے نہ سب کے لئے آسان ہیں نہ ممکن، اسلئے رعیت سے ان مصالح کیلئے مقررہ رقم وصول کرنا مناسب دستور ہے،

اور چونکہ مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ یہ دو مصالح باہم لازم و ملزوم رہیں، اس لئے شرع نے بھی اس کو ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ رکھا ہے [۲]"

علامہ بحر العلوم فرنگی محلی لکھتے ہیں کہ زکوٰۃ ٹیکس نہیں، بلکہ دوسری عباد توں کی طرح خالص اللہ کی عبادت ہے وہ کہتے ہیں کہ:-

---

[۱] سورہ مدثر ۔ ۴۳ ۔ ۴۵ [۲] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ صفحہ ۲۹۔۳۰

"ادائیگیٔ زکوٰۃ کے وقت نیت کی درستی بہت ضروری ہے، اس لئے کہ زکوٰۃ بہت بڑی عبادت ہے، جس طرح نماز کا مقصد سوائے حصول ثواب کے کچھ نہیں، چنانچہ نیت اسکے لئے فرض ہے، اگر بلانیت کے ادا کرے گا تو جس طرح نماز بلانیت کے نہیں ہوتی، زکوٰۃ بھی ادا نہیں ہوگی، البتہ نماز بلانیت کے باطل ہو جاتی ہے بخلاف زکوٰۃ کے جو بلانیت کے ہدیہ ہو جاتی ہے، چنانچہ ہدیہ کا ثواب اس کو ضرور حاصل ہوگا اس لئے کہ اللہ تعالےٰ نیکوکار کے عمل کو ضائع نہیں کرتا[1]"

زکوٰۃ کی نمایاں خصوصیات

زکوٰۃ کی بہت سی ایسی نمایاں خصوصیات ہیں جو انسان کے خودساختہ قوانین اور حکومت کے عائد کردہ ٹیکسوں سے بہت مختلف ہیں، ان ... مابہ الامتیاز خصوصیات نے زکوٰۃ کو ایک خاص رنگ اور مزاج بخشا ہے، اس کو دینی تقدس اور پاکیزگی عطا کی ہے اور اس کے اندر زندگی و اخلاق پر اثر انداز ہونے اور خدا و بندہ کے تعلق کو استوار اور مستحکم کرنے کی ایسی قوت و صلاحیت پیدا کر دی ہے جو کسی دوسرے دنیاوی ٹیکس میں (خواہ اس میں انصاف اور اعانت کو زیادہ سے زیادہ ملحوظ رکھا گیا ہو) نہیں ہے اور نہ ممکن ہے،

تبشیر و انذار

ان خصوصیات میں سب سے نمایاں، بنیادی اور موثر چیز ایمان و احتساب[2] کی وہ روح ہے جو اس فریضہ میں جان ڈالتی ہے، اس روح یا اسپرٹ سے رسمی ٹیکس سرکاری قوانین اور معاشی حدبندیاں قدرتی طور پر بالکل محروم ہیں، بلکہ اس کے برعکس ان میں ناراضگی، گرانی اور بددلی کا عنصر بہت نمایاں ہوتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ٹیکس دینے والا یہ عقیدہ نہیں رکھتا کہ یہ ٹیکس اللہ تعالےٰ کی طرف سے مقرر کیا گیا ہے اور اس پر ... اجر و ثواب ملے گا، بلکہ وہ جانتا ہے کہ یہ ٹیکس لگانے والے خود اس

---

[1] رسائل الارکان ص ۱۶۳ [2] ایمان و احتساب کی مختصر تشریح نماز کے باب میں پاکی اور اس کا اہتمام کے عنوان سے گزر چکی ہے،

جیسے انسان ہیں اور شاید اس سے بھی پست تر ہیں اور اس ٹیکس سے ہونے والی آمدنی زیادہ تر تعیشات، اپنے اقتدار کو محفوظ رکھنے یا چند اشخاص اور مخصوص پارٹیوں کے مفاد پر خرچ ہوتی ہے، اس کے علاوہ ان ٹیکسوں کے ساتھ دینی ترغیب و ترہیب کی کوئی قوت نہیں ہوتی، بلکہ اس کے بجائے جرمانے، دھمکیاں، سزائیں اور خشک و سخت قوانین ہوتے ہیں جن سے عوامی ناراضگی اور بے اطمینانی و بے چینی میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے،

ان حکمتوں کی وجہ سے جن کو اللہ تعالےٰ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا، قرآن و حدیث اور نبوی تعلیمات میں زکوٰۃ کا ذکر ہمیشہ فضائل، دنیا و آخرت میں اس کے نتائج و ثمرات، اجر و ثواب، مال و دولت میں برکت، یا زکوٰۃ نہ ادا کرنے والوں کو عذاب الیم کی وعید اور بے برکتی کے ساتھ کیا گیا ہے،

اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے،

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۗ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝[1]

جو لوگ اپنے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، ان کے مال کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ایک دانہ ہے کہ اس سے سات بالیاں اُگیں ہر ہر بالی کے اندر سو دانے ہوں، اور اللہ جسے چاہے افزونی دیتا رہتا ہے، اللہ بڑا وسعت والا ہے بڑا علم والا ہے، جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور جو کچھ خرچ کر چکے ہیں اس کے عقب میں احسان و اذیت سے کام نہیں لیتے ان کے لئے اس کا اجر ان کے پروردگار کے پاس ہے اور ان پر نہ کوئی خوف (واقع) ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے،

---

[1] سورہ بقرہ - ۲۶۱ - ۲۶۲

الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ بِاللَّیْلِ وَالنَّھَارِ سِرًّا وَّعَلَانِیَۃً فَلَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ وَلَاخَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَاھُمْ یَحْزَنُوْنَ ○[۵۱]

جو لوگ اپنا مال رات اور دن (اور) پوشیدہ اور آشکارا خرچ کرتے رہتے ہیں سو ان لوگوں کے لئے ان کے پروردگار کے پاس اجر ہے، نہ ان کیلئے کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے،

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ لَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ وَلَاخَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَاھُمْ یَحْزَنُوْنَ ○[۵۲]

بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کئے اور نماز کی پابندی کی اور زکوٰۃ دی ان کیلئے ان کا اجر ان کے پروردگار کے پاس ہے نہ ان پر کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے،

ایک جگہ اور ارشاد ہے،

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗ وَلَہٗ اَجْرٌ کَرِیْمٌ ○[۵۳]

کوئی شخص ہے جو اللہ کو اچھی طرح قرض کے طور پر دے پھر اللہ اسے اس شخص کیلئے بڑھاتا چلا جائے، اور اس کیلئے اجر پسندیدہ ہے،

. . . .

اِنَّ الْمُصَّدِّقِیْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعَفُ لَھُمْ وَلَھُمْ اَجْرٌ کَرِیْمٌ[۵۴]

بلاشبہ صدقہ دینے والے اور صدقہ دینے والیاں (یہ جو) اللہ کو خلوص کے ساتھ (قرض دیں) تو وہ صدقہ ان کے لئے بڑھایا جائے گا اور ان کے لئے اجر پسندیدہ ہے،

وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَکٰوۃٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْہَ اللّٰہِ

اور تم جو صدقہ دو گے جس سے اللہ کی رضا طلب کرتے

---

[۵۱] سورہ بقرہ ــــ ۲۷۴ [۵۲] سورہ بقرہ ــــ ۲۷۷ [۵۳] سورہ حدید ــــ ۱۱

[۵۴] سورہ حدید ــــ ۱۸

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ۝[1] ہو گے تو ایسے ہی لوگ عنقریب بڑھاتے رہیں گے۔

ان خوشخبریوں اور بشارتوں کے ساتھ (جو انسان کی ضرورت اور فطرت بشری کا تقاضا ہے) مال جمع کرنے، فقراء واہل حاجت کی حق تلفی کرنے، حقوق اللہ میں کوتاہی، محض لالچ اور حرص اور اپنا دل خوش کرنے کیلئے سرمایہ جمع کرنے کے شوق اور مال سے عشق پر بار بار تنبیہ اور وعیدوں سے کام لیا گیا ہے۔

اللہ تعالے کا ارشاد ہے،

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝[2]

اور جو لوگ کہ سونا اور چاندی جمع کر کر کے رکھتے ہیں اور اس کو خرچ نہیں کرتے اللہ کی راہ میں، آپ انھیں ایک دردناک عذاب کی خبر سنا دیجئے، اس روز (واقع ہوگا) جبکہ اس (سونے چاندی) کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا، پھر اس سے ان کی پیشانیوں کو اور ان کے پہلوؤں کو اور ان کی پشتوں کو داغا جائے گا، یہی ہے وہ جسے تم اپنے واسطے جمع کرتے رہے تھے سو اب مزا چکھو اپنے جمع کرنے کا،

اسی طرح لسان نبوت نے زکوٰۃ دینے والوں کو مختلف بشارتیں سنائی ہیں اور اس کو مال و اولاد اور دنیا و آخرت دونوں جگہ باعث برکت اور باعث نجات بتایا ہے،

حضرت ابوہریرہؓ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ جب کوئی اپنے پاک مال (اور اللہ تعالے صرف پاک مال ہی پسند کرتا ہے) سے کچھ صدقہ کرتا ہے تو اللہ تعالے اس کو اپنے دائیں ہاتھ میں لے لیتا ہے، اگر وہ کھجور ہوتا ہے تو اللہ تعالے کے ہاتھ میں بڑھتا رہتا ہے اور اتنا بڑھ جاتا ہے کہ

---

[1] سورہ روم ۔۔ ۳۹ [2] سورہ توبہ ۔ ۳۴ ۔ ۳۵ ۔

پہاڑ کے برابر ہو جاتا ہے، جس طرح تم میں سے کوئی اپنے بچھڑے یا بکری کے بچہ کی پرورش کرتا ہے[۱]،،

انھیں سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ" ایک آدمی کھلے میدان میں جا رہا تھا کہ اس نے بادل سے ایک آواز سنی کہ فلاں کے باغ کو سینچ دو، چنانچہ بادل اپنی جگہ سے ہٹا اور سب پانی ایک قطعہ آراضی میں انڈیل آیا، وہاں ایک تالاب یا گہرائی تھی جہاں سارا پانی بھر گیا، اس نے اس پانی کی طرف چلنا شروع کیا تو دیکھا کہ ایک آدمی کھڑا ہوا اس پانی سے اپنے کھیت سینچ رہا ہے، اس نے پوچھا اللہ کے بندے تمہارا نام کیا ہے، اس نے وہی نام بتایا جو اس نے بادل سے سنا تھا، اس نے پوچھا کہ اللہ کے بندے تم نے ہمارا نام کیوں پوچھا، اس نے کہا کہ میں نے اس بادل میں سے جس کا یہ پانی ہے اس نام کے ساتھ ایک آواز سنی کہ فلاں کے باغ کو سینچ آؤ، اب مجھے بتاؤ کہ تم اس کھیت میں کیا کرتے ہو؟ اس نے کہا اب جب کہ تم پوچھ ہی رہے ہو تو سنو، میں اس کی پیداوار کا ایک تہائی حصہ صدقہ کر دیتا ہوں اور ایک تہائی سے اپنی اور اپنے اہل و عیال کی پرورش کرتا ہوں اور ایک تہائی دوبارہ اسی میں لگا دیتا ہوں[۲]،،

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ" صدقہ کی وجہ سے آدمی کا مال کبھی کم نہیں ہوتا، اور معاف کرنے سے اللہ تعالےٰ بندہ کو عزت ہی عطا فرماتا ہے اور جب کوئی اللہ تعالےٰ کیلئے تواضع سے کام لیتا ہے تو اس کو اللہ تعالےٰ بلند کرتا ہے[۳]،،

ایک اور موقع پر ارشاد ہوا ہے کہ" کوئی صبح بندوں پر ایسی نہیں گزرتی کہ دو فرشتے نہ اترتے ہوں جن میں ایک یہ کہتا ہے کہ اے اللہ خرچ کرنے والے کو اس کا بدل عطا فرما اور دوسرا یہ کہتا ہے کہ اے اللہ بخیل کے مال کو تلف کر دے[۴]،،

ایک اور روایت میں ہے کہ" ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ بعض لوگوں نے بکری ذبح کی، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ اس میں سے کچھ بچا ہے؟ حضرت عائشہ رضؓ نے کہا کہ اس میں سے سوائے ایک دست کے کچھ نہیں بچا، آپؐ نے فرمایا کہ سوائے دست کے سب کچھ

---

[۱] صحاح ستہ باستثنا ابوداود [۲] صحیح مسلم [۳] مسلم، ترمذی، موطاء [۴] شیخین

بچ گیا[۱]"

زکوٰۃ ادا نہ کرنے والوں کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بڑی وعید سنائی ہے اور دنیا میں بُرے انجام اور آخرت میں بُرے حشر سے خبردار کیا ہے، حضرت ابوہریرہؓ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ جس کو اللہ تعالےٰ نے مال دیا اور اس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہیں کی اس کا مال قیامت کے دن ایک سانپ کی شکل میں لایا جائے گا جس کی دو زبانیں ہوں گی وہ اس کی گردن میں ڈال دیا جائیگا وہ اس کو اپنے دونوں جبڑوں میں جکڑے گا اور کہے گا میں تیرا مال ہوں، میں تیرا مال ہوں، میں تیرا خزانہ ہوں پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی "وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ الخ"

حضرت ابوہریرہؓ ہی سے ایک اور روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب مالِ غنیمت لوٹ کا مال بن جائے، امانت مالِ غنیمت ہو جائے، زکوٰۃ جرمانہ اور تاوان بن جائے اور علم کو غیر دین کیلئے سیکھا جانے لگے، شوہر اپنی بیوی کی فرماں برداری کرے اور ماں کی نافرمانی کرے، دوست کو قریب کرلے باپ کو دور کرے، مسجدوں میں آوازیں بلند ہونے لگیں، قبیلہ کی سرداری اس کے سب سے زیادہ فاسق آدمی کے ہاتھ میں آجائے اور قوم کا سردار وہ ہو جوان میں سب سے زیادہ رذیل ہو، آدمی کی عزت صرف اس کے شر سے بچنے کے لئے کی جانے لگے، گانے والیاں اور باجے عام ہو جائیں، شرابیں پی جانے لگیں، اور اس امت کے آخری دور کے لوگ دورِ اول کے لوگوں کو مطعون کرنے لگیں..........

.... اس وقت انتظار کرو سرخ آندھی کا، زلزلہ کا، دھنسنے کا، مسخ ہونے کا اور آفات کی بارش کا اور خدا کی نشانیوں کے اس طرح پے درپے ظہور کا جس طرح کوئی لڑی ٹوٹ جائے اور یکے بعد دیگرے دانے گرنے لگیں[۲]"

ان فضائل اور ترغیب و ترہیب کی آیات و احادیث کا اثر یہ تھا کہ مسلمان خود اپنے نفوس

---

[۱] جامع ترمذی [۲] ترمذی

کے نگراں بن گئے تھے، وہ ایک طرف بیت المال کیلئے رضاکارانہ طور پر رقم اکٹھا کرتے تھے اور دوسری طرف اہلِ حاجت اور فقرا کے وکیل اور نمائندے بھی بن گئے تھے، وہ زکوٰۃ کے مستحقین اور اسکے صحیح مصارف کیلئے بہت فکر و توجہ اور دیانت کے ساتھ جستجو کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ اللہ تعالےٰ کا حق جلد سے جلد ان سے ادا ہو جائے جب تک وہ کام پورا نہ کر لیتے تھے ان کو کھانے پینے اور کسی چیز میں لطف نہ آتا تھا صحابہ کرامؓ اور تابعین کی زندگی کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا رویہ اور طرز زندگی کیا تھا اور ایمان نیز ترغیب و ترہیب کی ان احادیث نے ان کے دلوں کو کس درجہ متاثر کیا تھا، زکوٰۃ درحقیقت ان کیلئے نماز کی طرح تھی جس کی ادائیگی کے لئے ایک سچا مسلمان دل سے بے قرار ہوتا ہے اور جبتک نماز پڑھ نہ لے اس کے دل کو کسی طرح سکون نہیں ملتا،

ان فضائل اور دینی شعور پیدا کرنے میں ان کے کردار کی اہمیت سے علماء اسلام خوب واقف تھے اسی لئے انھوں نے اپنی کتابوں اور مواعظ میں ترغیب و ترہیب سے بہت کام لیا ہے اور اس بات پر بہت زور دیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ معاشرہ پر اس کا خاطر خواہ اثر پڑا، اگر ایسا نہ ہو تو شائد زکوٰۃ کا رکن معطل ہی ہو جاتا اور چونکہ حکومتوں نے سرکاری اور باضابطہ طور پر اس کے حصول و تقسیم کا کام چھوڑ دیا تھا اس لئے مسلمان بھی اس کو چھوڑ کر گھر بیٹھ رہتے،

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اسلامی شریعت میں ان فضائل کے مقام و اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے خوب لکھا ہے،

"انفاق کی ترغیب و فضیلت پر جو احادیث آئی ہیں ان کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ یہ عمل سخاوت کے ساتھ ہو جو زکوٰۃ کی روح ہے اور تہذیب نفس کا کام بہت حد تک اس سے انجام پا سکتا ہے، بخل کی برائی بار بار اس لئے بیان کی گئی ہے کہ حرص ایسی چیز ہے جو مانع زکوٰۃ کو نقصان پہونچا سکتی ہے اور جس کا اشارہ اس حدیث میں ہے کہ

اَللّٰھُمَّ اَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا، وَاللّٰھُمَّ اَعْطِ مُمْسِکًا تَلَفًا"، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ حرص سے بچو اس لئے کہ حرص ہی نے تم سے پہلے والوں کو ہلاک کیا ہے، دوسرے موقع پر ارشاد ہے" اِنَّ الصَّدَقَۃَ لَتُطْفِئُ غَضَبَ الرَّبِّ" بیشک صدقہ اللہ تعالےٰ کے غضب کی آگ کو ٹھنڈا کر دیتا ہے، ایک مرتبہ فرمایا" اِنَّ الصَّدَقَۃَ لَتُطْفِئُ الْخَطِیْئَۃَ" بے شک صدقہ گناہوں کو اس طرح بجھا دیتا ہے جس طرح پانی آگ کو بجھاتا ہے، ایک اور حدیث میں ہے کہ" اللہ تعالےٰ صدقہ کو اپنے داہنے ہاتھ میں لے لیتا ہے اور اس کو بڑھاتا رہتا ہے"[1]

زکوٰۃ اور ان ٹیکسوں کے درمیان جو شخصی سلطنتوں میں یا نئے — مالداروں سے لیا جائے اور غربا میں تقسیم کیا جائے

زمانہ کی" جمہوری اور عوامی" حکومتوں میں نظر آتے ہیں ایک نمایاں اور بنیادی فرق جو اس کے اثرات ونتائج پر پورے طور پر اثر انداز ہے وہ اس کی شرعی ساخت اور حیثیت ہے جس کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے بلیغ ومعجزانہ الفاظ میں اس طرح بیان فرمایا" تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِیَائِھِمْ وَتُرَدُّ عَلٰی فُقَرَائِھِمْ" (ان کے دولت مندوں سے لیا جائے اور ان کے غربا میں تقسیم کیا جائے) یہ زکوٰۃ کی وہ شرعی حیثیت ہے جو عہدِ اولیٰ میں نظر آتی ہے اور جو قیامت تک برقرار رہنی چاہیئے، وہ ان اغنیار (جو اس کے شرائط فرضیت پر پورے اترتے ہیں اور زکوٰۃ کا منصوص اور معین نصاب ان کے پاس موجود ہے) سے لے کر ان مصارف میں صرف کی جائے جو اللہ تعالےٰ نے قرآن مجید میں بیان فرمائے ہیں اور کسی مقنن اور قانون ساز ادارہ یا شخصیت کو اس کا حق نہیں دیا ہے کہ وہ اس میں اپنی طرف سے کچھ ترمیم کر سکے، اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے،

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ صفحہ ۴۳

اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ [1] الخ صدقات (واجبہ) تو صرف غریبوں ...... کا حق ہیں۔

شریعت اور احادیث نبوی کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد شہر کے فقراء اور اہل حاجت ہیں، زکوٰۃ کا یہ نظام ان حکومتوں میں بھی قائم رہا جو اسلامی قوانین کی تطبیق پر سو فی صدی عامل نہ تھیں، چنانچہ فقراء و مستحقین ان حکومتوں کے سایہ میں کبھی اپنے حقوق سے کلیتاً محروم نہیں رہے اور حدود اللہ کبھی پوری طرح معطل نہیں ہوئے [2] یہ وہ حکومتیں ہیں جن کی مذمت میں بہت سے غرض مند مورخ اور مستشرق پیش پیش نظر آتے ہیں، بلکہ انکے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کے داعی ہیں،

اس کے برعکس جو ٹیکس موجودہ حکومتوں میں لگائے جاتے ہیں وہ زکوٰۃ کی عین ضد ہیں، یہ ٹیکس (خواہ ظالمانہ ہوں یا عادلانہ، کم ہوں یا زیادہ) زیادہ تر متوسط طبقہ اور غرباء سے وصول کئے جاتے ہیں، اور اغنیاء و امراء کی طرف لوٹا دئے جاتے ہیں، یہ دولت جو کسانوں کے گاڑھے پسینہ کی کمائی اور مزدوروں، کاریگروں اور تاجروں پر لگائے ہوئے ٹیکس سے حاصل ہوتی ہے، بڑی سخاوت بلکہ بیدردی اور بے رحمی کے ساتھ صدور مملکت اور بیرونی مہمانوں کے استقبال اور ان کی شاہانہ اور پرتکلف ضیافتوں پر (جن کو دیکھ کر الف لیلہ کے خیالی قصے یاد آجاتے ہیں) بیرونی ملکوں کے سفارت خانوں کی شاندار کاکٹیل پارٹیوں پر جن میں شراب پانی کی طرح بہائی جاتی ہے، حکومتوں کی پروپگنڈہ مشنری پر جس کا کام عوام کی دولت کو لوٹنا اور ان کا خون چوسنا ہے، غیر ملکی صحافیوں، نیوز ایجنسیوں اور ریڈیو کے اناؤنسروں پر جن کا مقصد جھوٹی خبریں گڑھنا، بے گناہوں پر الزام رکھنا اور اپنے دشمنوں کو دن رات گالی دینا اور ہر وقت برا بھلا کہنا ہے اور ان اخباروں پر جن کو آج کل فوجوں اور ہتھیاروں سے زیادہ مفید اور کارگر سمجھا جاتا ہے خرچ کی جارہی ہے اور اس دولت کا سب سے بڑا مصرف ان ہی چیزوں کو سمجھ لیا گیا ہے، آج ہر "عوامی جمہوری، اشتراکی اور سوشلسٹ" حکومت اسپنج کی طرح عوام کا

---

[1] سورہ توبہ - ۶۰ [2] اس کے ثبوت کیلئے امام ابو یوسفؒ کی کتاب الخراج "کافی ہے جو خلیفہ ہارون رشید کے ایما اور تجویز پر لکھی گئی اور جس سے خراج زکوٰۃ اور صدقات کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

خون چوستی ہے اور پروپگنڈہ سیاسی رشوت اور صحافتی تلبیس کے سمندر میں انڈیل دیتی ہے، اس لحاظ سے ان ٹیکسوں کی اصل تصویر اور موجودہ حکومتوں کا اصل مرقع پیش کرنے کیلئے اس سے بہتر تعبیر نہیں ہوسکتی کہ "یہ ٹیکس غربار سے لے کر امرار کو دیدیا جاتا ہے" اسلامی زکوٰۃ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مالدار و مالک نصاب پر فرض کی گئی ہے اور جو اس امت کے ساتھ درحقیقت لطف و رحمت اور معاملہ نعمت نبوت کا ثمرہ اور نتیجہ ہے ایک ایسا ٹیکس ہے (اگر اس کو ٹیکس کہنا ضروری ہو) جس کا بار سب سے کم اور برکت سب سے زیادہ ہے اسلئے کہ وہ اغنیار سے وصول کیا جاتا ہے اور فقرار کو لوٹا دیا جاتا ہے،

تقویٰ، تواضع اور اخلاص کی اسپرٹ

زکوٰۃ کا تیسرا امتیازی پہلو اخلاص، تواضع اور ممنونیت کی وہ روح ہے جو ہر لمحہ اس میں جاری و ساری رہتی ہے، اس سے مراد زکوٰۃ کے آداب، اعلیٰ اخلاق اور دینی جذبات ہیں، جن کا ذکر قرآن مجید میں بہت اہتمام سے بار بار کیا گیا ہے اور زکوٰۃ دینے والوں کو ان صفات سے بہرہ ور ہونے کی ترغیب دی گئی ہے، اس نے اہل خیر کو اس کی . . . . تلقین کی ہے کہ وہ احسان جتانے سے پرہیز کریں اور اپنے صدقہ و خیرات کو اس سے ملوث کرکے بے قیمت نہ بنائیں،

قرآن اپنے معجزانہ پیرایہ بیان میں اس کو اس طرح بیان کرتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرچکے ہیں اس کے عقب میں احسان و اذیت سے کام نہیں لیتے، ان کے لئے اس کا اجر ان کے پروردگار کے پاس ہے اور ان پر نہ کوئی خوف (واقع) ہوگا، اور نہ وہ غمگین ہوں گے، مناسب بات اور درگزر ایسی خیرات سے بہتر ہے جس کے عقب میں اذیت ہو، اللہ

لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۖ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا ۖ لَا يَقْدِرُونَ عَلَىٰ شَيْءٍ مِمَّا كَسَبُوا ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ [۱]

بڑا غنی ہے، بڑا بردبار ہے، اے ایمان والو اپنے صدقوں کو احسان (رکھ کر) اور اذیت (پہنچا کر) باطل نہ کردو، جس طرح وہ شخص جو اپنا مال خرچ کرتا ہے لوگوں کے دکھاوے کو اور اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتا سو اس کی مثال تو ایسی ہے کہ جیسے ایک چکنا پتھر ہے جس پر کچھ مٹی ہے، پھر اس پر زور کی بارش ہو سو وہ اس کو بالکل صاف کردے (ایسے لوگ) کچھ بھی حاصل نہ کرسکیں گے اپنی کمائی سے، اور اللہ کافر لوگوں کو راہِ ہدایت نہ دکھائے گا،

اس نے ان اہلِ خیر کی مدح کی ہے جن کے اندر تواضع و اخلاص کی یہ روح پائی جاتی ہے اور زکوٰۃ ادا کرتے وقت یہ سب کیفیات ان پر طاری ہوتی ہیں، ارشاد ہے،

وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا آتَوْا وَقُلُوبُهُمْ وَجِلَةٌ أَنَّهُمْ إِلَىٰ رَبِّهِمْ رَاجِعُونَ [۲]

اور جو لوگ دیتے رہتے ہیں جو کچھ دیتے رہتے ہیں اور ان کے دل اس سے ڈرتے رہتے ہیں کہ انھیں پروردگار کے پاس واپس جانا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے،

إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ

تمہارے دوست تو بس اللہ اور اس کا رسول اور ایمان والے ہیں جو نماز کی پابندی رکھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے رہتے ہیں اس حال میں کہ وہ خشوع

---

۱ سورۃ البقرہ ــــ ۲۶۲ تا ۲۶۴، ۲ سورۃ المومنون ــــ ۶۰

رَاكِعُوْنَ[1] ○ — بھی رکھتے ہیں،

ان اہل خیر کی تعریف کرتے ہوئے وہ ان کو اخلاص کامل اور ہر قسم کی اعزاض سے آزادی سے متصف قرار دیتا ہے،

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ○ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ○ اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا[2] ○

اور کھانا کھلاتے رہتے ہیں مسکینوں اور یتیموں اور غریبوں کو اللہ کی محبت سے، ہم تو تم کو بس اللہ ہی کی خوشنودی کے لئے کھانا کھلاتے ہیں اور نہ تم سے (اس کا) عوض چاہیں اور نہ شکریہ، ہم تو اپنے پروردگار کی طرف سے اندیشہ رکھتے ہیں ایک سخت اور تلخ دن کا،

اس نے اس کی بھی ترغیب دی ہے کہ جو مال اللہ کے راستہ میں اور اللہ کے مستحق اور حاجت مند بندوں کیلئے نکالا جائے وہ پاک اور اچھا مال ہو، وہ اس مال میں سے نہ ہو جس کی نظر میں کوئی وقعت نہیں ہوتی،

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۪ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ[3] ○ ...

اے ایمان والو جو تم نے کمایا ہے اس میں سے عمدہ چیزیں خرچ کرو اور اس میں سے (بھی) جو ہم نے تمہارے لئے زمین سے نکالی ہیں اور خراب چیز کا قصد بھی نہ کرو کہ اس میں سے خرچ کرو گے، حالانکہ تم خود بھی اس کے لینے والے نہیں ہو، بجز اس صورت کے چشم پوشی ہی کر جاؤ، اور جانے رہو کہ اللہ بے نیاز

---

[1] سورہ مائدہ - ۵۵ - علامہ ابو حیان اندلسی البحر المحیط میں لکھتے ہیں کہ "رکوع سے مراد یہاں خشوع وخضوع اور تعظیم و توقیر ہے نہ کہ وہ ہیئت جو نماز میں ہوتی ہے" ج ۳ ص ۱۶ [2] سورہ دہر ۸ - ۱۰ [3] سورہ بقرہ ـــ ۲۶۷

. . . . ہے، ستودہ صفات ہے،

حدیث شریف میں آتا ہے کہ "حضرت عائشہ رضؓ نے ایک مرتبہ باسی گوشت صدقہ کرنا چاہا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کو تم نہیں کھا سکتیں اس میں سے صدقہ کرتی ہو؟"[1]

اس کے برعکس موجودہ زمانہ کے ٹیکس (قطع نظر اس کے کہ وہ عادلانہ ہیں یا ظالمانہ) اس اخلاقی وروحانی اسپرٹ، تواضع نفس، نام ونمود سے پرہیز، اخلاص نیت اور اخلاص عمل، اپنے محبوب و پاکیزہ مال میں سے صدقہ کرنے کے جذبہ سے عاری ہوتے ہیں بلکہ یہ ٹیکس زیادہ تر بے دلی، اکتاہٹ اور نفرت کے ساتھ ادا کئے جاتے ہیں، اس کیلئے اکثر قانونی حیلہ سازیوں کا سہارا لیا جاتا ہے اور اگر مجبوراً دینا ہی پڑتا ہے تو پھر اس ناگوار کام کیلئے غیر قانونی طریقہ سے کمائے ہوئے مال کو استعمال کیا جاتا ہے، یہ دراصل ان تمام لامذہبی، انسانی اور عصری قوانین کا مزاج ہے جن کو کسی عقیدہ، دینی فکر اور روحانی تقدس کا سہارا حاصل نہیں،

زکوٰۃ اور سود کا فرق

زکوٰۃ اور سود بخط مستقیم ایک دوسرے سے جدا ہیں، ان دونوں میں ایسے معنوی اور اخلاقی تضاد موجود ہیں جو ابتدا ہی سے قائم ہو جاتے ہیں اور آخر تک ختم نہیں ہوتے، دونوں کے محرکات وعوامل ایک دوسرے کے ضد، مقاصد اور نتائج اور فرد و جماعت، معاشرہ اور انسانی سوسائٹی پر اثرات بالکل علیحدہ اور مختلف ہیں۔

زکوٰۃ کی روح خدا کا خوف اور اطاعت، اس کی رضاجوئی، فقراء کے حال پر غمخواری دل کی نرمی، اخلاص اور اغراض سے آزادی ہے جبکہ سود کی روح خدا کی معصیت، اس کے ساتھ اعلان جنگ، دل کی سختی، حد سے بڑھی ہوئی حرص، مال سے عشق اور مال کے ذریعہ سے اس کی نسل بڑھانے[2] کی کوشش، غرباء کی ضرورتوں اور ان کے فقر وضعف سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی خواہش ہے، زکوٰۃ کا نتیجہ اور اس کا نفسیاتی

---

[1] مسند احمد [2] اسلئے کہ سود خوار کا مال، مال کو پیدا کرتا ہے اور بغیر کسی محنت و تجارت کے دولت آفرینی کا سلسلہ جاری رکھتا ہے، زیادہ صاف الفاظ میں ایک ہی جگہ پڑے پڑے انڈے بچے دیتا رہتا ہے،

اثر یہ ہے کہ اس سے ایمان بڑھتا ہے انشراح قلب، صفائی نفس، کرم و شرافت اور سخاوت و فیاضی کے جذبات کو قوت حاصل ہوتی ہے، سودی کاروبار کا نتیجہ یہ ہے کہ اس سے انقباض، دل کی سختی، روح کی کثافت، اخلاق کی پستی، انسانی گوشت اور انسانی آبرو کے ساتھ سفاکانہ طرز عمل، آبروریزی، دوسروں کی کمزوریوں سے لطف اندوزی اور سوسائٹی کے کمزور عناصر سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے،

زکوٰۃ کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس سے ہمدردی و غمخواری کی روح عام ہو جاتی ہے، معاشرہ کے افراد میں خوشحالی نظر آنے لگتی ہے، مالوں میں برکت ہوتی ہے، دلوں میں الفت پیدا ہوتی ہے، ایک دوسرے پر اعتماد اور بھروسہ کی فضا قائم ہوتی ہے، سود کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ذخیرہ اندوزی اور معاشرہ کے افراد کی کوششوں سے جمع شدہ مال ایک فرد یا چند افراد یا ایک محدود ترین ادارہ اور جماعت کے ہاتھوں میں محصور ہو جاتا ہے، مہاجن کی مثال اس معاشرہ میں ایک ایسے چھوٹے حوض کی ہے جہاں سارے شہر کی دولت کھنچ کھنچ کر جمع ہوتی رہتی ہے یا مقناطیس کے اس پہاڑ کی طرح جس کا ذکر سندباد جہازی کے قصہ میں آپ نے پڑھا ہوگا کہ جب اس کی کشتی طوفان میں گھر کر کسی اور جگہ نکل گئی تو ملاح نے اچانک رونا شروع کیا جب اس سے سبب پوچھا گیا تو اس نے بتایا کہ یہاں سے قریب ایک مقناطیس کا پہاڑ ہے وہاں پہونچ کر یہ ساری کیلیں کھنچ کر علٰحدہ ہو جائیں گی اور کشتی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر غرق ہو جائے گی، اسی طرح یہ مہاجن اور سودی کاروبار کرنے والے بھی اپنے پاس ایک مقناطیس (سرمایہ) رکھتے ہیں اور یہ مقناطیس زندگی کی کشتی کی ان ساری کیلوں کو کھینچتا رہتا ہے جو اس کے تختوں کو جوڑتی ہیں اور ایک کو دوسرے سے وابستہ رکھتی ہیں، چنانچہ یہ اجزاء بالآخر جدا ہو جاتے ہیں، زندگی کا گرم و سرخ اور صحتمند خون ضائع ہو جاتا ہے معاشرہ ایک ایسے اخلاقی اور معاشی تپ دق میں مبتلا ہو جاتا ہے جس سے شفایابی اس کو پھر کبھی حاصل نہیں ہوتی، وہ ہمیشہ مدقوق، مفلوج، معطل، محروم اور غمزدہ نظر آتا ہے یہاں تک کہ اس کا مکمل زوال ہو جاتا ہے۔

غور کیا جائے تو نظر آئے گا کہ سود کے نتائج صرف یہ ہیں، افراد کے درمیان کشاکش معاشرہ میں باہمی اعتماد کا فقدان، بد گمانی اور تاریک پہلو دیکھنے کی عادت، سودی کاروبار کرنے والوں کے درمیان رسہ کشی، فقراء و غرباء کا استحصال، اور دو بالکل علیحدہ اور نمایاں طبقوں کا وجود جن میں سے ایک بنی نوع انسان میں سے سمجھا جاتا ہے اور دوسرا جانوروں، کتوں اور بلیوں کی قسم سے، پہلا طبقہ امراء و اغنیاء کا طبقہ کہلاتا ہے اور دوسرا فقراء و غرباء کا' یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں سود کی جس قدر مذمت کی گئی ہے اور اس کی جتنی مکروہ تصویر پیش کی گئی ہے اور اس کی مذمت میں جتنے سخت اور وعیدوں سے بھرے ہوئے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اتنی تعریف زکوٰۃ کی نہیں کی گئی ہے، غلط عقائد، منکرات و فواحش اور اخلاق ذمیمہ کی مذمت میں قرآن مجید کا اسلوب زیادہ تر یہی ہے جو اس لئے سود کے سلسلہ میں اختیار کیا ہے' یہ وہ اسلوبِ بیان ہے جس سے انسان کے رونگٹے کھڑے ہونے لگتے ہیں، اور معلوم ہوتا ہے کہ دل سینہ سے نکل آئے گا،

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۝ [1]

اے ایمان والو اللہ سے ڈرو، اور جو کچھ سود کا بقایا ہے اسے چھوڑ دو، اگر تم ایمان والے ہو، لیکن تم نے ایسا نہ کیا تو خبردار ہو جاؤ جنگ کیلئے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے، اور اگر تم توبہ کر لو گے تو تمہارے اصل اموال تمہارے ہی ہیں، نہ تم (کسی پر) ظلم کرو گے نہ تم پر (کسی کا) ظلم ہو گا۔

اس لئے سود خوار کی جو تصویر کھینچی ہے، اس سے ایک مومن کے دل میں نفرت و کراہت خود

---

[1] سورہ بقرہ ــــــ ۲۷۸ - ۲۷۹ -

پیدا ہونے لگتی ہے:

اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰی فَلَهٗ مَا سَلَفَ وَاَمْرُهٗٓ اِلَی اللّٰهِ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ ع

جو لوگ سود کھاتے رہتے ہیں وہ لوگ نہ کھڑے ہو سکیں گے سوا اس کے کہ جیسے وہ کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان نے جنون سے خبطی بنا دیا ہو، یہ سزا اس لئے ہوگی کہ وہ کہتے ہیں کہ بیع بھی سود ہی کی طرح ہے، حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے، پھر جس کسی کو نصیحت اس کے پروردگار کی طرف سے پہونچے گی اور وہ باز آگیا تو جو کچھ پہلے ہو چکا وہ اس کا ہو چکا اور اس کا معاملہ اللہ کے حوالہ رہا، اور جو کوئی پھر عود کرے تو یہی لوگ دوزخ والے ہیں اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

قرآن مجید نے سود اور صدقات کا موازنہ کئی جگہ کیا ہے اور ان دونوں کے آثار و نتائج ایسے معجزانہ جملوں میں بیان کئے ہیں جن کی تشریح و تفصیل کیلئے درحقیقت ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے اور جن کو صحیح طور پر سمجھنے کیلئے علم الاقتصاد اور سود خوار ملکوں اور اقوام کی معاشی و ذہنی حالت کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے،

اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے،

یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی الصَّدَقٰتِ

اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے اور

لے سورہ بقرہ۔ ۲۷۵

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ[1] ○ — اللہ کسی کفر کرنے والے گنہگار کو دوست نہیں رکھتا،

دوسری جگہ ارشاد ہے،

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَاۡ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ[2] ○

اور جو کچھ تم اس غرض سے دوگے کہ لوگوں کے مال میں پہنچ کر زیادہ ہوجائے سووہ اللہ کے آگے ...... نہیں بڑھتی اور تم جو صدقہ دوگے جس سے اللہ کی رضا طلب کرتے ہوگے تو ایسے ہی لوگ عنقریب بڑھاتے رہیں گے،

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی زکوٰۃ اور صدقات کی تعریف فرمائی ہے اور مسلمانوں کے مال میں اسکی وجہ سے جو خیر و برکت ہوتی ہے اس کا ذکر کیا ہے (وہ احادیث جن میں مال میں برکت اور صدقہ کرنے والے کے ساتھ اللہ تعالےٰ کی مدد کا بیان ہے اوپر گزر چکی ہیں) اور اسی کے ساتھ زکوٰۃ نہ ادا کرنے والوں کو دنیا میں فوری سزا اور ابتلا کی سخت وعید بھی سنائی ہے، بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کوئی قوم زکوٰۃ دینا چھوڑ دیتی ہے تو اللہ تعالےٰ اس کو خشک سالی اور قحط میں مبتلا کردیتا ہے[3]،

اسی طرح سودی کاروبار کرنے والوں کو دنیا وآخرت دونوں جگہ سخت سزا اور عذاب کی وعید ہے" حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب کسی قوم میں سود کا عام رواج ہوجاتا ہے تو وہ قحط میں مبتلا کردی جاتی ہے، اور جب کسی قوم میں رشوت عام ہوجاتی ہے تو وہ رعب میں گرفتار ہوجاتی ہے[4]، یہ بھی ارشاد فرمایا کہ "اللہ تعالےٰ لعنت بھیجتا ہے سود لینے والے اور دینے والے اور اس کو لکھنے اور صدقہ نہ دینے والے پر[5]"،

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس رات مجھے آسمان پر لے جایا گیا میرا گزر ایک ایسی جماعت پر ہوا جن کے پیٹ گھر کی طرح تھے اس میں سانپ تھے جو باہر سے

---

[1] سورہ بقرہ۔ ۲۷۶ [2] سورہ روم۔ ۳۹ [3] اوسط طبرانی [4] مستدرک ونسائی [5] ایضاً

نظر آتے تھے، میں نے پوچھا کہ جبریل یہ کون لوگ ہیں؟ انھوں نے کہا کہ یہ سود خوار ہیں[۱]"

یہ بھی ارشاد فرمایا کہ "جب اللہ تعالےٰ کسی کو تباہ کرنا چاہتا ہے تو اس میں سود عام کر دیتا ہے[۲]"

اگر کوئی شخص اسلامی معاشرہ کی تاریخ، اس کے اخلاقی پہلو، احکام شرعیہ کا اجراء، اوامر الٰہیہ کی تنفیذ اور اس میں خیر و برکت، امن و اطمینان، خوش حالی اور فارغ البالی کا جائزہ لے گا، جو احکام شرعیہ کے نفاذ کی برکت سے پیدا ہوئی تھی نیز اس تنگی و دشواری اور پریشان حالی پر بھی ایک نظر ڈالے گا جو شریعت کے ترک اور فرائض کے تعطل کے نتیجہ میں اسلامی معاشرہ پر چھا گئیں تو وہ ان احادیث نبوی کی تصدیق کرنے پر مجبور ہوگا، جو ابھی اوپر گزری ہیں،

اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے،

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ[۳]

نیک عمل جو کوئی بھی کرے گا مرد ہو یا عورت بشرطیکہ صاحب ایمان ہو تو ہم اسے ضرور ایک پاکیزہ زندگی عطا کریں گے اور ہم انھیں ان کے اچھے کاموں کے عوض میں ضرور اجر دیں گے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے،

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى[۴]

جو کوئی میری نصیحت سے اعراض رکھے گا سو اس کے لئے تنگی کا جینا ہوگا اور قیامت کے دن ہم اسے اندھا اٹھائیں گے۔

قانون زکوٰۃ میں اسلامی اصلاحات

اسلام نے جس طرح دوسرے ارکان مثلاً نماز روزہ اور حج میں مختلف اصلاحات کی ہیں اسی طرح اس نے

---

[۱] روایت احمد و ابن ماجہ [۲] کنز العمال ج ۲ ص ۲۱۳ روایت حضرت ابوہریرہؓ [۳] سورہ نحل - ۹۷ [۴] سورہ طٰہٰ - ۱۲۴

زکوٰۃ میں بھی اپنا اصلاحی کردار ادا کیا ہے، یہ اصلاحات زکوٰۃ کے قانون اور اس کے احکام کے تمام انفرادی اور اجتماعی مصالح پر حاوی ہیں اور تحریف وفساد کی ان تمام آلائشوں سے پاک ہیں جن میں گذشتہ قومیں اور تحریف شدہ مذاہب ملوث نظر آتے ہیں،

قدیم مذاہب میں صدقہ وزکوٰۃ کا تصور

جو شخص علمی اور قانونی طریقۂ کار کا عادی اور حدود وقوانین، فقہی احکام، اور اسلامی شریعت کے قانونی تفصیلات سے باخبر ہے وہ جب قدیم مذاہب میں زکوٰۃ کا متعین، واضح اور مفصل قانون کو تلاش کرنا چاہتا ہے تو اس کو بڑی ناکامی اور مایوسی ہوتی ہے، وہ دیکھتا ہے کہ ان مذاہب میں زکوٰۃ وصدقات کا قانون چند مختصر اور منتشر ضابطوں یا احکام پر مشتمل ہے جن کو اخلاقی وروحانی نصائح یا ہدایات کہنا زیادہ صحیح ہوگا، ان کی شکل فقہی احکام اور قانونی تفصیلات سے زیادہ عام دینی مشوروں کی سی ہے جن میں کوئی متعین اور واضح حکم مشکل ہی سے ملتا ہے، طویل جستجو کے بعد بھی اس کو اس فریضہ کے سلسلہ میں صرف چند بنیادی مباحث ہاتھ لگتے ہیں اور ایک دھندلی تصویر سے زیادہ کوئی چیز اسکی گرفت میں نہیں آتی،

مثلاً اگر وہ جاننا چاہتا ہے کہ زکوٰۃ کس شخص پر اور کن چیزوں پر واجب تھی اس کا نصاب کیا ہے، زکوٰۃ کن لوگوں کو دی جاتی تھی، اس کی کم سے کم مقدار کیا تھی، اس کا مستحق کون تھا؟ تو اس کو ان سوالوں کا بہت کم تشفی بخش جواب ملتا ہے، اس کے مقابلہ میں حدیث وفقہ کی کتابوں میں ان سوالوں کے ہر ہر جزو کا تشفی بخش جواب موجود ہے اور اس کی تفصیلات اور تحقیقات میں ایک پورا کتبخانہ تیار کیا جا چکا ہے،

ہم کو اس نئی اور مختلف صورت حال سے سابقہ اسلام کے علاوہ ہر مذہب میں پیش آتا ہے اور اسکی وجہ سے عبادت ومعاملات اور فقہ واحکام میں اسلام اور دوسرے مذاہب کے تقابلی مطالعہ میں خاصی دشواری پیش آتی ہے،

پھر بھی ہم دنیا کے تین قدیم وعظیم مذاہب (ہندو مذہب، یہودیت وعیسائیت) میں صدقہ وخیرات

کے تصور اور اُس کے اُس نظام کو پیش کرنے کی کوشش کریں گے جو ان مذاہب کے فضلا ریا غیر جانبدار مغربی محققین کی کتابوں میں پیش کیا گیا ہے،

صدقہ وخیرات ہندو مذہب میں

ہم سب سے پہلے مذاہب واخلاق کے انسائیکلوپیڈیا کے فاضل مقالہ نگار (ASGEDEN) کے اس مضمون کا خلاصہ پیش کرتے ہیں، جس میں ہندو مذہب میں صدقہ وخیرات کے تصور وعقیدہ اس کے انواع واقسام اس کے طریقۂ عمل اور مختلف ادوار میں اس کی تاریخ کا جائزہ لیا گیا ہے یہ بڑی حد تک ایک مستند اور محققانہ کوشش ہے جس میں صرف اصل نظریات وضوابط پیش کئے گئے ہیں اور کسی قسم کی تنقید وموازنہ اور اپنی طرف سے نتائج نکالنے سے احتراز کیا گیا ہے مقالہ نگار لکھتا ہے،

"خیرات (دان) ہندوؤں کے نزدیک ایک مذہبی فرض ہے اور کئی اہم اعتبارات سے اصول وعمل دونوں ہی میں مغرب کے تصور خیرات سے مختلف ہے، ازراہِ ہمدردی وترحم غربا اور مساکین کو ہدیہ دینے کا تصور ہندو دھرم میں مفقود ہے، لیکن فیاضی کی رسم جتنی ہندوستان میں عام ہے شاید اور کہیں نہیں ہے، علاوہ ازیں یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ فقیروں اور درویشوں کی بڑی بڑی جماعتیں ہندوستان کی طرح بلا روک ٹوک ادھر ادھر اسی وقت گھوم سکتی ہیں جبکہ ان کو یقین ہو کہ ان کی ضروریات ہر جگہ پوری ہوں گی اور یہ وہیں ہو سکتا ہے جہاں کہ ایسے فرض کو عمومی طور پر تسلیم کیا جاتا ہو اور اس پر عمل بھی ہوتا ہو، منو کا بھی کہنا ہے کہ اس دورِ کلجگ میں صفت فیاضی مخصوص ہے اور سب کا فرض ہے، لیکن اس خیرات کے پانے والے (مستحقین) صرف برہمن اور درویشوں کی مخصوص جماعتیں ہی سمجھی گئی ہیں، سماج کی دوسری تمام جماعتوں سے امداد اور ہدیہ دکشنا..... حاصل کرنے کا انھیں کو حق ہے اور ان عطیوں کا ثواب دان دینے والے کو عطیوں کی مقدار کے مطابق ملتا ہے،

اسی طور پر ہندوستان میں خیرات کا ایک مذہبی مقصد ہوتا ہے یعنی بعد کی زندگی میں[1] جزائے خیر اور ذاتی فائدوں کا حاصل کرنا، ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کی تعلیم اوران کے اصول بے لوث فیاضی، داد و دہش کیلئے کوئی مقام نہیں دیتے، لیکن اس معاملہ میں اکثر ہنود اپنے مذہب سے بالاتر ہیں، خیرات کے مغربی تصور سے ملتا جلتا عمل صرف درویشوں کی چند جماعتوں میں ملتا ہے جو کہ اپنے وقت کا کچھ حصہ غربا کی امداد اور کار خیر میں صرف کرتے ہیں، اس میں شک نہیں کہ درویشوں کے اس عمل میں بدھ مذہب کی نیک اور کریمانہ تعلیمات کا اثر موجود ہے، تیوہاروں اور یاتراؤں (زیارتوں) کے خاص مواقع پر مٹھ (خانقاہ) کے بڑے پجاری (منتظم) تمام زائرین کی ضیافت کرتے ہیں اور خرچ کا مطلق خیال نہیں کرتے، لیکن ان صورتوں کا بنیادی تصور ہندوستانی ہے نہ کہ مغربی، یا عیسائی، فی الحقیقت درویشوں کو فیاضی کا عہد کرنا پڑتا ہے جو کچھ اور نہ دے سکیں تو انھیں اپنی کتابیں ہی بطور خیرات دینی چاہئیں، لیکن بالعموم فقیر اور درویش دیتے نہیں بلکہ لیتے ہیں، لیکن عوام اور غیر برہمن آبادی میں خیرات کی ضرورتوں اور مواقع کو بڑی حد تک ذاتوں اور مشترکہ خاندانوں کے رواجوں سے پورا کیا جاتا ہے (یعنی مختلف مواقع پر خیرات لازمی ہوتی ہے) جہاں کہ فرد کا بار پوری جماعت پر ہوتا ہے،

ویدوں کی مقدس دعاؤں کے زمانہ میں بھی دان اور دکشنا (خیرات) کا تصور شعراء کے ذہن میں ایک مقام رکھتا تھا، خیرات کرنے والے کا ثواب اور اس کے علوشان کا بار بار ذکر آتا ہے، ویدک لٹریچر میں بالعموم اور زمانۂ اخری کی سمرتیوں خصوصاً دھرم شاستروں اور پرانوں میں گھر بار والوں پر جو فرائض عائد کئے گئے ہیں ان میں خیرات کا مقام بلند رکھا گیا ہے اور ان لوگوں کی تفصیلات بیان کرنے میں بہت احتیاط برتی گئی ہے (اگرچہ ان پر اتفاق نہیں) جن کو یہ خیرات ملنی چاہئے، منو نے اس مسئلہ پر باقاعدہ اور واضح قوانین مرتب کئے

---

[1] یہاں پر یاد رکھنا چاہئے کہ آواگون (تناسخ) کا عقیدہ ہند و مذاہب کا مشترک اور بنیادی عقیدہ ہے۔

ہیں جو کہ ہندو رسم و رواج (متعلق خیرات) پر آج بھی اثر انداز ہیں (علاوہ ان صورتوں کے جہاں کہ ہندو رسوم نے یوروپین یعنی مغربی اثرات کو قبول کیا ہے) اس خیرات کو دھرم شتھان،...... یعنی مذہبی ثواب حاصل کرنے کے لئے وسائل بتلایا گیا ہے سکنڈ پرانٹر.... کا ایک مکمل باب اصول خیرات ہی پر ہے اور ہمادری.... نے اپنی بڑی تصنیف کا نصفِ آخر اسی مسئلہ کیلئے وقف کیا ہے،

اس طرح تمام ہندو درویش خیرات ہی پر گذر کرتے ہیں، مغرب میں اسی قسم کی جماعتیں بڑی مشقت اور قربانی کی زندگی بسر کرتی ہیں اسکے برخلاف ہندو درویش اپنی روزی محنت سے نہیں کماتے اور نہ کما سکتے ہیں بلکہ ان کو دوسروں کی خیرات کا محتاج رہنا پڑتا ہے، یہ تنظیم اور وسیع پیمانے پر بھیک مانگنے کی رسم ہندوستان میں از منۂ قدیم سے چلی آتی ہے اور ادھر اُدھر گھومنے والے بھکاریوں کی فوج کا بار (جبکہ وہ خود کچھ نہیں کماتے) پوری آبادی کے غریب طبقات پر ہمیشہ ایک بڑا بار رہا ہوگا،

برہمن دھرم ہی سے بدھ مذہب نے بھی فریضۂ خیرات کا تصور ورثہ میں پایا، انھوں نے مذہب کی خدمت کیلئے اپنی زندگی وقف کر دینے والوں کیلئے داد و دہش کے فریضہ کے قدیم اصول کو ترقی دے کر زیادہ منظم بنایا اور اس کی بنیادوں کو وسیع کیا

شاکیہ مُنی (یعنی خود بودھ جی) کسی پچھلی زندگی میں دان شُور..... فیاضی کے ہیرو رہ چکے تھے، اس لئے ایسی رسم و رواج بدھ مت کے اخلاقی اور سماجی نظام میں کوئی نئی چیز نہ تھے، جین دھرم نے بھی (جو کہ از منۂ قدیم کی برہمن دھرم سے اختلاف کرنے والی دوسری بڑی جماعت تھی) اگرچہ برہمنوں کے خیرات حاصل کرنے کے غیر معمولی استحقاق کو رد کیا، لیکن درویش اور ریاضت میں مصروف فرد کے بار کو عوام پر عائد کیا ہے، ان دونوں

صورتوں میں (یعنی بودھ اور جین) میں سے کسی نے بھی کوئی نیا اصول وضع نہیں کیا بلکہ ایک قدیم رسم (خیرات) کو مذہب کے سکھانے والوں اور درویشوں کی جماعتوں کیلئے تسلیم کیا اور اس کو جاری رکھا،

اس قسم کے عطیات بالعموم دو قسم کے ہوا کرتے تھے، پہلی صورت تھی جائدادوں (مکانات وعمارات) کا وقف کر دینا یا دیہاتوں کی آمدنی کو خیرات کے لئے وقف کرنا یا آمدنی کا عشر (دسواں حصہ) خیرات میں دینا، اس کے علاوہ دوسری صورت میں تیوہاروں، سالانہ تقاریب اور خاندانی رسوم کے موقعوں پر برہمنوں کو نقد اور خوراک کی شکل میں غیر معمولی آمدنی ہو جاتی تھی، اسی ضمن میں وہ سازوسامان کا دان بھی آجاتا ہے جو کہ گھومنے والے بھکاری جاہل دیہاتیوں کے کورانہ عقائد اور ڈر کی بنا پر حاصل کر لیتے تھے،

مہادان (خیرات کبیر) دس سے سولہ تک تھیں، ان میں سب سے اہم سونا تھا اس کے بعد عمارتیں، گاؤں کی آمدنی وغیرہ، سونے کی خیرات میں سب سے زیادہ قیمت والا اور اسی لئے سب سے زیادہ ثواب رکھنے والا، تلا پروشں تلادان .... تھا معطی (دان دینے والا) اپنے آپ کو سونے میں تلواتا تھا، پھر یہ سونا مجتمع برہمنوں پر تقسیم کر دیا جاتا تھا، کہا جاتا ہے کہ بارہویں صدی میں قنوج کے ایک راجا نے یہ قیمتی دان سو بار کیا، دوسری مثال متھلا Mithila (بہار کی ایک قدیم چھوٹی سلطنت) کے وزیر کی ہے جس نے چودھویں صدی کے آغاز میں یہی عمل کیا، چینی سیاح ہوئن سیانگ (Hiuen Tsang) نے شاہ قنوج سِشلا دتیہ (یعنی ہرش وردھن) کی دادودہش کا عجیب وغریب بیان دیا ہے، وہ ہر پانچویں سال اپنی جملہ ملکیت کو تمام وکمال خیرات میں دے ڈالتا تھا، اسی قسم کی مسرفانہ خیرات میں کبھی کبھی زیادہ قیمتی دھات (سونے) کی بجائے

چاندی کا استعمال کیا جاتا تھا، جنیو (زنار) کی رسوم کے سلسلہ میں بھی سونے سے بنی ہوئی گائے یا کنول کا پھول ایک اہم حیثیت رکھتا تھا، رسم کے خاتمہ پر اس کو توڑ ڈالا جاتا تھا اور ٹکڑے برہمنوں پر تقسیم کر دیے جاتے تھے یا سندر کو دیدیے جاتے تھے، شاہی اور مالدار میزبان اسی طرح کبھی کبھی مہمانوں کو سونے چاندی کے وہ ظروف بھی دے ڈالتے تھے جو کہ دعوت میں استعمال ہوئے ہوں، درویشوں کے مٹھوں (خانقاہوں) کو اور برہمنوں کو دیہی علاقوں کے یا مالگزاری کے دان دیے جانے کا رواج ہندوستان میں قدیم زمانہ سے چلا آتا ہے، اشوک کے قدیم کتبوں میں بھی اس کا ذکر موجود ہے اور روایات کے بموجب اسی شہنشاہ کو اس کی آخری زندگی میں اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو مسرفانہ فیاضی سے برباد کر لینے سے قریب قریب بزور روکا گیا، ایسے عطیات اور وقف آج بھی زیادہ غیر معمولی نہیں ہیں، برہمنوں کو کھانا کھلانا بڑے ثواب کا کام سمجھا جاتا ہے اور برہمنوں کی تعداد جتنی زیادہ ہو اتنا ہی افضل کار ثواب گردانا جاتا ہے کسی قدر کم پیمانے پر ہر خاندانی تقریب، برسی یا دعوت کے موقع پر بھی کیا جاتا ہے، اور بڑے بڑے تیوہاروں کے موقع پر اس خیرات کا وسیع انتظام کیا جاتا ہے اور یاتریوں اور درویشوں کی بڑی بڑی جماعتوں کی کئی کئی دن تک ضیافت کی جاتی ہے، اس سلسلہ میں اُشَوَ دَاتْ..... کی مثال دی جاتی ہے جس کے ایک غار کے کتبہ سے (جو کہ پہلی صدی کا سمجھا گیا ہے) معلوم ہوتا ہے کہ اسکو اس امر پر بڑا فخر تھا کہ وہ سالانہ ایک لاکھ برہمنوں کی ضرورتوں کو پورا کرتا تھا، اور ایک لاکھ گایوں کا اور نیز سولہ گاؤں، سیر و تفریح گاہوں اور تالاب وغیرہ کا دان کرتا تھا، ازمنۂ قدیم میں اکثر ایسے بادشاہوں کا ذکر آتا ہے جو متعدد برہمنوں کو عرصۂ دراز تک، یا عمر بھر پالتے تھے یورپ کے دور وسطیٰ (Middle Ages) کے مٹھوں (خانقاہوں) کی طرح ہندوستان میں بھی درویشوں کی جماعتیں دیہی ملکیت اور دیہاتوں کی جائدادوں سے مالا مال رہتی تھیں، کبھی کبھی

سلطنت کی آمدنی اور ملکیت کا بڑا حصہ ان کے ہاتھ میں آجاتا تھا،

شمالی ہندوستان میں، باقاعدہ خیرات دہی یعنی مقرر عطیات یا آمدنی کا دسواں حصہ درویشوں کی جماعتوں یا منفرد گروہ (معلم) کیلئے جو کہ کسی مکتب خیال کا مسلّم پیشوا ہو، جنوبی ہندوستان کی بہ نسبت بہت کم ہے، واقعہ یہ ہے کہ شمالی ہندوستان میں مذہبی پیشواؤں کا زیادہ اثر نہیں ہے، جنوبی ہند میں مقررہ رقوم وصول کی جاتی ہیں اور قانونی کارروائی اور زبردستی کے علاوہ ایسے رقوم وصول کرنے کے لئے اور سب ممکن ذرائع استعمال کیئے جاتے ہیں، یہ مذہبی پیشوا اپنے اپنے علاقہ کے خاص خاص شہروں میں دورہ کرتے ہیں اور ان دوروں کے وقت معین اور مسلم عطیات طلب کرلئے جاتے ہیں، مذہبی اداروں کے باقاعدہ عطیوں کی شکل جنوبی ہندوستان میں جائدادوں کی آمدنی کا وقف ہے، یہ صورت شمالی ہندوستان میں اس درجہ نہیں ہے، اسی آمدنی سے ان اداروں میں مستقل طور پر رہنے والے درویشوں اور پجاریوں کا خرچ پورا ہوتا ہے، ان خیرات اور صدقات دینے والے لوگوں کے مقصد اور نیت کا جہاں تک تعلق ہے تو وہ بڑی حد تک وہی ہوتی ہے جو کہ تیوہاروں کے موقعوں پر اور دیہات کی عام خیرات کے مواقع پر (لوگوں کی) ہوتی ہے،

انفرادی خیرات کے لئے ایک قاعدہ مقرر تھا کہ کسی کو خیرات کرتے وقت اتنا نہ دے ڈالنا چاہیئے کہ اس کے بیوی بچے محتاج ہو جائیں، دوسرے قواعد کی بموجب یہ مقرر تھا کہ گئودان ہزار گائیوں سے زیادہ کا نہ ہو، دوسرے عطیات کا بھی تعین کر دیا گیا تھا، نیز یہ کہ جس عطیہ کو ایک (برہمن) نے لینے سے انکار کر دیا ہو اس کو دوسرا بھی نہ قبول کرے، نیز یہ کہ جس روز کوئی عطیہ دیا جائے اسی روز اس کو کسی کو نہ دیدیا جائے، مستحقین خیرات کی بھی باقاعدہ تفصیل بہ اعتبار استحقاق کر دی گئی تھی، ان میں سے کچھ کو خیرات دینا نہ صرف ممنوع بلکہ گناہ سمجھا جاتا تھا، اصولاً ہر اونچی ذات والے ہندو کا فرض ہے کہ جب وہ معینہ مدت تک گھر بار کی زندگی

بسر کر چکے اور اس کے ایک لڑکا ہو جائے جو کہ اس کی نسل کو جاری رکھ سکے تو اس کو اپنی جملہ ملکیت برہمنوں کو دان کر دینا چاہیئے، اور خود بے گھر اور بے سامان ہو کر جنگل میں وان پرستھ .... کی زندگی بسر کرنی چاہیئے اور اس کے بعد اسکو سنیاسی ہو جانا چاہیئے، سنیاسی ہونے کی صورت میں اپنی خوراک کے لئے اس کو در در بھیک مانگنا چاہیئے، ایسے درویش بالعموم کوئی شئے بطور ملکیت نہیں رکھتے، ان کے پاس صرف ناریل یا کسی دہات کا بنا ہوا ایک کاسۂ گدائی، ایک پانی کی چھاگل اور کبھی کبھی ایک ڈنڈا اور ایک مالا ہوتی ہے، دور حاضر میں بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ با اثر اور دولتمند لوگوں کی ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ انھوں نے سب کچھ ترک کر کے زندگی کے آخری حصہ کو غریبی اور مذہبی مراقبہ کے لئے وقف کر دیا، اور جماعت اور عام انسانوں کی خیرات پر زندگی گذاری،

ہندوؤں میں خیرات کی اور شکل بھی (از منۂ قدیم سے) چلی آتی ہے، وہ یہ کہ گئوشالوں .... کے لئے عطیے دیئے جائیں، اور یہ ادارے کہیں کہیں بہت قدیم ہیں، بنارس اور دوسری جگہوں پر بھی، بیمار، لولی لنگڑی گایوں کو کھانا اور پناہ مہیا کی جاتی ہے جس کیلئے نیک اور پرہیزگار لوگ فیاضی سے چندے دیتے ہیں اور ایمان والے روزانہ کچھ نہ کچھ پیش کرتے ہیں ہندوستان میں اس قسم کی خیرات مجموعی طور پر بہت زیادہ ہوگی[۱]"

اس مقالہ سے قارئین کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ صدقہ و خیرات کے اس وسیع نظام میں جو ہندوستان کے وسیع سے وسیع تر رقبہ اور تاریخ کے طویل سے طویل تر دور میں رائج رہا ہے، برہمنوں کو مرکزی مقام اور دائرہ میں نقطہ کی حیثیت حاصل رہی ہے اور یہ سارا نظام ان کے گرد گردش کرتا رہا ہے، برہمنوں کے بعد درویشوں اور

ل۱ Encyclopaedia of Religion and Ethics Vol. III - Charity (Almsgiving) (Hindu)

تارک الدنیا سنیاسیوں کا نمبر آتا ہے اس طرح (بلا ارادہ بلا قصد سہی) ہندو معاشرہ میں ایک ایسے طبقہ کا نشو ونما ہوتا ہے جس کی بسر اوقات اور جس کا تمام تر انحصار اس کے ہم مذہب لوگوں کے عطیات، مذہبی خیرات اور جذبۂ فیاضی پر رہ جاتا ہے، فطرت انسانی اس سے جو غلط فائدہ اٹھاتی ہے اور اس سے جو اخلاقی کمزوری پیدا ہوتی ہے، دوسروں کی محنتوں پر تکیہ کرنا، مفت خوری اور بیکاری، کاہلی اور آرام طلبی، اور اس سے پیدا ہونے والی جو خرابیاں رونما ہوتی ہیں، ان کا تصور کرنا کچھ مشکل نہیں، یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس مذہبی نظام میں (خواہ اس کو دورِ انحطاط کی خصوصیت سمجھ لیا جائے) خیرات لینا اور خیرات کرنا نہ صرف محمود بلکہ تزکیہ نفس کیلئے ایک حد تک ضروری خیال کیا جاتا تھا، اس کے نتیجہ میں ہندوستان کے بعض مذاہب میں دریوزہ گری یعنی دروازہ دروازہ جاکر بھیک مانگنے اور اس سے اپنا پیٹ بھرنے کو مستقل عبادت اور اصلاح نفس کا ایک موثر ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ اور خاص طبقوں کیلئے اسکو روزمرہ کے فرائض میں شامل کیا گیا ہے بھکشوؤں MONKS کا یہ طبقہ ان ممالک میں جہاں بدھ مذہب والوں کی غالب اکثریت ہے بہت نمایاں طریقہ پر دیکھا جا سکتا ہے۔ برما میں ہر غیر ملکی سیاح کو یہ چیز اپنی طرف خصوصیت کے ساتھ متوجہ کرتی ہے[1] اس طبقہ کی روز افزوں تعداد، ملک کی آبادی کے ایک طبقہ کو یکسر معطل ہوجانے کے مسئلہ اور اس کے اخلاقی حالات نے وہاں کی سماجی زندگی میں بہت سی مشکلات اور پیچیدگیاں پیدا کردی ہیں۔

اسی طرح سے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ اس نظام اور ان مذہبی تعلیمات وہدایات میں تنظیم اور تعین کا وہ اہتمام نہیں پایا جاتا جو سامی مذاہب میں تقریباً مشترک ہے ان مذاہب میں عبادات سے لے کر رسوم تک انتخاب کی وہ آزادی اور مقامی حالات کی رعایت اور ایسی لچک رکھی گئی ہے کہ ہندوستان کے ایک حصہ کا ضابطۂ حیات اور مذہبی نظام دوسرے حصہ کے ضابطۂ حیات اور مذہبی نظام سے اتنا مختلف ہو کر رہ گیا ہے کہ اس پر ایک ہی مذہب کا اطلاق

---

[1] مصنف کتاب نے سنہ ۱۹۶۰ء میں جب برما کا سفر کیا اور اس کو رنگون، مانڈلے اور بعض دوسرے اہم مقامات پر قیام کا موقعہ ملا تو اس نے کثیر التعداد بھکشوؤں، اور ان کے روزمرہ کے معمولات کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا اور دریوزہ گری کے وہ مناظر دیکھے جن کو وہ فراموش نہیں کر سکتا،

مشکل ہو جاتا ہے،

صدقہ وخیرات یہودی مذہب میں

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ سیرۃ النبی (جلد پنجم) میں "زکوٰۃ گذشتہ مذاہب میں" کے عنوان کے ماتحت لکھتے ہیں:۔

"زکوٰۃ بھی ان عبادات میں سے ہے جو تمام آسمانی مذاہب کے صحیفوں میں فرض بتائی گئی ہے، لیکن ان کے پیرووں نے اس فرض کو اس حد تک بھلا دیا تھا کہ بظاہر ان کے مذہبی احکام کی فہرست میں اس کا نام بھی نظر نہیں آتا، حالانکہ قرآن پاک کا دعویٰ ہے اور اس کی تائید مختلف آسمانی صحیفوں سے ہوتی ہے کہ جس طرح نماز ہر مذہب کا جزء لاینفک تھی اسی طرح زکوٰۃ بھی تمام مذاہب کا ہمیشہ ضروری جزء رہی ہے، بنی اسرائیل سے خدا کا جو عہد تھا، اس میں نماز اور زکوٰۃ دونوں تھیں،

اَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ (البقرہ - ۸۳)

ہم نے بنی اسرائیل سے اقرار لیا کہ قائم کیجیو نماز اور دیتے رہیو زکوٰۃ

لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَآتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ ۔ (مائدہ - ۱۲)

اے بنی اسرائیل اگر تم قائم رکھتے نماز اور دیتے رہتے زکوٰۃ۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذکر میں ہے،

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ اِسْمَاعِيلَ اِنَّهُ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُولًا نَّبِيًّا وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهُ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهِ مَرْضِيًّا (مریم - ۵۴ - ۵۵)

اور قرآن میں اسماعیل کا ذکر کر بیشک وہ وعدہ کا سچا تھا اور وہ خدا کا بھیجا ہوا پیغمبر تھا اور وہ اپنے لوگوں کو نماز اور زکوٰۃ کی تاکید کرتا تھا اور وہ اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ تھا،

حضرت عیسیٰؑ کہتے ہیں۔

وَأَوْصَانِي بِالصَّلوٰةِ وَالزَّكوٰةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ○ (مریم - ۳۱)

اور خدا نے مجھکو زندگی بھر نماز پڑھنے اور زکوۃ دینے کی تاکید کی

توراۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل پر زمین کی پیداوار اور جانوروں میں ایک عشر یعنی دسواں حصہ (احبار - ۲۷ - ۳۰ - ۳۲) نیز ہر بیس[۲۰] برس یا اس سے زیادہ عمر والے پر خواہ امیر ہو یا غریب آدھا مثقال دینا واجب تھا، (خروج - ۳۰ - ۱۳ - ۱۵) ساتھ ہی غلہ کاٹتے وقت گرا پڑا اناج کھلیان کی منتشر بالیں اور پھل والے درختوں میں کچھ پھل چھوڑ دیتے تھے جو مال کی زکوۃ تھی اور یہ عملاً ہر تیسرے سال واجب الادا ہوتی تھی، یہ رقم بیت المقدس کے خزانہ میں جمع کی جاتی تھی اسکا ساٹھواں حصہ مذہبی عہدہ دار پاتے تھے، دسواں حصہ حضرت ہارون کی اولاد (لاویین) قومی خاندانی کاہن ہونے کی حیثیت سے لیتی تھی اور ہر تیسرے سال میں دسواں حصہ بیت المقدس کے حاجیوں کی مہمانی کیلئے رکھا جاتا تھا[۱]، اسی مد سے عام مسافروں، غریبوں، بیواؤں اور یتیموں کو روزانہ کھانا پکا کر تقسیم کیا جاتا تھا، اور نقد آدھے مثقال والی زکوۃ کی رقم جماعت کے خیمہ (یا مسجد بیت المقدس) اور قربانی کے ظروف و آلات کی خریداری کے خرچ کے لئے رہتی تھی، (خروج ۳۰ - ۱۶ - ۳۸ - ۲۶)[۲]"

ہندوستانی مذاہب کے مقابلہ میں یہودی مذہب میں جو انبیاء کی تعلیمات پر ہر دور میں کسی نہ کسی درجہ میں مبنی رہا ہے اور جس پر آرین نسل کے مذاہب کے مقابلہ میں نبوت کا زیادہ عرصہ تک سایہ رہا ہے، خیرات وصدقات کے بارے میں اسلامی تعلیمات اور اقدار سے زیادہ مماثلت پائی جاتی ہے، ہندو مذہب کے مقابلہ میں (جس کی ہدایات

۱؎ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم مضمون "خیرات" Charity "باب یہودیوں میں خیرات"

۲؎ تورات (خروج ۳۰ - ۱۶ اور ۳۸ - ۲۶)

وتعلیمات کا خلاصہ اوپر گذر چکا ہے) یہودیوں کی مقدس کتابوں میں مفت خوری اور خیرات پر گذارا کرنے کو بنظر استحسان نہیں دیکھا گیا ہے اور نہ اس کی ہمت افزائی کی گئی ہے، بلکہ اس کے برخلاف غرباء کے طبقہ میں خود اعتمادی، خودداری پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، بنسرا (Bensira) کا کہنا ہے، ایک غریب انسان کا اپنی گھاس پھوس کی جھونپڑی میں رہنا دوسرے شخص کے مکان کے آرام وآسائش سے کہیں بہتر ہے، دربدر پھرنا ایک بڑی خرابی ہے (Sira 22-24-29) زکوٰۃ وخیرات کے فضائل اور اس کے دنیوی واخروی منافع کے متعلق بھی جو کچھ کہا گیا ہے، وہ اسلامی تعلیمات سے زیادہ قریب ہے خیرات کی انواع واقسام کی کثرت، اس کے تصور میں وسعت، اور ہر اس چیز پر اس کے حاوی ہونے کا عقیدہ جو کسی دوسرے آدمی کیلئے راحت رساں اور مسرت بخش ہو اسلامی تعلیمات اور قرآن وحدیث کی ہدایات سے مشابہ نظر آتا ہے، ان تعلیمات میں انسانی جذبات کی رعایت اور نازک احساسات کی جھلک بھی نظر آتی ہے، جن کا اعلیٰ وارفع نمونہ اسلامی تعلیمات میں نظر آتا ہے ابوتھ (Aboth 1-5) کے بیان کے مطابق زکوٰۃ وخیرات کا فرض انسانی معاشرہ کے ارکان میں سے ایک ہے، نیز اس کی بھی تعلیم دی گئی ہے کہ غریب کو بھی خیرات دینی چاہیئے،

یہودی تعلیمات کے مطابق خیرات دہندہ کو اپنی آمدنی کا دسواں حصہ (عشر) خیرات میں دینا لازمی ہے، لیکن پانچویں حصہ سے زیادہ خیرات نہ دینا چاہیئے، مبادا خیرات دینے والا خود خیرات کا طالب ہونے پر مجبور ہو جائے (Kethuboth 50 A) خیرات کے حصول میں بوقت ضرورت حکومت کی مداخلت کی بھی اجازت دی گئی ہے، Kethuboth 19 B) میں ہے "بخیل لوگ جو کہ خیرات دینے سے انکار کریں یا جو اپنی حیثیت کے مطابق خیرات نہ دیتے ہوں ان کو حکام کی طرف سے مجبور کیا جائے، اور اگر ضرورت ہو تو مجرم کو مارا جائے یہاں تک کہ وہ حکم کی تعمیل کرے"، اس طرح سے اسلام کی تعلیم کی طرح خیرات دینے والے کے خاندان کو اس سے مستفید ہونے کا حق دیا گیا ہے، ان کو اس کا زیادہ حقدار بنایا گیا ہے، حدیث نبوی ہے: "ابدأ بمن تعول"[۵]

---

[۵] صحیح بخاری

(خرچ میں ان سے آغاز کرو جو تمہاری پرورش میں ہیں) (Babamezia) میں ہے خیرات سے سب سے پہلے خاندان کو مستفید ہونا چاہیئے، اول والدین، پھر بھائی بہن، اس کے بعد اپنی بستی کے غریبوں کی باری آتی ہے، اس کے بعد دوسری بستیوں کے رہنے والے،

خیرات یہودیوں اور غیر یہودیوں کو یکساں طور پر دی جا سکتی ہے، (Giltin 61 A) قیدیوں کو فدیہ دے کر رہا کرانے کا فرض بخشش و خیرات کے دیگر اعمال سے افضل ہے (Bababathra 88) خیرات دیتے وقت خیرات پانے والے کی خودداری کا بھی لحاظ رکھا جائے (Shabbath 63 A) ترش روئی سے غریبوں کو فیاضی سے دینا ثواب عمل کو ضائع کر دیتا ہے[۱] (Bababathra 98)

"انسائیکلوپیڈیا آف ریلجن اینڈ ایتھکس[۲] میں ہے کہ: "تلمودی دور میں غرباء کی امداد کا اعلیٰ نظم موجود تھا، اس کی خصوصیات روزانہ کھانے کی تقسیم اور ہفتہ وار نقدی تقسیم تھی، دونوں کاموں کیلئے ایسے ہی دو تین ایماندار آدمی جن پر کسی کو شک نہ ہو جماعت سے لازمی چندہ لیا کرتے تھے، اور اس کا اہتمام تین اور افراد کے ہاتھ میں ہوتا تھا جو کہ سائلین کے استحقاق کی جانچ کرتے تھے، (Bababathra 8 A) ان کا فرض تھا کہ غریبوں اور مسکینوں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے اپنے فرائض انجام دیں (Kethuboth 6 B) یہ دونوں تقسیمیں بہت بعد تک قائم رہیں،

(Maimlocuit 9-3) دور وسطیٰ میں دیندار یہودی اپنی شریعت کے مقرر کئے ہوئے عشر پر احتیاط کے ساتھ پابند رہتے تھے، دور وسطیٰ کے یہودی معاشرہ میں بھیک مانگنے کی رسم بہت ہی شاذ تھی لیکن سترہویں صدی میں یہ رسم بے حد بڑھی، اور نا قابل برداشت برائی بن گئی، پیشہ ور بھکاری (Schnurrer) ہر یہودی

---

[۱] قرآن شریف میں ہے:۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَ الْاَذٰى (اے ایمان والو اپنے صدقوں کو احسان (رکھ کر) اور اذیت (پہنچا کر) باطل نہ کر دو، سورہ بقرہ۔ ۲۶۴)

[۲] ملاحظہ ہو:۔ (Encyclopaedia of Religion and Ethics Vol. III by Morris Joseph).

جماعت میں عام ہو گئے اور نہایت نفرت انگیز اور تکلیف دہ معلوم ہونے لگے۔ ایسے پیشہ ور بھکاریوں کی گستاخانہ خیرات طلبی کی ایک لازوال تصویر (Zangwill) کی کتاب (King of Sinowet) سائلوں کا بادشاہ میں ملتی ہے۔ لیکن دور حاضر کے مہذب ممالک کے یہودیوں کی خیراتی تنظیم نے پیشہ ور بھکاریوں کے پیشہ قریب قریب فنا کر دیا۔

اسلامی تعلیمات سے اس جزئی مماثلت کے باوجود جس کے کچھ نمونے ہم نے اوپر پیش کئے ہیں، اسلام کے نظام زکوٰۃ و صدقات سے ایک بڑا فرق یہ ملتا ہے کہ یہودیوں میں بھی صدقات قبول کرنے اور اس کا انتظام کرنے والا ایک مذہبی گروہ پایا جاتا ہے جس کی بنیاد خاص نسل و نسب۔ اور اکابر سے انتساب پر ہے اور یہ منصب موروثی اور نسلی ہے۔ یہودی مصنف (G. F. Moore) اپنی کتاب (Judaism) میں لکھتا ہے:

> "اس تنظیم (مذہبی امور کے لئے ٹیکس کی وصولیابی) کا بنیادی اصول، یہود کے بنیادی قانون میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ زرعی پیداوار کا عشر قوم لاوی (لاویین) کو دیا جائے اور اس کا عشر دینی پیشواؤں کو دے"۔

اس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا جو ایسے مستقل اور موروثی طبقوں، اور گروہوں کے پیدا ہو جانے پر نکلا کرتا ہے یعنی حد سے بڑھی ہوئی حرص۔ استحصال بالجبر، اور دوسروں کی حق تلفی (G. F. Moore) جی ایف مور لکھتا ہے:۔

> "۶۶ء (یہودی) کی بغاوت سے پہلے بڑے بڑے اونچے یہودی علماء طاقتور آدمیوں کی جماعت بھیج کر عشر کو خرمن ہی سے زبردستی وصول کر لیتے تھے اور ان چھوٹے مذہبی پیشواؤں کو جو خاص طور پر اس کو اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے۔ زدوکوب کرتے تھے"۔[۱]

اس مذہبی فرض کی ادائیگی میں یہودیوں کی مستعدی اور سرگرمی اور احساس ذمہ داری کا کیا حال تھا، اور

---

[۱] Jos. Ant. XX 83-181, 9. 2-206 F

کہاں تک اس مذہبی فریضہ پر یہودیوں کے مختلف ادوار حیات میں عمل درآمد ہوتا رہا، اس کا اندازہ مذکورہ بالا مصنف کی اسی کتاب کے ایک اقتباس سے ہوگا:۔

"غالباً عشر کی ادائیگی اس مذہبی ٹیکس کے ادا کرنے والے کے ضمیر پر چھوڑ دی گئی ہے، تجربہ بتلاتا ہے کہ ٹیکس دہندہ پر ادائیگی کے فرض کا اعتماد بہت ہی ناقابل اطمینان رہا ہے جوڈیا (Judea) کے اس چھوٹے سے علاقہ میں بھی جو کہ ایران کی حکومت میں تھا، ٹیکس کی ادائیگی کا یہ خود ارادی طریقہ ناکام رہا، اس لئے (Neh 10-33 ff) کے ضابطہ سے یہ انتظام کیا گیا کہ زراعت پیشہ جماعتوں سے عشر وصول کرنے کے لئے لاوی قوم کے لوگ کسی مذہبی پیشوا کو لے کر جائیں (Neh 7-38) یہ تدبیر بھی کامیاب نہ ہوئی کیونکہ (Neh 13-10) میں لکھا ہے کہ عشر ادا نہیں کیا جاتا تھا، اس لئے قوم لاوی کو معبد چھوڑ کر علٰحدہ جانا پڑا تاکہ وہ اپنی زمین جوت کر روزی حاصل کر سکیں (Mal 3-8 f)

آگے چل کر وہ لکھتا ہے:۔

"یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ کسان کو مذہبی واجبات کے ادا کرنے کے سلسلہ میں .... بہت ہی ناقابل اعتماد سمجھا گیا ہے، اس سلسلہ میں بہت ہی دیندار کسان بھی قوانین مذہب کے مقابلہ میں اپنے آباؤ اجداد کے عمل کو زیادہ قابل قبول گردانتے تھے، ان کے نزدیک پرانی روایت مدارس کے فتوے، اور قانون کی تشریحات سے کہیں زیادہ وزنی سمجھی جاتی تھی"

آگے چل کر لکھتا ہے:۔

"مذہبی رہنماؤں کو اس عام غفلت سے سخت فکر و پریشانی رونما ہوئی، لیکن مذہبی قوانین پر عمل کرانے کی جملہ مساعی کم و بیش ناکام ہی رہیں، اس سلسلہ میں معمولاً افراد کی غفلت ولاپرواہی انفرادی ہی نہ تھی، جس کا وہ خود خدا کے سامنے جوابدہ ہوتا، خدا کے حصہ کی

یہ لوٹ ایک قومی جرم بن چکی تھی، جس کی سزا کل قوم کو بھگتنا پڑی، اللہ کی مہربانی اور برکت دوبارہ حاصل کرنے کے لئے قوم کو مکمل طور پر اپنے عمل میں اصلاح کرنا تھی"

Mal, 3, 8–12. Midrash Tebelhoron Islam S 1–3.

اسی عشر (مذہبی ٹیکس) سے غفلت یہود کی جلاوطنی کا ایک سبب بنی"

مزید یہ کہ:۔

"اس میں شک نہیں کہ مذہبی پیشواؤں نے پرزور نصیحت اور ہدایات کے ذریعہ اپنی قوم کو بتلایا کہ خدا کو دھوکا دینا، اور عشر ادا نہ کرنا کس قدر بڑا گناہ ہے لیکن ان کو اس اصلاح میں کامیابی نہ ہو سکی"[۱]

یہودی علماء اور مورخین کی ان شہادتوں کو سامنے رکھ کر نیز اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ یہودی اپنی تاریخ کے تقریباً ہر دور میں ایک دولتمند، اور سرمایہ دار قوم رہی ہے، جس نے عام طور پر ساہوکارہ، سودی لین دین، اور دولت آفرینی کے دوسرے ذرائع سے بڑی فراخ دلی سے کام لیا ہے، اور عام طور پر وہ اپنی ہنرمندی، صناعی، اور کاروباری صلاحیت میں ممتاز رہی ہے، قرآن مجید کی ان آیات پر غور کرنا چاہئے۔ جن میں ان کے بخل، خست، مالی حقوق کی ادائیگی میں ان کے لیت و لعل، سخن پروری و حیلہ سازی اور ایسے مطالبوں کے موقعوں پر ان کے گستاخانہ کلمات کا ذکر کیا گیا ہے۔

ایک موقعہ پر فرمایا گیا ہے:۔

لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَقَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ

بیشک اللہ نے ان لوگوں کا قول سن لیا ہے جنھوں نے کہا ہے کہ اللہ مفلس ہے اور ہم مالدار ہیں، ہم ضرور ان کے کہے ہوئے کو لکھ کر رہیں گے اور اسکے ناحق قتل

---

[۱] Judaism Vol. II

G. F. Moore (Prof. History of Religion) Harvard University U. S. A.

وَنَقُولُ ذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ ۝ [۱] — انبیاء کو بھی اور کہیں گے کہ (اب) آگ کے عذاب کا مزا چکھو

ایسی ہی اجتماعی ضرورتوں' اور ایثار و فیاضی کے مطالبہ کے موقعہ پر انھوں نے جھنجھلا کر یہ گستاخانہ کلمات بھی کہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا کو اپنے بندوں کی کار برآری کرنے میں کوئی مجبوری پیش آرہی ہے (اور معاذاللہ کسی نے اس کے ہاتھ باندھ دئے ہیں) اس لئے مخلوق سے مدد لینے کی ضرورت پیش آگئی ہے۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللَّهِ مَغْلُولَةٌ غُلَّتْ أَيْدِيهِمْ وَلُعِنُوا بِمَا قَالُوا بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَاءُ ۝ [۲]

اور یہود کہتے ہیں کہ خدا کا ہاتھ بند ہوگیا ہاتھ ان ہی کے بند ہوں! اپنے اس کہنے سے یہ ملعون ہوگئے، اللہ کے تو دونوں ہاتھ خوب کھلے ہوئے ہیں، وہ جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔

قرآن مجید سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حجاز کے یہود نے جو ملک کی دولت کے سب سے بڑے حصہ پر قابض اور تجارت پر حاوی تھے، زکوٰۃ کی ادائیگی' اور صدقہ و خیرات کے کاموں میں ہمیشہ کوتاہی سے کام لیا، قرآن مجید کہتا ہے:۔

"وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِنْكُمْ وَأَنْتُمْ مُعْرِضُونَ ۝ [۳]

اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ عبادت نہ کرنا (کسی کی) بجز اللہ کے، اور حسن سلوک سے پیش آنا (اپنے) ماں باپ سے اور قرابت داروں اور یتیموں اور محتاجوں (سے بھی) اور لوگوں سے (بالعموم) بھلی بات کہنا، اور نماز قائم رکھنا، اور زکوٰۃ دیتے رہنا

---

[۱] سورہ آل عمران ۔ ۱۸۱، کتب تفسیر میں ہے کہ جب آیت "مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا" نازل ہوئی تو یہودیوں نے اسکے جواب میں یہ کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا رب اب محتاج ہوگیا ہے اس لئے صدقہ، خیرات اور قرض مانگتا ہے (ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر وغیرہ)

[۲] سورہ مائدہ ۔ ۶۴ [۳] سورہ بقرہ ۔ ۸۳

. . . . پھر تم (سب اُن احکام سے) پھر گئے بجز تم میں سے

. . . . (معدودے) چند کے، اور تم ہی ہو گردن کش،

صدقہ وخیرات عیسائی مذہب میں

چونکہ حضرت مسیحؑ اپنے پیروؤں کیلئے کوئی مستقل اور مفصل قانون، اور شریعت موسویہ کے متوازی کوئی شریعت لے کر نہیں آئے، ان کا کام چند ترمیمات، اور اصلاحات تک محدود تھا[۱]، اور ان کی اصل تبلیغ ودعوت یہودیوں کی حد سے بڑھی ہوئی ظاہر داری اور رسم پرستی کے مقابلہ میں عبودیت واخلاص کی سچی روح، محبت الٰہی اور انسان دوستی کا زندہ جذبہ، اور ظواہر واشکال میں حقیقت کا جلوہ پیدا کرنا تھا، اس لئے دوسرے ارکان مذہب، اور زندگی کے شعبوں کی طرح خیرات وصدقات کیلئے بھی انھوں نے کوئی مستقل قانون ونظام پیش نہیں کیا جو یہودی شریعت اور توراۃ کے احکام کے بالمقابل مستقل ضوابط اور قوانین پر مشتمل ہو، انھوں نے اسی سابقہ نظام میں صرف حقیقت وروح، خلوص وصداقت، محبت الٰہی واخوت انسانی کا احساس زندہ کرنے کی کوشش کی، یہی وجہ ہے کہ ہمیں عیسائیت کے مذہبی لٹریچر، اور "کلیسا" کی رہنمائی اور ہدایات میں خیرات وصدقات کا کوئی مفصل اور واضح ضابطہ، اور کوئی منضبط اور مرتب قانون نہیں ملتا، جو کچھ بھی ملتا ہے اس کی حیثیت محض اخلاقی ہدایات اور پند ونصائح کی ہے،

انجیل (عہد جدید) میں خیرات کا کیا درجہ ہے، اس کے متعلق حضرت عیسیٰؑ کی بنیادی تعلیمات، ہدایات اور ذاتی جذبات کیا تھے، یہ تصور بعد کے کلیسائی عہد میں کس درجہ قائم رہا، اور اس پر مسیحی دنیا میں کہاں تک

---

[۱] قرآن شریف میں حضرت عیسیٰؑ کے بیان میں آتا ہے:۔

"وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَلِأُحِلَّ لَكُم بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُم بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ٥" سورۃ العمران۔ ۵۰

اور میں تصدیق کرنے والا ہوں اپنے سے پیشتر آئی ہوئی توریت کی اور (اس لئے آیا ہوں) کہ تم پر جو کچھ حرام کر دیا گیا تھا اس میں سے تم پر کچھ حلال کر دوں اور میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کے ہاں سے نشان لیکر آیا ہوں سو تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

عمل درآمد کیا گیا، مذاہب و اخلاق کے انسائیکلوپیڈیا کے مسیحی مقالہ نگار نے اس کا اجمالی جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے،

"حضرت عیسیٰؑ نے اپنے پہاڑی کے وعظ میں، اور دوسرے موقعوں پر خیرات دہی کے فریضہ کو اتنے ہی عزم و خلوص سے بیان کیا ہے، جیسا کہ علمائے یہود کیا کرتے تھے، ان کے پیروؤں کیلئے بھی خیرات دینا ضروری ہے، لیکن ان کی خیرات خلوص قلب سے محض کار خیر کے ارادہ سے ہونا چاہئے، (ہر عیسائی اپنی ذات کو اتنا ہی کامل کرنا چاہتا ہے جتنا کہ" ان کا باپ" جو کہ آسمان پر ہے کامل تھا) اس کی نیت میں خود نمائی، ستائش طلبی یا ذاتی فروغ کا شائبہ مطلق نہیں ہونا چاہئے (Mt. 6-ff.) ایسے ہی اس وعظ میں جو لوقا کی انجیل میں درج ہے خیرات کے احکام زیادہ واضح ہیں۔

"دو اور تم کو دیا جائیگا، جو تم سے سوال کرے اسکو دو، اور جو تمہارا اسباب لے جائے اس سے واپس نہ مانگو، اپنے دشمنوں سے بھی محبت کرو، انکو قرض دو اور نا امید نہ کرو، تمہارا انعام بہت بڑا ہوگا، اور تم اس ارفع و اعلیٰ ذات کے فرزند بن جاؤ گے، کیونکہ وہ ناشکر گزار اور بدآئین کے ساتھ بھی مہربانی کرتا ہے، (Luke 6. 30-35)

حضرت عیسیٰؑ نے جس کی تعلیم دی اس پر عامل بھی ہوئے (بلکہ اس سے زائد کر دکھایا) انھوں نے اپنی نبوت کا بہت سا وقت لوگوں کی تکالیف کے دور کرنے میں صرف کیا، عوام کی خدمت کی، اور جن کو شیطان نے ستا رکھا تھا ان کو اچھا کیا، کیونکہ اللہ ان کے ساتھ تھا۔ (AC 10-38)

تاہم ہمکو یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ حضرت مسیحؑ ایک کٹر در بہی خواہ انسانیت تھے، جیسا کہ انھوں نے کہا ہے کہ انسان کو پہلے" خدا کی سلطنت" اور راست روی کا خواہاں ہونا چاہئے، اور دوسری چیزیں (یعنی دوسری صفات حمیدہ) اپنے آپ شامل ہوتی جائیں گی، دوسروں کی امداد کرتے

وقت (حضرت عیسیٰ نے فرمایا کہ) ان کی روحوں کی حفاظت کا خیال ان کے جسم کی حفاظت سے بالاتر ہونا چاہیئے، وہ خود بھی لوگوں کا علاج کرتے ہوئے، یا ان کو مدد دیتے ہوئے ان کی فوری امداد کے مقابلہ میں ان کی دائمی ترقی (روح) کا زیادہ خیال رکھتے تھے، ایک دوسری بات بھی ہے جسکو ذہن نشین رکھنے کی ضرورت ہے، وہ یہ ہے کہ ہمارے آقا (حضرت عیسیٰ) نے امداد باہمی کی بنیاد اس تعلق کو گردانا ہے، جو کہ تمام انسان اپنے پروردگار کے ساتھ رکھتے ہیں، یہی تعلق ان کو بھائی بھائی بنادیتا ہے، اور اس طرح چونکہ سب انسان اصلاً ایک ہی گروہ کے افراد ہیں، اس لئے سب کا فرض ہے، کہ (ایک ہی اللہ کے بندے کی بنیاد پر) ایک دوسرے کی مدد کریں،

سینٹ پال نے فرمایا ہے کہ تم آقائے (نامدار) کی طرح ایک دوسرے کے بوجھ اٹھاؤ، اور اس طرح حضرت عیسیٰ ع کے قانون پر عامل رہو (Gal. 62) لیکن یہ امر بالکل بیّن ہے کہ جہاں تک فیاضی اور خیرات دہی کا تعلق ان اعلےٰ مقاصد، اور علوئے نیت سے ہے وہاں خود نمائی اور فخر کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی،

اب ہم یہ دیکھیں کہ حضرت عیسیٰ کی تعلیم اور ان کی ذاتی مثال نے ان کے سب سے پہلے پیرووں اور شاگردوں کو کہاں تک متاثر کیا، یوم (Penta Cost) کو روح کے باہر نکال لانے کے فوری نتیجہ کے طور پر ایک ایسا اشتراکی نظام رونما ہوا، جو کہ لوگوں نے اپنی مرضی سے قائم کرلیا، اور جس میں کہ جماعت کے مال دار افراد نے اپنا کل (یا قریب قریب کل) مال اپنے غریب پڑوسیوں کی ضرورت کی فراہمی میں صرف کردیا، (AC 2, 44-45) ہر ایک نے تو اپنا کل مال فروخت نہیں کیا، جن کے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ نہ تھا وہ تو اپنی ہی ضرورتوں کو پورا کرتے رہے، لیکن جن کے پاس ضرورت سے زائد تھا انھوں نے اسکو فروخت کرکے یا اسی طرح جماعت کی بہبودی کے لئے صرف کردیا، (4, 34-35)

ایسی عالی شان خیرات ظاہر ہے کہ زیادہ دنوں قائم نہیں رہ سکتی تھی، Anania اور Saphira. - کی مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جذبۂ (خدمت) جو کہ ہونا چاہیئے تھا، اکثر مصنوعی ہوتا تھا، اور شاید وہ تمام خرابیاں جو کہ سست اور ناکارہ لوگوں کی امداد کا نتیجہ ہوا کرتی ہیں، کلیسائے یروشلم میں بھی نمودار ہو گئیں، اور سینٹ پال کی تہدید سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خرابیاں دوسرے کلیساؤں میں بھی پیدا ہو گئی تھیں، (2 Th. 3. 10ff.)

اگرچہ ابتدائی دور کی خیرات اس شاندار طور پر اس وقت قائم نہ رہ سکی، جبکہ پہلا جوش و خروش ختم ہو گیا تاہم خیرات دہی قائم رہی، اور وہ تمام عیسائی گرجاؤں کی ایک مابہ الامتیاز خصوصیت بنی رہی، بلکہ کلیسا کی خصوصیت رہی، جبکہ نئے عیسائی بھائیوں نے سینٹ پال کو اپنا دست راست برائے یگانگت پیش کیا، تو یہ بات خاص طور پر طے ہوئی، کہ غریبوں کا لحاظ رکھا جائے گا (خواہ وہ غیر عیسائی ہی کیوں نہ ہوں) یہ اصول وہ تھا جو کہ سینٹ پال خود بھی قائم رکھنا چاہتے تھے، (Gal. 210) اسی مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے اور اس طور سے یہودیوں اور دوسرے غیر عیسائیوں کے الگ الگ گرجاؤں کو ایک ساتھ لے آنے کے لئے سینٹ پال نے مقدونیہ اور (Achai) کے گرجاؤں کو بڑی احتیاط سے منظم کیا، اور خیرات کے چندوں کو جمع کیا گیا، اور اس یکجائی فنڈ کو یروشلم کے مذہبی خدام کے پاس پہونچانے کی خدمت خود سینٹ پال نے سنبھالی، اگرچہ اس کام میں دوسرے گرجاؤں کے نمائندے بھی شامل رہے

(2 CO. 8-9.)

ہفتہ وار چندہ کا حکم جو کہ انھوں نے اس موقعہ پر نافذ فرمایا تھا، غالبًا ہفتہ وار چندے کی اس رسم کی بنیاد بن گیا جو کہ مختلف گرجاؤں میں عمومًا قائم رہی اور ہمارے زمانہ میں بھی اکثر گرجاؤں میں قائم ہے،

خیرات دہی اور غریبوں پر رحم کرنے پر دوسرے عیسائی برگزیدہ رہبروں نے سینٹ پال سے کچھ کم زور نہیں دیا ہے، سینٹ جیمس نے پرزور الفاظ میں اس ظلم و تعدّی کو برا کہا ہے، جو کہ زردار لوگ غریبوں پر کرتے رہتے ہیں، (Ja. 51-6 - 26) لیکن مذہبی خدمات کے قانون کو انھوں نے اس طرح اجمالی شکل دی ہے:۔

اصلی مذہب جس پر خدا اور باپ کی نظر میں کوئی دھبہ نہیں، وہ یہ ہے،

"یتیموں اور بیواؤں کے پاس جانا، (ہمدردی کرنا) اور ان کے رنج و غم میں شریک ہونا اور اپنی ذات کو (تفخر و مباہات) سے پاک رکھنا۔ (1-27)

مکتوب بنام یہود کے مصنف نے اپنے مخاطبین کو مکتوب کے ختم کرتے ہوئے ایک عملی نصیحت ان الفاظ میں کی ہے، :۔

"نیکی کرنا اور تقسیم (خیرات) کو فراموش نہ کرو، کیونکہ انھیں قربانیوں سے خدا بہت خوش ہوتا ہے"

سینٹ جان نے اس فرض (خیرات دہی) کو انتہائی روشن، اور نمایاں طریقہ پر پیش کیا ہے انھوں نے انسانی خدمت کو جذبہ حب اللہ سے پیدا ہوتا ہوا بتلایا ہے، وہ فرماتے ہیں:۔

"جس کے پاس دنیا بھر کا سامان موجود ہے لیکن وہ اپنے بھائی کو ضرورت مند دیکھتے ہوئے اس کے ساتھ رحم کرنے سے گریز کرتا ہے تو اللہ کی محبت اس میں کیسے قائم رہ سکتی ہے"

اس طور پر ہم دیکھتے ہیں، کہ خود حضرت عیسیٰ ؑ کی تعلیم میں، اور ان کے اولین پیرووں کی تعلیم میں خیرات دہی اور غربا کی امداد کو عیسائی زندگی کا بنیادی فرض سمجھا گیا ہے، اور اس فرض کا فوری تعلق اس رشتہ سے ہے، جو کہ لوگ حضرت عیسیٰ ؑ کے واسطہ سے خدا کے ساتھ رکھتے ہیں، اور اس رشتہ کے تسلیم کر لینے کا فوری نتیجہ ہی (خیرات دہی

اور نیکی) ہے ۔[1]

اسلام کی اصلاحات

اسلام نے زکوٰۃ و صدقات کے نظام میں بہت سی ایسی بنیادی تبدیلیاں کیں جن کا معاشرہ کے اخلاقی نظام پر بہت گہرا اثر پڑا، اور انقلاب آفریں اثر پڑا، ہم ان میں سے خاص خاص اصلاحات اور تبدیلیوں کا ذکر کرتے ہیں،

مذہبی اور طبقاتی اجارہ داری کا خاتمہ

اس نے سب سے پہلے اس مذہبی اور خاندانی اجارہ داری کو ختم کیا جس سے ایک طرف خود اس اجارہ دار طبقہ کو نقصان پہونچ رہا تھا، اس کے اخلاق خراب ہو رہے تھے اور وہ ایسا آرام پسند اور عافیت کوش طبقہ بن گیا تھا جس کی صرف صدقات پر بسر اوقات تھی اور جو مفت کے مال کا (جو اس کو بلا محنت کے ہاتھ لگ جاتا ہے) عادی ہو گیا تھا، اور اس کیلئے شریفانہ اور قدرتی ذرائع معاش اختیار کرنے اور اپنے دست و بازو کو استعمال کرنے کی کوئی ضرورت نہیں رہی تھی اس کے رزق کی ضمانت وکفالت کی بنیاد صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ فلاں نبی کی اولاد میں ہے، فلاں گھرانہ اور فلاں خاندان سے تعلق رکھتا ہے یا موروثی طور پر فلاں مذہبی عہدہ پر فائز ہے، خواہ وہ اس سلسلہ میں اپنی کوئی ذمہ داری پوری نہ کرتا ہو، اس کی وجہ سے ایک ایسا پیشہ ور طبقہ وجود میں آگیا جو دین کا اجارہ دار بن کر اس کو اپنے مقاصد کے حصول کیلئے استعمال کرتا تھا اور ہر قسم کی اخلاقی بلندی، مردانگی، عزت نفس اور خود داری سے محروم تھا،

دوسری طرف اس سے ان فقراء و مساکین اور مستحقین زکوٰۃ کو بھی سخت نقصان پہونچ رہا تھا جن کے حقوق پامال ہو رہے تھے، اسلئے کہ ہر صدقہ کرنے والا قدرتی طور پر یہ چاہتا تھا کہ اس کا صدقہ اس شخص کو پہونچے جو کسی دینی منصب پر فائز ہو، اپنی رگوں میں انبیاء کا خون رکھتا ہو اور کسی شریف و اعلیٰ خاندان سے متعلق ہو، ہندوستان میں یہ بات سب سے زیادہ نمایاں تھی یہاں برہمن مندروں کے پروہت اور پنڈت ان صدقات پر پوری طرح قابض تھے اور ان محتاج اور مستحق لوگوں کا اس میں کوئی حصہ نہ تھا جو مقدس برہمنی خون نہ رکھتے

[1] Encyclopaedia of Religion and Ethics
W. A. Spooner.

تھے، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کو اتنا بھی میسر نہ تھا جس سے ان کی زندگی قائم رہتی، وہ دولت مندوں کی بے پرواہی برہمنوں اور پنڈتوں کی تعیش پسندی اور اس مخصوص مذہبی قانون کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ گئے تھے جس کی ذمہ داری آرین نسل پر سب سے زیادہ ہے

اس کے برعکس رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس مذہبی اور خاندانی اجارہ داری اور اجتماعی ناانصافی کا دروازہ ہمیشہ کیلئے بند کردیا، آپ نے بنی ہاشم پر جو خود آپ ہی .... کا خاندان ہے اور اسلامی تاریخ اور دینی جدوجہد کے میدان میں بھی بڑی فضیلت رکھتا ہے، زکوٰۃ حرام کردی اور بڑی قوت اور صراحت کے ساتھ اعلان کیا کہ "ان الصدقۃ لا تحل لنا" [1]، (صدقہ ہمارے لئے حلال نہیں ہے) آپؐ صدقات سے پورا پرہیز اور احتیاط فرماتے تھے، حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ "حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس جب کھانا لایا جاتا تو آپؐ اس کے متعلق دریافت فرماتے، اگر یہ کہا جاتا کہ یہ ہدیہ ہے تو کھاتے اور اگر یہ کہا جاتا کہ صدقہ ہے تو اس کو نہ کھاتے اور اپنے اصحابؓ سے فرماتے کہ تم کھالو" [2] آپ اپنے گھر والوں کو صدقہ وزکوٰۃ کا مال کھانے سے بہت سختی سے منع فرماتے تھے تاکہ ان کو اس کی عادت نہ پڑجائے اور مسلمان صدقہ کے لئے اسی خاندان کو مخصوص کرلیں اور دوسرے اس سے محروم ہوجائیں، حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ محسنؓ بن علیؓ نے صدقہ کا ایک کھجور اٹھا کر اپنے منہ میں رکھ لیا تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو تھوکو، اس کو پھینک دو، کیا تم کو معلوم نہیں کہ ہم لوگ صدقہ نہیں کھاتے" [3]

یہ حکم آپ کی زندگی میں بھی اور آپؐ کی زندگی کے بعد بھی اسی طرح نافذ رہا، آپ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ "صدقہ لوگوں کا میل کچیل ہے اور یہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) اور آل محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کیلئے جائز نہیں" [4] فقہ اسلامی میں یہ حکم برابر قائم رہا، اسلامی معاشرہ میں اس پر برابر عمل درآمد کیا جاتا رہا اور زکوٰۃ اور

---

[1] اصحاب سنن عن ابی رافع عن النبی صلے اللہ علیہ وسلم [2] شیخین [3] ایضاً

[4] مسلم روایت حضرت ابوہریرہؓ

صدقہ کا دروازہ عامۃ المسلمین اور فقراء و مستحقین کیلئے ہمیشہ کھلا رہا اور ان کے حقوق پوری طرح محفوظ رہے[۵۱]،

اپنے خاندان اور اقربا کے ساتھ آپ کا ہمیشہ یہی معاملہ اور طرز عمل تھا، وہ نقصان اور تاوان میں پیش پیش رکھے جاتے اور انعامات اور مالی فوائد میں ان کو کم سے کم حصہ دیا جاتا، جب سود حرام کیا گیا تو آپؐ نے سب سے پہلے اس قانون کو اپنے رشتہ داروں پر نافذ کیا، جب جاہلیت کا خون حرام کیا گیا تو آپؐ نے سب سے پہلے اپنے خاندان کے ایک نوجوان کا خون معاف کیا، حجۃ الوداع کے خطبہ میں صاف طور پر ارشاد فرمایا:۔

الا کل شئ من امر الجاھلیۃ تحت قدمی	یاد رکھو کہ جاہلیت کی ہر چیز میرے پیروں کے نیچے ہے
موضوع ودماء الجاھلیۃ موضوعۃ وان	میں جاہلیت کا خون ختم کرتا ہوں اور پہلا خون جو میں
اول دم اضع من دمائنا دم ابن ربیعۃ بن	معاف کرتا ہوں وہ ابن ربیعہ بن الحارث کا خون ہے
الحارث وکان مسترضعا فی بنی سعد	جنکو قبیلہ بنی سعد میں دودھ پینے کیلئے بھیجا گیا تھا[۵۲] اور ہذیل نے ان
فقتلتہ ھذیل، وربا الجاھلیۃ موضوع،	کو قتل کر دیا تھا، جاہلیت کا سود بھی میں ختم کرتا ہوں اور
وان اول ربا اضع من ربانا ربا عباس بن	پہلا سود جو میں معاف کرتا ہوں وہ عباس بن عبدالمطلب
عبدالمطلب فانہ موضوع کلہ الخ[۵۳]	کا سود ہے اب وہ سب ختم ہے،

اسی طرح جب زکوٰۃ فرض کی گئی تو اس کے باوجود کہ وہ رزق و آسائش کا ایک بڑا ذریعہ اور دروازہ تھا، آپ نے اس کو بنی ہاشم، اپنے اہل بیت اور اپنے پورے خاندان پر ہمیشہ کیلئے بند کر دیا، یہ درحقیقت تمام انبیاء و مرسلین کا طرز اور نبوت و رسالت کا خاصہ ہے اور اس میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو مقام محمود حاصل ہے،

زکوٰۃ کی ادائیگی میں واسطوں کی ضرورت نہیں

آپؐ نے زکوٰۃ دینے والوں اور لینے والوں کے بیچ سے وہ سارے واسطے ختم کر دیئے

---

۵۱ اس بحث کی تفصیل کے لئے جصاص نیز قاضی ابن العربی مالکی کی کتاب احکام القرآن کا مطالعہ کیا جائے۔

۵۲ عرب میں دستور تھا کہ باہر رہنے والے قبائل کی عورتیں شرفاء کے بچوں کو دودھ پلانے کیلئے لیجاتی تھیں ۵۳ روایت جابر بن عبداللہ (صحیح مسلم)

جو شریعت موسوی میں پائے جاتے تھے یعنی موروثی عالم یا بیت المقدس کے کارکن جن کا ذریعہ اختیار کئے بغیر اس فریضہ سے سبکدوش ہونا ممکن نہ تھا، اس چیز نے اس طبقہ میں مال کی حد سے بڑھی ہوئی محبت اور حرص و طمع پیدا کر دی اس نے اکثر و بیشتر اس سے ناجائز فائدہ اٹھانا شروع کر دیا اور بالآخر اس پر قابض ہو گیا،

قرآن مجید کہتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۗ وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ[1]

اے ایمان والو! اہل کتاب کے اکثر علماء و مشائخ لوگوں کے مال باطل طریقوں پر کھاتے (اڑاتے) رہتے ہیں اور لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتے رہتے ہیں اور جو لوگ کہ سونا اور چاندی جمع کر کر کے رکھتے ہیں اور اس کو خرچ نہیں کرتے اللہ کی راہ میں آپ انھیں ایک دردناک عذاب کی خبر سنا دیجئے۔

اللہ تعالیٰ نے جس طرح دوسری عبادات اور دینی فرائض سے ان واسطوں کو ختم فرما دیا تھا اسی طرح زکوٰۃ و صدقہ کیلئے بھی اس نے کسی وساطت اور ذریعہ کو باقی نہیں رکھا، مسلمان خود اپنے طور پر نماز پڑھ سکتا ہے، زکوٰۃ نکال سکتا ہے، روزے رکھ سکتا ہے اور حج کر سکتا ہے اس کے لئے اس کو صرف ان احکام سے واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے جن کے بغیر یہ ارکان ادا نہیں ہو سکتے، اگر نیت کی تصحیح ہو گئی ہو اور شرائط پورے کر لئے گئے ہوں تو پھر ایک مسلمان کو ان فرائض کی بجا آوری کے لئے کسی سہارے اور واسطہ اور کسی رسمی مذہبی طبقہ کی منظوری کی ضرورت نہیں ہے،

مستحقین زکوٰۃ کے حقوق میں اضافہ

ان چیزوں کے ساتھ ایک خصوصیت زکوٰۃ کو اور حاصل ہے اور وہ یہ کہ زکوٰۃ پر پہلے (جیسا کہ ہم ایک جگہ بیان

---

[1] سورہ توبہ - ۳۴

کر چکے ہیں) مختلف قسم کی پابندیاں تھیں، زکوٰۃ لینے والوں کو اس کا اختیار نہ تھا کہ اس کو جس طرح چاہیں استعمال کریں، اس کا ایک حصہ بیت المقدس کے حجاج کیلئے مخصوص تھا جو زیادہ تر ان کی ضیافت اور کھانے کے مصارف پر خرچ ہو جاتا تھا، شریعت اسلامی نے فقراء و مساکین اور زکوٰۃ کے مستحقین کو اس مال کا مالک بنا دیا اور ان کو اس کا حق دیا کہ وہ اس مال میں جس طرح چاہیں تصرف کریں، "للفقراء والمساکین والعاملین علیہا"[۱] میں لام اس پر دال ہے کہ وہ اس کو اپنی ضرورت و مصلحت کیلئے پوری آزادی کے ساتھ استعمال کر سکتے ہیں،

ان خوشگوار اور مفید اصلاحات نے زکوٰۃ کے اسلامی نظام کو ایک نہایت لطیف، ترقی یافتہ، جامع اور مکمل عبادتی اور اجتماعی نظام بنا دیا ہے جو تمام انفرادی و اجتماعی مصالح پر حاوی ہے[۵۲]،

اسلام میں زکوٰۃ کی اہمیت اور شرعی حیثیت

قرآن مجید میں نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا ذکر ..... ۸۲ مقامات پر آیا ہے[۵۳]، چنانچہ "اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ" سے پورا قرآن بھرا ہوا ہے، اس کے علاوہ مسلمانوں کے اوصاف جہاں جہاں بیان کئے گئے ہیں وہاں بھی ہیئتہ "یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ"[۵۴] آیا ہے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو اسلام کے بنیادی ارکان میں شمار فرمایا ہے، آپؐ کا ارشاد ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے، اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ دینا، حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا،

آپؐ سے پوچھا گیا کہ اسلام کیا ہے؟ آپؐ نے جواب دیا کہ اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، فرض نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور رمضان کے روزے رکھو[۵۵]، ضمام بن ثعلبہ کی حدیث میں

۱؎ اس "لام" کی بحث کے لئے احکام مذاہب اربعہ کی اصول فقہ کی کتابیں دیکھی جا سکتی ہیں ۵۲؎ اس بحث میں سیرۃ النبی (از مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ جلد پنجم سے استفادہ کیا گیا ہے ۵۳؎ مظاہر حق ترجمہ مشکوٰۃ از نواب قطب الدین خان دہلوی (۱۲۸۹ھ)

۵۴؎ سورہ مائدہ ــ ۵۵؎ شیخین روایت ابوہریرہؓ

ہے : انھوں نے ایک مرتبہ حضورؐ سے دریافت کیا کہ میں اللہ کی قسم دلا کر آپؐ سے پوچھتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ نے آپؐ کو اس کا حکم دیا ہے کہ آپؐ ہمارے اغنیاء سے زکوٰۃ حاصل کریں، اور فقراء میں تقسیم کردیں، آپؐ نے فرمایا کہ: ہاں بالکل"

اس موضوع پر احادیث اس کثرت سے ہیں کہ ان کا شمار کرنا مشکل ہے وہ حد تواتر تک کو پہونچ چکی ہیں اور امت کا اس پر اجماع ہے کہ زکوٰۃ نماز کے ساتھ لازم و ملزوم ہے اور صدیوں اور نسلوں سے برابر اس پر عمل ہو رہا ہے،

اللہ تعالےٰ نے نماز کے قیام اور زکوٰۃ کی ادائیگی کو اسلام کی صحت و قبولیت، اس کے احکام کی بجا آوری اللہ تعالےٰ کے ساتھ صلح اور مسلمانوں کے ساتھ اخوت کی علامت قرار دیا ہے،

قرآن مجید میں ہے،

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ[۱]

پھر اگر یہ توبہ کرلیں اور نماز پڑھنے لگیں اور زکوٰۃ دینے لگیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو، بیشک اللہ بڑا مغفرت والا ہے، بڑا رحمت والا ہے،

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِى الدِّيْنِ ؕ وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ[۲]

لیکن اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز کے پابند ہو جائیں اور زکوٰۃ دینے لگیں تو وہ تمہارے بھائی ہو جائیں گے دین میں، اور ہم آیتوں کو علم والوں کے لئے تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

بخاری و مسلم میں عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: مجھے

---

[۱] سورہ توبہ ـ ۵ [۲] ایضاً ـ ۱۱

حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ وہ گواہی دیں اس بات کی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) اس کے رسول ہیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں، اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو اپنے خون اور اپنے مالوں کو مجھ سے محفوظ کر لیتے ہیں، سوائے اسلام کے حق کے اور ان کا حساب اللہ پر ہے"۔

بخاری و مسلم اور نسائی میں حضرت ابوہریرہؓ سے یہ بھی مروی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ وہ اس بات کی گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میرے اوپر ایمان لائیں اور جو میں لایا ہوں اس کو قبول کریں، اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو وہ مجھ سے اپنی جانوں اور مالوں کو محفوظ کر لیتے ہیں مگر اس کے حق کے ساتھ، اور اس کا حساب اللہ پر ہے"۔

زکوٰۃ نظام کے ساتھ ضروری ہے

جس طرح نماز کا مزاج اور شرعی حیثیت یہ ہے کہ اس کو جماعت کے ساتھ ادا کیا جائے اسی طرح زکوٰۃ کا مزاج اور شرعی حیثیت یہ ہے کہ وہ پہلے بیت المال میں جمع کی جائے اور ان خلفاء و امراء[1] کے سپرد کی جائے جو اس کے منتظم و ذمہ دار ہیں۔

---

[1] مسلمان خلافت و امارت کا نظام قائم کرنے کے شرعی طور پر مکلف ہیں اور اس میں کوتاہی اور سہل انگاری ان کو گنہگار کر سکتی ہے، حدیث و فقہ کی کتابوں اور اسلام کی روح اور اس کے مقاصد کے صحیح فہم کا بھی یہی تقاضا ہے، اس موضوع پر حضرت شاہ ولی اللہؒ کی کتاب "ازالۃ الخفا" اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی کتاب "منصب امامت" کا مطالعہ بہت مفید ہوگا، پہلے کے مسلمان اس بات کے روادار نہیں تھے اور اس کو بہت بُری بات سمجھتے تھے کہ ان کا کوئی مختصر وقفہ بغیر خلافت و امارت کے گزر جائے، چنانچہ مسلمان مورخین جب کسی نئے سال کے آغاز کا ذکر کرتے ہیں تو اس طرح لکھتے ہیں کہ نیا سال شروع ہو گیا اور مسلمان ابتک بلا خلیفہ کے ہیں، اگر وہ اس زمانہ میں ہوتے اور اس طویل مدت کو دیکھتے جو بغیر خلافت و امارت ہی کے نہیں بغیر کسی احساس و تشویش اور فکر کے گزر رہی ہے تو ہمارے متعلق کیا رائے قائم کرتے؟

حضرت ابو بکرؓ کا موقف

زکوٰۃ کی یہ وہ حیثیت تھی جس کو چھوڑ کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم دنیا سے تشریف لے گئے آپؐ کے بعد آپؐ کے جانشین اور امین اور اس دین کے اسرار و مقاصد کو سب سے زیادہ سمجھنے والے اور اس کے لئے سب سے زیادہ غیرت و حمیت رکھنے والے حضرت ابو بکر صدیق رضؓ تھے، انھوں نے اس پر سنجیدگی اور قوت کے ساتھ اصرار کیا کہ "جو بیت المال کو زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کرے اس سے قتال کیا جائے"

حضرت ابو ہریرہؓ نے اس واقعہ کو بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور اس سلسلہ میں حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے درمیان جو اختلاف تھا اور جو بعد میں اتفاق سے تبدیل ہو گیا اس کا بھی تذکرہ کیا ہے چنانچہ حضرت عمرؓ نے اپنی رائے تبدیل کی اور حضرت ابو بکرؓ کی بالغ نظری، دقت فہم اور اس معاملہ میں ان کی غیرت و حمیت کا اقرار کیا وہ سب اس روایت میں موجود ہے، ہم وہ روایت یہاں نقل کر رہے ہیں[1]

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ جب حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی اور حضرت ابو بکرؓ خلیفہ ہوئے اور اس وقت عرب میں بہت سے لوگ مرتد ہونے لگے، اس وقت حضرت عمرؓ نے حضرت ابو بکرؓ سے پوچھا کہ آپؐ کس بنیاد پر لوگوں سے قتال کریں گے جب کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یہ فرما چکے ہیں کہ مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک قتال کروں جب تک کہ وہ "لا الٰہ الا اللہ" نہ کہہ دیں، اگر وہ کہہ دیں گے تو اپنی جانوں اور مالوں کو محفوظ کر لیں گے مگر اس کے حق کے ساتھ...... اور اس کا حساب اللہ تعالےٰ کے ذمہ ہے، حضرت ابو بکرؓ نے کہا کہ جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا میں اس سے ضرور جنگ کرونگا اس لئے کہ زکوٰۃ مال کا حق ہے، خدا کی قسم اگر وہ ایک بکری کا بچہ[2] جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دیتے تھے اب دینے سے انکار کریں گے تو میں ان سے اس بات پر ضرور قتال کروں گا، حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ حضرت ابو بکرؓ

---

[1] ابن ماجہ کے سوا یہ حدیث تمام کتب صحاح میں موجود ہے، [2] مسلم ترمذی اور ابو داؤد میں عناقا کے بجائے عقالاً آیا ہے یعنی ایک رسی۔

کو اللہ تعالے نے قتال پر پورا شرح صدر عطا فرمایا، اس سے میں سمجھا کہ یہی بات حق ہے۔"

حضرت ابوبکرؓ نے یہ موقف کیوں اختیار کیا؟

علامہ خطابیؒ نے اہلِ ارتداد اور اہلِ بغاوت کی تمام قسموں، ان کے زکوٰۃ ادا نہ کرنے کی حقیقت نیز حضرت ابوبکرؓ نے ان کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا اس پر سیر حاصل بحث کی ہے، اس سے اس وقت کے خاص حالات اور فہم صحابہ میں اختلاف کے اسباب روشنی میں آجاتے ہیں، اختصار و تلخیص کے ساتھ اس بحث کو یہاں نقل کیا جارہا ہے،

"اہل ارتداد کی دو قسمیں تھیں، ایک قسم وہ تھی جو دین سے مرتد ہوگئی تھی اور ملت سے کنارہ کش ہو کر کفر کی طرف مائل ہوگئی تھی، یہ وہ لوگ ہیں جن کی طرف حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے اشارہ کیا ہے، یہ قسم دو طبقوں پر مشتمل تھی، ایک طبقہ وہ تھا جس نے مسیلمہ کذاب اور اسود عنسی وغیرہ مدعیان نبوت کی تصدیق اور پیروی کی تھی ....

یہ پورا فرقہ نبوت محمدیؐ کا منکر تھا، ان سب سے حضرت ابوبکرؓ نے جہاد کیا، چنانچہ مسیلمہ یمامہ میں مارا گیا اور عنسی صنعاء میں قتل کیا گیا، ان کی اکثریت مقتول ہوگئی اور باقی منتشر ہوگئے، دوسری جماعت جو دین سے مرتد ہوگئی ان کی نوعیت یہ تھی کہ انھوں نے احکام شریعت کا انکار کیا، نماز اور زکوٰۃ چھوڑ دی، اور جاہلیت کی زندگی پھر سے اختیار کرلی، اس وقت تین مسجدیں ایسی باقی رہ گئیں جہاں صرف اللہ کے لئے سجدہ ہورہا تھا، مسجد مکہ، مسجد مدینہ، مسجد عبدالقیس،

(مندرجہ بالا طبقوں کے مقابلہ میں) ایک دوسری قسم وہ تھی جنھوں نے نماز اور زکوٰۃ میں تفریق کی انھوں نے زکوٰۃ کے وجوب سے نیز امام کے پاس ادائگی کے وجوب سے انکار کیا، یہ لوگ درحقیقت باغی تھے لیکن اس زمانہ میں ان کیلئے یہ لفظ استعمال نہیں کیا گیا، اس لئے کہ وہ بھی اہلِ ارتداد کے ساتھ اس معاملہ میں شریک تھے اور ارتداد کا مسئلہ سب سے اہم اور مقدم تھا، چنانچہ سب کے لئے "اہلُ الرِّدّۃ"

کا لفظ استعمال ہونے لگا، باغیوں سے قتال کا مفہوم حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانہ سے رائج ہوا، اس لئے کہ اس وقت وہ منفرد اور مستقل بالذات تھے اور اہل شرک کے ساتھ ان کا اختلاط نہیں تھا،

ان مانعین زکوٰۃ کے ساتھ کچھ لوگ وہ بھی تھے جو زکوٰۃ کے قائل تھے لیکن ان کے سرداروں اور چودھریوں نے ان کو ادائیگی زکوٰۃ سے باز رکھا، مثلاً بنی یربوع کے قبیلہ والے انھوں نے زکوٰۃ جمع بھی کرلی اور اس کو حضرت ابوبکرؓ کے پاس بھیجنے کا ارادہ بھی کرلیا لیکن مالک بن نویرہ نے ان کو اس سے روک دیا اور یہ زکوٰۃ انہی کے قبیلہ میں تقسیم کروائی، یہی وہ لوگ تھے جن کے معاملہ میں اختلاف پیدا ہوا اور حضرت عمرؓ کو شبہہ ہوا کہ آیا ان سے قتال جائز ہے یا نہیں؟ انھوں نے حضرت ابوبکرؓ سے مراجعت کی اور اس مسئلہ پر بحث کی اور اس حدیث کو دلیل کے طور پر پیش کیا (امرت ان اقاتل الناس الخ) لیکن حضرت عمرؓ کی یہ رائے ظاہر قول پر مبنی تھی، انھوں نے اس کے شرائط پر غور نہیں کیا تھا، حضرت ابوبکرؓ نے ان سے کہا کہ زکوٰۃ مال کا حق ہے، ان کی مراد یہ تھی کہ مسئلہ خون اور مال دونوں کی ضمانت اور حفاظت کا تھا جو اپنی شرائط کے ساتھ وابستہ ہے، یہ حکم دو شرطوں کے ساتھ مقید ہے، دونوں شرطوں کا پورا ہونا ضروری ہے، ....

.....یہاں (مانعین زکوٰۃ کے مسئلہ میں) ایک شرط (ادائے زکوٰۃ) مفقود ہے اس لئے وہ حکم جاری نہیں ہوگا، اس کے علاوہ انھوں نے اس کو نماز پر قیاس کیا اور چونکہ تارک صلوٰۃ پر بالاجماع قتال واجب ہے، اس حیثیت سے منکر زکوٰۃ پر بھی واجب ہونی چاہئے، اس طرح یہ مختلف فیہ مسئلہ متفق علیہ بن گیا، جب حضرت عمرؓ پر حضرت ابوبکرؓ کی صحت رائے بالکل عیاں ہوگئی تو انھوں نے اس قتال میں ان کی پوری پیروی کی، ان کے اس قول فعرفت

انہ الحق" (پھر میں نے سمجھ لیا کہ یہی حق ہے) کے معنی یہی ہیں، یعنی حضرت ابوبکرؓ کی اس دلیل پر جو انھوں نص و دلالت کے ساتھ پیش کی ان کو شرح صدر حاصل ہو گیا۔"

حضرت ابوبکرؓ کا موقف اور اس کے اہم نتائج

امام کو زکوٰۃ ادا نہ کرنے کی تحریک اسلام پر ایک کاری ضرب تھی اور اس سے بغاوت وانتشار کا ایک بڑا دروازہ کھل رہا تھا، اگر حضرت ابوبکرؓ خدانخواستہ اس میں رواداری برتتے اور اس کے سدباب میں غفلت اور سستی سے کام لیتے تو پھر یہ دروازہ کبھی بند نہ ہوتا اور اس کے بعد دوسرے دروازے بھی یکے بعد دیگرے کھلنے لگتے، زکوٰۃ کے بعد نماز کی باری آتی اور ایک جماعت یہ کہنے لگتی کہ جمعہ اور جماعت کی کیا ضرورت ہے، ہم تنہا اپنے گھروں میں نماز پڑھ سکتے ہیں، روزہ کی باری آتی تو یہ کہا جاتا کہ رمضان میں اوقات مقرر کرنے کی کیا ضرورت ہے، اصل یہ ہے کہ ایک مہینہ کے روزے پورے ہو جائیں خواہ جس ترتیب سے ہوں، حج

---

[1] راقم سطور کا خیال ہے کہ جو لوگ ملت چھوڑ بیٹھے، کفر کی طرف جھک گئے، شرائع کے منکر ہو گئے، نماز وغیرہ چھوڑ دی اور جاہلیت کے قدیم حال پر واپس آ گئے (اور یہ وہ لوگ ہیں جن کو خطابی نے قسم اول میں شمار کیا ہے) اسی طرح وہ لوگ جو نماز و زکوٰۃ میں فرق کرنے لگے تھے اور وجوب زکوٰۃ کے منکر ہو گئے تھے (اور یہ لوگ جیسا کہ خطابی نے اوپر لکھا ہے صنف دوم سے تعلق رکھتے تھے) ان سب سے حضرت ابوبکرؓ کا قتال اس بنیاد پر تھا کہ وہ مرتد ہیں اس لئے کہ وہ لوگ ضروریات دین کے کھلے طور پر منکر تھے، اسی لئے انھوں نے فرمایا (واللہ لاقاتلن من فرق بین الصلوٰۃ والزکوٰۃ فان الزکوٰۃ حق المال) لیکن وہ لوگ جو امام کو زکوٰۃ دینے سے منکر تھے یا اس پر قابض ہو کر خود اپنے قبیلہ میں اور اپنی مرضی سے اس کو تقسیم کر رہے تھے نیز وہ لوگ جو خود زکوٰۃ دینا چاہتے تھے لیکن اپنے سرداروں سے مجبور تھے، ان سے حضرت ابوبکرؓ کا قتال اس بنیاد پر تھا کہ وہ باغی ہیں اور "اہل بغی" سے قتال قرآن مجید سے ثابت ہے اور مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِىْ تَبْغِىْ حَتّٰى تَفِىْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ" (سورہ حجرات - ۹) واللہ اعلم بالصواب۔

میں بھی کتر بیونت کی جاتی اور اس کے متعین مناسک واعمال اور اوقات معینہ میں رد و بدل ہونے لگتا، غرض کہ اس کے نتیجہ میں خلافتِ نبوت اور نظام امارت (جس کے ساتھ تمام حدود و احکام اور عزت اسلام وابستہ ہے) اشعار کے اس بحر کی طرح ہو جاتا جس کا نام تو بحر ہوتا ہے لیکن پانی کا کہیں وجود نہیں ہوتا، اسلام اور مسلمانوں کا شیرازہ اسی زمانہ میں اس طرح منتشر ہو جاتا جس طرح اس کے صدیوں بعد ہوا، اس لحاظ سے حضرت ابوبکرؓ کا موقف جس میں نرمی، سہل انگاری، مداہنت یا مفاہمت کا کوئی شائبہ بھی نہیں تھا، دراصل اللہ تعالےٰ کی طرف سے ان کے دل میں القا ہوا تھا اور اس کے دین کی بقا اور اس کی پاکیزگی و بالیدگی اور اس کی حقیقت کی حفاظت میں اس کا سب سے بڑا اہم حصہ ہے، پوری امت اس پر متفق ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ اس طوفان ارتداد کے مقابلہ کیلئے جو اسلام کی ایک ایک کڑی کو ختم کر دینے کے درپے تھا حضرت ابوبکرؓ نے وہ موقف اختیار کیا جو اپنے اپنے زمانوں میں انبیاء کرام نے اختیار کیا تھا، یہ خلافت نبوت تھی جس کا حق حضرت ابوبکرؓ نے پوری طرح ادا کیا اور اس کی وجہ سے وہ قیامت تک آنے والے مسلمان نسلوں کے شکریہ کے مستحق ہیں،

نقد مال کی زکوٰۃ میں حضرت عثمانؓ کا موقف

حضرت ابوبکرؓ کے جہاد اور ان کی صلابت و استقامت کے نتیجہ میں یہ صورتِ حال ایک عرصہ تک باقی رہی اور ہر قسم کے مالوں کی زکوٰۃ بیت المال میں جمع کی جاتی رہی، جب حضرت عثمانؓ کی خلافت کا زمانہ آیا تو انھوں نے اموال باطنہ (نقد وغیرہ) کی زکوٰۃ مستحقین اور دوسرے مصارف زکوٰۃ پر بطور خود خرچ کرنے کی اجازت دی، صرف اموالِ ظاہرہ مثلاً مویشی، کاشت اور باغات کی زکوٰۃ بیت المال میں جمع کرنے کا حکم برقرار رہا،

امام ابوبکر جصاص اپنی تفسیر میں اس کی تفصیل و تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"زکوٰۃ پہلے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس، اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے پاس جمع ہوتی تھی، پھر حضرت عثمانؓ نے ایک موقع پر تقریر کی اور کہا کہ

یہ تمہارے زکوٰۃ کا مہینہ ہے جس پر زکوٰۃ فرض ہو وہ اس کو ادا کرے پھر اپنے بقیہ مال کی زکوٰۃ نکالے، انھوں نے مالکین نصاب کو خود اپنے طور پر دینے کی آزادی دیدی اور امام کا حق اس سے ساقط ہوگیا، اس کا فیصلہ بھی ائمہ عدل میں سے ایک امام نے کیا تھا، اس لئے پوری امت پر اسی وقت نافذ ہوگیا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اس قول کی وجہ سے "ویعقد علیہم اموالھم"[۱]

نظام زکوٰۃ میں مسلم حکومتوں کی کوتاہی اور اس کا انجام

اسلامی خلافت (اپنے درجات کے تفاوت کے باوجود) اموال ظاہرہ کی زکوٰۃ برابر تحصیل وصول کرتی رہی اور جیسا کہ امام ابو یوسف کی کتاب الخراج" نیز حکومت کے ذرائع آمدنی اور مالیات پر جو کتابیں مختلف زمانوں میں لکھی گئیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ خلافت عباسیہ کے آخری دور تک یہ صورت برقرار رہی، بالآخر یہ شرعی حکم ان مسلم حکومتوں میں بالکل ختم ہوگیا جو شرعی نظام

---

[۱] علامہ علاء الدین ابوبکر الکاسانی الحنفی (م ۵۸۷ھ) لکھتے ہیں کہ پوشیدہ مال (اموال باطنہ) جو شہر میں ہوتا ہے اس کے متعلق عام علماء کی رائے یہی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کی زکوٰۃ لی، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے بھی اسکی زکوٰۃ لی، حضرت عثمانؓ نے بھی ایک مدت تک زکوٰۃ لی، لیکن جب دولت کی فراوانی ہوئی اور انھوں نے محسوس کیا کہ اب ان اموال کی زکوٰۃ حاصل کرنے کی وجہ سے امت کو پریشانی اٹھانی پڑے گی اور اس کی تفتیش و تحقیق کی وجہ سے اہل ثروت کو زحمت پیش آئے گی تو انھوں نے یہ حق خود ان کے سپرد کر دیا (البدائع والصنائع ج ۲ ص ۳۵) علامہ ابن الہمام (م ۸۶۱ھ) لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپکے دونوں خلیفہ اس پر قائم رہے، جب حضرت عثمانؓ کا زمانہ آیا اور لوگوں کا تغیر ظاہر ہونے لگا تو انھوں نے خیال کیا کہ لوگوں کے پوشیدہ مالوں کا مخفی طریقوں سے پتہ لگانا مناسب نہیں اسلئے انھوں نے اس مال کی ادائیگی انہی مالکوں کے سپرد کر دی اور صحابہ نے بھی اس مسئلہ میں ان سے کوئی اختلاف نہیں کیا، اس کی حیثیت امام کے حق وصول کو باقاعدہ ساقط کر دینے اور گذشتہ حکم کو منسوخ کر دینے کی نہیں تھی (فتح القدیر ج ۱ ص ۱۱۳)

کی پوری طرح پابند نہ تھیں اور جن کو اخلاقی ضابطوں، اجتماعی خصائص اور مالی سیاست میں خلافت نبوت کی وارث کہنا مشکل ہے اس کے نتیجہ میں تمام اسلامی ملکوں میں سخت انتشار برپا ہوا، مسلمان شریعت اسلامی کی برکتوں سے محروم ہو گئے اور اسی کی سزا ہے کہ آج ان کو ظالمانہ سرمایہ داری، پرفریب سوشلزم اور انتہا پسندانہ اور غیر متوازن کمیونزم کا مزہ چکھنا پڑ رہا ہے،

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے،

وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ[1]

اور ہم انھیں قریب کا عذاب بھی علاوہ اس بڑے عذاب کے چکھا کر رہیں گے شاید کہ یہ لوگ باز آجائیں،

زکوٰۃ ہمدردی و غمخواری کی ادنیٰ حد ہے

اسلام نے جو زکوٰۃ مسلمانوں پر فرض کی ہے وہ ہمدردی و غمخواری اور حسن سلوک کی کم سے کم حد ہے، یہ ایسا فریضہ ہے جس سے روگردانی اور فرار اللہ تعالیٰ کو کسی صورت میں منظور نہیں، اسلامی شریعت نے نہایت جزم اور سختی کے ساتھ اس کا مطالبہ کیا ہے اور اس کو اسلامی شریعت، مسلمانوں کا شعار اور دین کے بنیادی ارکان میں سے ایک رکن قرار دیا ہے،

فَإِن تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ[2]

لیکن اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز کے پابند ہو جائیں اور زکوٰۃ دینے لگیں تو وہ تمہارے بھائی ہو جائیں گے دین میں۔

جو اس کا منکر ہوگا یا اس کی ادائیگی سے جان بوجھ کر روگردانی کرے گا وہ اسلام کے دائرہ سے خارج اور جمہور امت سے علیحدہ سمجھا جائے گا، چنانچہ یہی وہ منکرین زکوٰۃ تھے جن سے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد اس امت میں سب سے افضل ترین شخص حضرت ابوبکرؓ نے کھلے طریقہ پر قتال کیا تھا اور اس قتال میں تمام صحابہ ان کے ساتھ تھے اور اس اقدام پر ان سب کا اجماع تھا،

---

[1] الم السجدہ — ۲۱ [2] سورہ توبہ — ۱۱

مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل اور طرز زندگی، اپنے ذوق ورجحان، اپنی ترغیب و دعوت اور اپنے مخصوص اصحاب، اہلِ تعلق، اہلِ ہمت واصحابِ عزیمت کے سامنے اپنے نصائح وارشادات اور ہدایات وتعلیمات میں صرف اسی حد پر اکتفا نہیں کی اور اس کو ہمدردی وخیر خواہی اور ادائیگی حقوق کی سب سے اعلیٰ مثال یا آخری شکل قرار نہیں دیا، آپ نے اپنے معجزانہ نبوی اسلوب اور ایک مختصر جملہ میں جس کے سامنے بڑے بڑے ادیبوں اور عالموں کی بلاغت وفصاحت ہیچ ہے اس بات کو اس طرح ادا کیا کہ (ان فی للمال حقا سوی الزکوٰۃ) (بیشک مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے) ترمذی میں فاطمہ بنت قیس سے مروی ہے کہ حضورؐ سے زکوٰۃ کے بارہ میں سوال کیا گیا یا فاطمہ بنت قیس نے خود پوچھا تو آپؐ نے فرمایا "ان فی المال حقاً سوی الزکوٰۃ" اسکے بعد آپؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی،

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّيْنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ

طاعت یہ نہیں ہے کہ تم اپنا منہ مشرق یا مغرب کی طرف پھیر لیا کرو بلکہ طاعت یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ اور قیامت کے دن اور فرشتوں اور کتاب اور پیغمبروں پر ایمان لائے اور اس کی محبت میں مال صرف کرے، قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور راہ گیروں اور سائلوں پر اور گردنوں کے آزاد کرنے میں، اور نماز کی پابندی کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے اور اپنے وعدوں کو پورا کرنے والے جبکہ وعدہ کر چکے ہوں اور تنگی میں اور بیماری میں اور لڑائی کے وقت صبر کرنے والے، یہی لوگ ہیں جو سچے اترے اور یہی لوگ

المتقون۝[۱] تو متقی ہیں:۔

زندگی اور مال کے بارہ میں نبوی نقطۂ نظر

مال کے ساتھ آپؐ کا رویہ اور اپنے اہل بیت کے ساتھ آپؐ کا معاملہ (خاص طور پر یہ بات ملحوظ رکھتے ہوئے کہ آپؐ اس امت پر سب سے زیادہ شفیق اور اس کے سب سے زیادہ خیر خواہ تھے اور آپؐ ہی نے فرمایا تھا کہ "خیرکم خیرکم لاھلہ وانا خیرکم لاھلی"[۲]) اس نبوی نقطۂ نظر کا پورا ترجمان تھا جس کی صحیح تصویر کیلئے لغت اور ادب کا بڑے سے بڑا ذخیرہ ناکافی ہے، بلکہ سخن پروری اور عبارت آرائی اس کے تقدس و پاکیزگی کیلئے ایک دھبہ یا داغ ہے وہ ایک ایسی ہستی کی بات ہے جس کے سامنے خدا کی عظمت و جلال ہر وقت عیاں تھا، اس کے اخلاق، اخلاق الٰہی کا نمونہ تھے، اور یوم آخرت پر ہر وقت اس کی نظر رہتی تھی، "یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ۝ اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ۝"[۳] (جس دن نہ مال کام آئیگا نہ اولاد، مگر ہاں جو اللہ کے پاس پاک دل لیکر آئے)

جس طرح مچھلی پانی کیلئے بے قرار رہتی ہے یا دن بھر کی تھکی ماندی چڑیا اپنے آشیانے کے لئے بیتاب ہوتی ہے، اس سے زیادہ بیتابی و بے قراری اور شوق و انتظار اس کو آخرت کا رہتا تھا، اور اس کی زبان یوں گویا تھی "اللھم لاعیش الاعیش الآخرۃ"[۴] وہ اس مال کو سمندر کے جھاگ، ہاتھ کے میل، یا خزف ریزوں اور کنکریوں سے زیادہ وقعت نہیں دیتا تھا، ساری مخلوق اس کی نظر میں خدا کا کنبہ تھی اور خود وہ اپنے کو یتیموں اور غریبوں کا والی سمجھتا تھا، دوسروں کیلئے عیش و آرام کا خواہشمند اور اپنے گھر والوں کیلئے فقر و فاقہ کا آرزومند، اس کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے، "اشبع یوما واجوع یوما"[۵] ویقول "اللھم ارزق آل محمد قوتا"[۶]

---

[۱] سورہ بقرہ۔ ۱۷۷ [۲] ترمذی اور دارمی میں یہ حدیث حضرت عائشہؓ سے مروی ہے اور ابن ماجہ نے حضرت عباس سے روایت کی ہے۔

[۳] سورہ شعراء۔ ۸۸، ۸۹ [۴] بخاری ج ۲ ص ۹۴۹ [۵] ترمذی نے ابو امامہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے رب نے مجھ سے پوچھا کہ مکہ کی وادیوں کو سونا بنا دیا جائے؟ میں نے کہا نہیں میرے رب مجھے یہ اچھا لگتا ہے کہ ایک دن پیٹ بھر کے کھاؤں اور ایک دن بھوکا رہوں جب بھوکا ہوں تو آپکو یاد کروں اور آپکے سامنے گڑگڑاؤں جب پیٹ بھرا ہو تو آپ کا شکر ادا کروں اور حمد کروں [۶] بخاری ج ۲ ص ۹۵۷

اس نے خدا کا پیغام جو اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا سکون تھا اپنی ازواج مطہرات کو صاف سنا دیا

يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ۝ وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا[1]	اے نبی آپ اپنی بیویوں سے فرما دیجئے کہ اگر تم دنیوی زندگی اور اس کی بہار کو مقصود رکھتی ہو تو آؤ میں تمہیں کچھ متاع (دنیوی) دے دلا کر خوبی کے ساتھ رخصت کر دوں اور اگر تم مقصود رکھتی ہو اللہ کو اور اس کے رسول کو اور عالم آخرت کو تو اللہ نے تم میں سے نیک کرداروں کیلئے اجر عظیم تیار کر رکھا ہے،

آپ کی ازواج مطہرات نے پیغام خداوندی سنتے ہی ایک لمحہ توقف کے بغیر آپ کے ساتھ زندگی گزارنا پسند کیا اور اپنے باپ بھائی کے ہاں رہنے کو گوارا نہ کیا جہاں راحت و آسائی دامن پھیلائے ہوئے ان کی منتظر تھی،

حضور صلے اللہ علیہ وسلم اور اہل بیت کی زندگی

وہ زندگی کیا تھی جس کو آپ کی ازواج مطہرات نے اپنے لئے پسند کیا اور قابل ترجیح سمجھا حضرت عائشہ صدیقہؓ اپنی موروثی صداقت اور وسیع تجربہ اور واقفیت کے ساتھ بیان کرتی ہیں:۔

ما شبع آل محمد من خبز البر، ولقد كنا نمكث الشهر والشهرين، لا يوقد في بيتنا نار، وما كان طعامنا الا التمر والماء، ولقد توفي رسول الله صلى الله عليه وسلم وما في بيتنا شيء يأكله ذو كبد الا كسرة خبز من شعير على رف لي۔[2]	رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت با جرہ کی روٹی سے بھی سیر نہیں ہوئے، ہم ایک مہینہ دو دو مہینے اس حالت میں گزارتے تھے کہ ہمارے گھر میں چولھا بھی نہیں جلتا تھا اور ہماری غذا صرف کھجور اور پانی ہوتی تھی، جس وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے انتقال فرمایا اس وقت ہمارے گھر میں ایک چیز بھی ایسی نہ تھی جس کو

---

[1] سورۂ احزاب۔ ۲۸: ۲۹ [2] بخاری و مسلم و دیگر کتب صحاح۔

. . . . کوئی ذی حیات کھا سکتا، سوائے ایک روٹی کے ٹکڑے کے

. . . . جو میرے طاقچہ پر رکھا ہوا تھا،

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے، دیکھا کہ آپ چٹائی پر تشریف رکھتے ہیں جس کے نشانات آپ کے جسم مبارک پر پڑ گئے ہیں، گھر کے چاروں طرف نگاہ دوڑائی تو دیوار سے لٹکا ہوا مشکیزہ، مٹھی بھر جو، اور ایک پرانی چٹائی کے سوا کچھ نظر نہ آیا، یہ دیکھ حضرت عمرؓ رو دیے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے پوچھا عمر کیوں رو رہے ہو! حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ اے نبی اللہ میں کیوں نہ روؤں، یہ چٹائی ہے جس کے نشانات آپ کے پہلو میں پڑ گئے ہیں ان خزانوں میں سے مجھے صرف یہی نظر آرہا ہے جو میں دیکھ رہا ہوں، جب کہ کسریٰ وقیصر پھلوں اور نہروں میں ہیں، حالانکہ آپ اللہ کے نبی ہیں، حضورؐ نے یہ سن کر ارشاد فرمایا کہ ابن الخطاب کیا تم شک میں مبتلا ہو، یہ وہ لوگ ہیں جن کیلئے عیش وآرام کی ساری چیزیں یہیں دیدی گئی ہیں"[۱]

فاضل مال سے انقباض اور کبیدگی

اپنی ضرورت سے زائد مال کو آپ تھوڑی دیر کیلئے بھی گھر میں رکھنا پسند نہ فرماتے تھے، اسی طرح صدقات کے مال جو عام مسلمانوں کی ملکیت ہے . . . . ایک لمحہ کیلئے گھر میں رکھنے کے روادار نہ تھے، اور جب تک اس کو تقسیم نہ فرما دیتے تھے آپ کو سکون حاصل نہ ہوتا تھا،

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مرض وفات کے زمانہ میں میرے پاس چھ یا سات دینار تھے، آپؐ نے مجھے حکم دیا کہ اس کو بانٹ دوں، حضورؐ کی تکلیف کی وجہ سے مجھے اس کا موقع نہ ملا، پھر آپؐ نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ تم نے ان چھ سات دیناروں کے ساتھ کیا کیا، میں نے کہا میں آپؐ کی تکلیف کی وجہ سے ایسی مشغول ہوئی کہ خیال نہ رہا، آپؐ نے اس کو منگوایا اور اپنے ہاتھ میں رکھا اور فرمایا کہ اللہ کے نبی کا کیا گمان ہوگا اگر وہ خدا سے اس حال میں ملے کہ اس کے پاس یہ ہو"[۲]

---

[۱] بخاری، مسند ابن حنبل، سنن ابن ماجہ سب میں یہ حدیث موجود ہے اور سب کے الفاظ ملتے جلتے ہیں، [۲] مسند احمد

آپ ان اموال کو ان کی مناسب جگہوں پر پہونچانے اور تقسیم کرنے میں بالکل تاخیر نہ کرتے اور نہ اس کو دوسرے وقت کیلئے ملتوی کرتے تھے، عقبہ بن الحارث کہتے ہیں کہ "میں نے مدینہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پیچھے عصر کی نماز پڑھی، آپؐ نے سلام پھیرا اور بہت پھرتی کے ساتھ لوگوں کو پھلانگتے ہوئے ازواج مطہرات میں سے کسی کے حجرہ میں تشریف لے گئے، لوگ آپؐ کی عجلت کی وجہ سے بہت گھبرائے، پھر وہاں سے باہر آئے اور آپؐ نے محسوس کیا کہ لوگوں کو اس سرعت کی وجہ سے بڑی حیرت ہے، آپؐ نے فرمایا کہ مجھے یاد آیا کہ میرے گھر میں کچھ سونا رکھا ہوا ہے، مجھے اچھا نہ معلوم ہوا کہ رات اس حالت میں گزاروں کہ وہ میرے پاس رہے"۔

ضرورت سے زائد مال کو صدقہ وخیرات کرنے کی ترغیب

آپؐ نے اپنے اصحاب کرام اور اپنی پوری امت کی اسی اخلاق اور اسی سیرت پر تربیت فرمائی، اور مال خرچ کرنے کی ترغیب میں ایسی موثر نصیحتیں اور وصیتیں فرمائیں جنکو پڑھ کر ایسا خیال ہونے لگتا ہے کہ فاضل مال میں شائد آدمی کا کوئی حق ہی نہیں، ان احادیث کو پڑھنے کے بعد ایک انسان جب اپنی زندگی کا جائزہ لیتا ہے اور اس آرام و آسائش اور کشادگی و سہولت کو دیکھتا ہے تو اس کو بڑی دشواری محسوس ہوتی ہے، اس کو ہر چیز ضرورت سے زائد اور فاضل محسوس ہونے لگتی ہے اور یہ خوبصورت پوشاکیں انواع و اقسام کے کھانے، آرام دہ سواریاں اور وسائل زندگی کی فراوانی اس کو غلط اور ناجائز نظر آتی ہے حالانکہ یہ صرف ترغیب کے دائرہ کی بات ہے، حکم شرعی اور قانون کی نہیں، لیکن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا اسوہ یہی تھا،

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيرًا[۱]

رسول اللہ کا ایک عمدہ نمونہ موجود ہے تمہارے لئے یعنی اس کے لئے جو ڈرتا ہو اللہ اور روز آخرت سے اور ذکر الٰہی کثرت سے کرتا ہو۔

صحیح حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ جس کے پاس ایک سواری زاید ہو تو جس کے پاس ایک بھی سواری

---

[۱] سورہ احزاب - ۲۱

نہ ہو اس کو دیدے، جس کے پاس ایک ناشتہ زاید ہو اس کو دیدے جس کے پاس ناشتہ نہ ہو"[1]

آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ "جس کے پاس دو کا کھانا ہو تو وہ تیسرے کو بھی کھانا کھلائے اور جس کے پاس تین کا کھانا ہو وہ چوتھے کو شریک کرے"[2]

آپؐ نے فرمایا "مجھ پر ایمان نہیں لایا وہ شخص جو رات بھر پیٹ بھر کر سوتا رہا اور اس کا پڑوسی بھوکا رہا حالانکہ اس کو اس بات کی خبر تھی"[3]

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ "ایک آدمی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ یا رسول اللہ مجھے کپڑا پہنائیے، آپؐ نے اس سے کہا کہ کیا تمہارا کوئی ایسا پڑوسی نہیں ہے جس کے پاس دو جوڑے زائد ہوں، اس نے عرض کیا ایک سے زیادہ ہیں، آپؐ نے فرمایا پھر اللہ تعالے جنت میں اس کو اور تم کو جمع نہ کرے"[4]

اسلام کی نظر میں انسان کی قیمت اور غمخواری کی اہمیت

آپؐ نے انسان کا مرتبہ اور اس کی حاجت برآری و غمخواری کی قیمت اور اہمیت اتنی زیادہ بلند کی کہ اس سے بلند کسی اور معیار کا تصور ہی نا ممکن ہے اس میں کوتاہی کرنے والا ایسا ہے، جس طرح خاص خدا کی نافرمانی اور کوتاہی کرنے والا، مشہور حدیث قدسی ہے کہ اللہ تعالے قیامت کے روز اپنے بندہ سے فرمائیں گے کہ میں بیمار ہوا تو نے میری عیادت نہیں کی، وہ کہے گا کہ اے رب میں کیسے آپ کی عیادت کرتا آپ تو رب العالمین ہیں، اللہ تعالے فرمائے گا کہ تجھ کو معلوم نہیں تھا کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہے لیکن تو نے اس کی عیادت نہیں کی، اگر تو اس کی عیادت کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا، اے ابن آدم میں نے تجھ سے کھانا مانگا تو تو نے مجھے کھانا نہیں دیا وہ کہے گا اے رب میں کیسے آپ کو کھانا دیتا آپ تو رب العالمین ہیں، اللہ تعالے فرمائے گا کہ تجھ کو خبر نہیں کہ میرے فلاں بندہ نے تجھ سے کھانا مانگا اور تو نے اس کو کھانا نہیں دیا، اگر تو اس کو کھانا کھلاتا تو وہ کھانا میرے پاس پہونچتا، اے ابن آدم میں نے تجھ سے پانی مانگا تو نے مجھے پانی نہیں پلایا وہ کہے گا کہ اے رب میں

---

[1] ابوداؤد روایت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ [2] ترمذی [3] طبرانی فی الاوسط [4] طبرانی فی الاوسط۔

آپ کو کیسے پانی پلاتا، آپ تو رب العالمین ہیں، اللہ تعالےٰ فرمائے گا کہ میرے فلاں بندہ نے تجھ سے پانی مانگا لیکن تونے اس کو پانی نہیں پلایا اگر تو اس کو پانی پلا دیتا تو اس کو میرے پاس پاتا"[1]

اس کی انتہا یہ تھی، اور غمخواری واحسان، اور عدل وانصاف کی اس سے بڑھ کر کوئی بات نہیں ہوسکتی نہ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ "لایومن احدکم حتیٰ یحب لاخیہ مایحب لنفسہ"[2] (تم میں سے کوئی اس وقت تک کامل مسلمان نہیں ہوگا جب تک کہ اپنے بھائی کیلئے بھی وہی چاہے جو اپنے لئے چاہتا ہے)

صحابہ کرام کی زندگی پر اسوۂ رسولؐ کا پرتو

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت نے صحابہ کرام کی زندگی، ان کے ازواق ورجحانات، اور اپنے گھرانوں اور اپنے مال کے ساتھ ان کے رویہ پر بھرپور اور گہرا اثر ڈالا اور یہ روح ان کے رگ وریشہ، ان کے اخلاق اور ان کی عقلیت میں اس طرح جاری وساری ہوگئی کہ ان کی زندگی بڑی حد تک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی تصویر یا عکس بن گئی، جو آپؐ سے زیادہ قریب تھا وہ قدرتی طور پر آپؐ سے زیادہ مشابہ تھا، تاریخ نے ان کے زہد وتورع غمخواری وحاجت برآری، قناعت پسندی، سادگی وجفاکشی اور ایثار وقربانی کے جو واقعات اور کارنامے محفوظ کردیئے ہیں وہ اخلاق ومذاہب کی تاریخ میں سب سے اوپر اور سب سے زیادہ روشن نظر آتے ہیں اور دنیا کی کوئی قوم اس کے قریب تک نہیں پہونچ سکی ہے،

خلفاء راشدینؓ صحابہؓ اور اہل بیت رسولؐ کا طرز زندگی

تاریخ کی مشہور روایت ہے کہ خلیفۃ المسلمین حضرت ابوبکر صدیقؓ کی اہلیہ کو ایک مرتبہ حلوہ کی خواہش ہوئی، انھوں نے اپنے روزینہ میں سے تھوڑا تھوڑا بچا کر ایک رقم اس کیلئے جمع کرلی، جب حضرت ابوبکرؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے یہ چند درہم بھی بیت المال میں داخل کردیئے اور جتنی رقم وہ حلوہ کیلئے بچا لیتی تھیں، اس کو یہ کہہ کر روزینہ میں سے کم کردیا کہ تجربہ سے معلوم ہوا کہ اس کے بغیر بھی کام چل

---

[1] مسلم [2] بخاری

سکتا ہے،

حضرت عمرؓ کا زہد و مجاہدہ اور سادہ زندگی تاریخ میں ضرب المثل بن چکی ہے اس سلسلہ میں "جابیہ" کیطرف ان کے ایک سفر کا ذکر کافی ہے جو انھوں نے خلیفہ اور امیر المومنین کی حیثیت سے کیا تھا، مورخ کے قلم نے اس کی اس طرح تصویر کھینچی ہے "..... وہ ایک اونٹ پر سوار تھے، ان کا سر دھوپ میں چمک رہا تھا، نہ سر پر ٹوپی تھی نہ عمامہ، ان کے دونوں پاؤں کجاوے کے دونوں کونوں کے درمیان ٹکرا رہے تھے، نیچے صرف ایک ادنی انبجانی گدا تھا، جب اونٹ سے اترتے تھے تو وہی ان کا بستر ہوتا تھا، جب سوار ہوتے تھے تو وہی کجاوہ کا کام دیتا تھا، ایک تھیلا تھا جس میں روئی بھری ہوئی تھی، سفر کرتے تو اس سے تھیلے کا کام لیتے، اترتے تو تکیہ کے طور پر استعمال کرتے ان کی قمیص گزی گاڑھے کی تھی جو پرانی بھی تھی اور ایک طرف سے پھٹ بھی گئی تھی[1]"

حضرت عثمانؓ جو اپنے ساتھیوں میں سب سے زیادہ مالدار اور آسودہ حال تھے، ان کے متعلق شرجیل بن مسلم کہتے ہیں کہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ دوسروں کی ضیافت تو امیرانہ انداز میں کرتے تھے لیکن خود اپنے گھر جا کر صرف روٹی اور تیل تناول فرماتے تھے، حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ (جن کا شمار مخصوص زہاد صحابہ میں ہے) کی زاہدانہ زندگی کی تصویر ضرار بن ضمرہ اس طرح کھینچتے ہیں۔

"دنیا اور اس کی زینت و آرائش سے متوحش و بیزار اور رات کی تاریکی سے مانوس تھے، بہت رونے والے، اور بہت سوچنے والے، اپنا ہاتھ پلٹتے تھے اور اپنے نفس سے مخاطب ہوتے تھے، لباس معمولی اور کھانا موٹا جھوٹا ہوتا تھا، خدا کی قسم وہ ہم ہی میں سے ایک معلوم ہوتے تھے، ہم کچھ پوچھتے تھے تو فوراً جواب دیتے تھے، ہم ملنے آتے تو بات کی ابتدا خود ہی کرتے، ہم بلاتے تو دعوت قبول کرتے[2]"

اسوۂ رسولؐ کا یہ عکس اور جمال نبوی کا یہ پرتو آپؐ کی صحبت و تربیت کے اعتبار سے تھا، چنانچہ ام المومنین

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۷، ص ۵۹، ۶۰ [2] صفوۃ الصفوہ (ابن جوزی)

حضرت عائشہؓ کا مرتبہ (جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی سب سے محبوب بیوی تھیں) زہد و ایثار اور جود و عطا میں بہت بلند ہے، مورخین بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے ایک مرتبہ ایک لاکھ درہم صدقہ کئے، حالانکہ ان کے پاس صرف ایک پھٹی پرانی پوشاک تھی اور وہ روزہ سے تھیں، ان کی خادمہ نے عرض کیا کہ اگر آپ افطار کرنے کے لئے کچھ بچا لیتیں تو اچھا تھا، جواب دیا کہ اگر اس وقت یاد دلاتیں تو میں ایسا ہی کرتی، انھوں نے بھوک کی حالت میں ایک لاکھ صدقہ کر دئے اپنے کو بھول گئیں اور دوسروں کو یاد رکھا۔[۱]

اولین اسلامی معاشرہ میں غمخواری و ایثار کی مثالیں

یہ اخلاق اور روح اولین اسلامی معاشرہ میں اس طرح سرایت کر گئی تھی کہ سب صحابہ ایک سانچہ میں ڈھلے ہوئے معلوم ہوتے تھے، اور قربانی ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی، ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم پر ایک ایسا زمانہ گزرا ہے کہ کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی سے زیادہ اپنے دینار و درہم کا مستحق نہ تھا،[۲]

اس کے نتیجہ میں ایسے عجیب و غریب واقعات پیش آئے جنھوں نے غمخواری کی حدوں کو مساوات و برابری سے ملا دیا اور حسن جوار کو ایثار کے بلند سے بلند مقام تک پہونچا دیا، یہی ابن عمر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے کسی کو ایک مرتبہ ایک بکری کی سری ہدیۃً ملی، انھوں نے یہ سوچ کر کہ فلاں شخص مجھ سے زیادہ حاجتمند ہے، اس کو وہاں بھیجدیا، اس نے یہی بات سوچ کر اس کو تیسرے کے پاس بھیجدیا، اسی طرح یہ سری ایک سے دوسرے کے پاس جاتی رہی اور سات گھروں کا چکر کھا کے بعد پہلے صحابی کے پاس واپس پہونچ گئی،،[۳]

زہد و قربانی کے سلسلہ میں یہ لطافت حس اور باریک بینی، ہمدردی و دلجوئی کا عشق اور مدد کرنے کا جذبہ اور شوق جو بعد کی نسلوں میں منتقل ہوا اس میں تابعین کا حصہ قدرتی طور پر سب سے زیادہ تھا،

۱؎ المستدرک للحاکم ۲؎ بخاری (الادب المفرد) ۳؎ احیاء العلوم ج ۲ ص ۱۷۴

سید التابعین حسن بصریؒ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا حال یہ تھا کہ جب صبح ہوتی تھی تو ایک آدمی یہ آواز لگاتا تھا: "گھر والو اپنے یتیم کی خبر لو، اپنے مسکین کی خبر لو"[1]

خاص طور پر بنی ہاشم اور اہلِ بیت کے بزرگ اس میدان میں بہت آگے تھے اور صدق و اخلاص کے ساتھ اس راستہ پر گامزن تھے، امام حسنؓ اور عبداللہ بن جعفرؓ کے جود و سخا اور دلداری و کرم گستری کے سلسلہ کے بکثرت واقعات مورخین نے قلمبند کئے ہیں، علی بن حسینؓ بن علی رضی اللہ عنہ (زین العابدین) کو آباء و اجداد سے ان فضائل و مناقب میں مرتبہ سبقت و فضیلت حاصل تھا، محمد بن اسحاق بیان کرتے ہیں کہ مدینہ میں بکثرت ایسے آدمی تھے جن کو معلوم تھا کہ وہ کیسے زندگی گزار رہے ہیں اور ان کا رزق کہاں سے آتا ہے جب علی بن حسینؓ کی وفات ہوئی تو یہ سلسلہ بند ہوگیا اس وقت ان کو معلوم ہوا کہ وہی تھے جو راتوں کو چھپ چھپ کر ان کے پاس سامان پہونچاتے تھے، ان کی وفات کے بعد دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ ان کی پیٹھ اور شانہ پر بیواؤں اور مسکینوں کے ہاں بورے پہونچانے کی وجہ سے نشان پڑ گئے ہیں،[2]

ایثار و ہمدردی کے جستہ جستہ واقعات

اسلامی نسلوں نے ذوقِ رفیع، احساسِ لطیف، اور نفس کے احتساب کے اس قیمتی ورثہ کی برابر حفاظت کی، راسخین فی العلم، علمائے حق اور اہلِ تربیت و اصلاح ہر ملک اور ہر زمانہ میں اس طرزِ زندگی اور اس ذوق کی مکمل نمائندگی کرتے رہے، ان کے حیرت انگیز واقعات، کارناموں اور قربانیوں کے تذکرہ سے تاریخ و تراجم کی کتابیں بھری ہوئی ہیں، ان مایۂ ناز مورخین کے جمع کردہ واقعات سے زیادہ محیر العقول اور عجیب واقعات وہ ہیں جو بہت سی کتابوں میں ملتے ہیں جو اس موضوع سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں، اور جن کے متعلق یہ خیال بھی نہیں ہوتا کہ اس میں یہ چیزیں مل سکیں گی،

---

[1] "الادب المفرد للبخاری"

[2] یہ واقعات زیادہ تر ہمارے دوست ڈاکٹر مصطفیٰ سباعیؒ کی کتاب "اشتراکیۃ الاسلام" سے ماخوذ ہیں۔

ان حق پرست اور اہلِ دل علماء و شیوخ کا اصول و شعار ہمیشہ یہ رہا کہ رات تک اُن کے ہاں روپیہ باقی نہ بچے، اپنی ضرورت کو ملتوی کرکے وہ دوسروں کی ضرورت پوری کریں، ان کے پاس جو تحفے اور ہدایا امراء اور اغنیاء کی طرف سے آئیں وہ شہر کے ان غرباء اور اہلِ حاجت کیلئے وقف کردیں جو اس سے محروم ہیں، اور ناقابلِ اعتناء سمجھے گئے ہیں، ان کا مسلک اور اصول یہ تھا...... (تؤخذ من اغنیائهم وترد علی فقرائهم) (ان کے امراء سے لیا جائے اور غرباء کو دیا جائے) ان کا دسترخوان ان کے دل کی طرح امراء و اغنیاء کے دسترخوان سے زیادہ کشادہ، وسیع اور عمومی تھا، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے (جو اس پورے طبقہ اصفیاء کے سرگروہ و سرخیل ہیں) منقول ہے کہ ایک مرتبہ انھوں نے اپنے متعلق فرمایا کہ میری ہتھیلی میں سوراخ ہے اس میں کوئی چیز نہیں ٹھہرتی، اگر ایک ہزار دینار بھی میرے پاس آئیں تو رات آنے سے پہلے ختم ہوجائیں[1]۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ میری خواہش ہے کہ پوری دنیا میرے ہاتھ میں دیدی جائے اور میں بھوکوں کو کھلاتا ہوں[2]،

عالم اسلام کے وسیع رقبہ اور اس کے دور دراز گوشوں اور کناروں میں سے کوئی کنارہ اور گوشہ ایسا باقی نہ تھا جہاں اس قسم کے لوگ نہ پائے جاتے ہوں، ان سب علاقوں میں سے کسی کا حصہ بھی کم نہ تھا، ان مخلص وربانی علماء، مشائخ اور اہلِ دل کے حالات زندگی، زہد و ایثار، ہمدردی و دلداری، اخوت، بذل و عطا، سخاوت و فیاضی سے عشق، اور حاجت براری کے شوق اور خود تکلیف اٹھاکر دوسروں کو آرام پہونچانے کے ذوق کے واقعات سے بھرے ہوئے ہیں، ہم ان نمونوں میں سے یہاں صرف دو نمونے پیش کررہے ہیں جو اس طبقہ کی زندگی میں اس طرح یکسانیت اور تسلسل کے ساتھ پائے جاتے ہیں جس طرح کسی درخت کے پتوں میں یکسانیت ہوتی ہے، یہ سب شجر نبوت کے برگ و بار ہیں اور اس "اصل" سے نکلے ہیں جس کے متعلق قرآن مجید کا ارشاد ہے،

أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ ۝ تُؤْتِي أُكُلَهَا	جس کی جڑ (خوب) مضبوط ہے اور اس کی شاخیں (خوب)
كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا[3]	اونچائی میں جارہی ہیں، وہ اپنا پھل ہر فصل میں اپنے پروردگار

---

[1] قلائد الجواہر ص۱۰ [2] ایضاً [3] سورہ ابراہیم ۲۴-۲۵

. . . . کے حکم سے دیتا رہتا ہے،

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے متعلق ان کے خادم شہادت دیتے ہیں کہ سحری جس میں ہر قسم کی چیزیں ہوتیں سامنے رکھتا، آپ اس میں سے بہت کم تناول فرماتے، باقی کیلئے ارشاد ہوتا کہ بچوں کیلئے حفاظت سے رکھ لو خواجہ عبدالرحیم جن کے ذمہ سحر کا لیجانا تھا بیان کرتے ہیں کہ اکثر ہوتا کہ حضرت خواجہ سحری میں سے کچھ نہ کھاتے، میں عرض کرتا کہ حضرت والا افطار کے وقت بھی بہت کم کھاتے ہیں، اگر سحری بھی کچھ نہ کریں گے تو ضعف بہت بڑھ جائیگا اس پر گریہ فرماتے اور کہتے کہ کتنے غریب اور بیکس مسجدوں کے کونوں اور چبوتروں پر بھوکے پڑے ہوتے ہیں اور فاقہ سے رات گزار دیتے ہیں، یہ کھانا میرے حلق سے کیسے اتر سکتا ہے چنانچہ اکثر ایسا ہوتا کہ سحری میں جیسی لاتا ویسی ہی اٹھا کر لے جاتا،

جب وفات کا وقت قریب ہوا تو تمام خدام و مریدین کو جو حاضر تھے طلب فرمایا اور ان کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ تم گواہ رہنا کہ اگر اقبال (خادم) نے کوئی چیز بھی گھر میں جنس سے بچا لی ہے تو کل روز قیامت اس کو خدا کے سامنے جواب دینا ہوگا، اقبال (خادم) نے عرض کیا کہ میں نے کچھ نہیں چھوڑا ہے، سب آپ پر صدقہ کر دیا ہے، اور واقعی اس جوانمرد نے ایسا ہی کیا تھا سوائے اس غلہ کے جو چند دن کیلئے فقرائے خانقاہ کو کفایت کرتا سب کو تقسیم کر دیا تھا، سید حسین کرمانی نے اطلاع دی کہ غلہ کے سوا ہر چیز محتاجوں کو پہونچ گئی، سلطان المشائخ اقبال سے ناراض ہوئے ان کو طلب کیا اور فرمایا کہ اس مردار ریت کو کیوں رکھ چھوڑا ہے؟ اقبال نے عرض کیا کہ غلہ کے سوا جو کچھ موجود تھا سب کچھ تقسیم ہو گیا ہے، آپ نے فرمایا کہ خلقت کو بلاؤ، جب لوگ حاضر ہوئے تو فرمایا کہ غلّہ کے انبار خانے توڑ ڈالو، اور تمام غلہ بے تکلف اٹھا لے جاؤ اور وہاں جھاڑو دیدو، ذرا سی دیر میں خلقت جمع ہو گئی اور اس نے غلہ کو لوٹ لیا[۱۵]،

اس طرز زندگی کا دوسرا نمونہ ہم بارہویں صدی کے ایک بزرگ سید محمد سعید ابناالوئی[۵۲] کی سیرت سے پیش

---

[۵۱] سیر الاولیاء، [۵۲] معروف بہ سید میراں بھیک، آپ حضرت شاہ ابوالمعالی انبیٹھوی کے خلیفہ تھے (م ۱۱۳۱ھ) سوانح کیلئے ملاحظہ ہو نزہۃ الخواطر ج ۶

کرتے ہیں، سیرت نگار لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ نواب روشن الدولہ ان کی زیارت کو حاضر ہوئے اور خانقاہ کی تعمیر کیلئے ۶۰ ہزار روپیہ (جس کی قیمت آج کل لاکھوں سے کم نہ ہوگی) ان کی خدمت میں پیش کیا، شیخ نے ان سے کہا کہ روپیہ کسی جگہ چھوڑ دیں اور آرام کریں جب روشن الدولہ واپس ہوئے تو آپ نے شہر اور قریب کے گاؤں اور قصبات کے تمام فقراء اہلِ حاجت اور یتیموں و بیواؤں کو دعوت عام دیدی اور ایک پیسہ بھی اپنے لئے نہ رکھا، جب روشن الدولہ سے دوبارہ ملاقات ہوئی تو آپ نے ان سے کہا کہ عمارت کی تعمیر میں وہ ثواب نہیں جو اہلِ حاجت و فقراء کی خدمت میں ہے،

ایک مرتبہ شاہ فرخ سیر نواب روشن الدولہ اور نواب عبداللہ خاں کے خطوط اور اس کے ساتھ تین لاکھ روپیہ کی رقم پہونچی، آپ نے سب قصبات و دیہات کے شرفاء و اہلِ حاجت میں تقسیم کر دی،[۵]

کہا جا سکتا ہے کہ یہ تو اس طبقۂ زہاد کا حال ہے جو دنیا اور اسباب دنیا سے پہلے ہی کنارہ کش ہو چکا ہے اور اس کو مخلوق سے کوئی واسطہ اور زندگی کے دھارے سے کوئی تعلق نہیں ہے، دیکھنے کی بات یہ ہے کہ زہد ایثار اور استغناء و بے نیازی کی یہ مثالیں امت کے دوسرے طبقوں میں بھی ملتی ہیں یا نہیں، تاریخ پورے اعتماد کے ساتھ اس کا جواب اثبات میں دیتی ہے، اس لئے کہ ہر اسلامی نسل، ہر اسلامی معاشرہ اور اسلامی ماحول، ہر اسلامی دور میں ایسے لوگ ہمیں ملتے ہیں جو ان چیزوں میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عامل اور اپنی زندگی، اپنے مال، اہل و عیال یہاں تک کہ اپنے پڑوسیوں اور ہم وطنوں کے ساتھ معاملہ میں اسی اخلاق نبوی کے حامل ہیں، تاریخ نے ان کے یہ جستہ جستہ واقعات ہمارے لئے محفوظ کر دئے ہیں اور ان میں سلاطین و امراء، علماء و صلحاء سب شامل ہیں

ہم اس موقع پر صرف دو طبقوں کا ذکر کرتے ہیں ایک اہل علم کا طبقہ اور دوسرا سلاطین و فاتحین کا،

علماء اسلام کی شرف نمائندگی کیلئے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کا نام سب سے زیادہ موزوں ہے، اسلئے کہ عام طور پر وہ لوگ جو ان سے ناواقف ہیں ان پر خشکی و بے روحی کا الزام لگاتے ہیں، اور یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا علم

---

[۵] نظام تعلیم و تربیت ج ۲ مناظر احسن گیلانی۔

اور ان کی عقل ان کے دل اور جذبات پر حاوی ہے، ان کے معاصر حافظ ابن فضل اللہ العمری لکھتے ہیں کہ :۔

"ان کے پاس سونے چاندی اور مال و اسباب کے ڈھیر آتے اور وہ سب کو تقسیم کر دیتے اور دامن جھاڑ کر اٹھ جاتے، اگر کسی چیز کو رکھتے بھی تو اس نیت سے کہ کسی کو دینا ہے"

ان کی داد و دہش اور جود و سخا کا یہ حال تھا کہ بعض وقت اپنے کپڑے تک اتار کر سائل کو دیدیتے تھے، حافظ ابن فضل اللہ لکھتے ہیں" وہ بکثرت صدقہ و خیرات کرتے اور جب کوئی چیز دینے کو نہ ہوتی تو بعض وقت اپنے کپڑے تک اتار کر اہل حاجت اور فقراء کو دیدیتے"

سلاطین و فاتحین کی نمائندگی کا حق سلطان صلاح الدینؒ ایوبی سے زیادہ اور کس کو پہونچتا ہے وہ اپنے عہد کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت کے فرماں روا تھے اور اپنے زمانہ کی سب سے بڑی فوجی طاقت کو انھوں نے شکست دی، ان کے رفیق ابن شداد شہادت دیتے ہیں کہ "سلطان نے اپنے ترکہ میں صرف ۴۷ درہم اور ایک سونے کا سکہ چھوڑا، باقی کوئی جائداد و ملکیت نہیں چھوڑی"

یہ عظیم فاتح اور فرماں روا جو ایشیا میں شام کے شمالی حدود سے لے کر افریقہ کے صحرا، نوبہ کے جنوب تک سارے علاقہ کا حکمران تھا دنیا سے اس حال میں رخصت ہوا کہ اس کے پاس اتنی رقم بھی نہ تھی جس سے اسکی تجہیز و تکفین کا سامان کیا جاسکے، ابن شداد لکھتے ہیں :۔

"ان کی تجہیز و تکفین میں ایک پیسہ بھی ان کی میراث سے صرف نہیں ہوا، سارا سامان قرض سے کیا گیا، یہاں تک کہ قبر کے لئے گھاس کے پولے بھی قرض سے آئے، کفن کا انتظام ان کے وزیر و کاتب قاضی فاضل نے کسی جائز و حلال ذریعہ سے کیا"

یہ کسی ایک نسل یا فکری و روحانی مکاتب خیال میں سے کسی ایک مکتب خیال کا ذکر نہیں ہے بلکہ تمام علماء ربانیین اور شیوخ کاملین کا ہر زمانہ میں یہی حال رہا ان کا اصول یہ تھا کہ "نیا دن، نیا رزق" وہ نہ کچھ جمع کرتے تھے نہ خرچ ہونے اور ختم ہو جانے کے ڈر سے بخل سے کام لیتے تھے، یہ کسی عہد رفتہ کی کہانی نہیں بلکہ اس زمانہ میں بھی ایسے علماء و مشائخ

موجود ہیں جو یہ پسند نہیں کرتے کہ ضرورت سے زائد کوئی چیز جس کے اللہ کے دوسرے بندے حاجت مند ہوں ان کے پاس باقی رہے یا رات اس حال میں گزرے کہ ان کے پاس فاضل روپیہ ہو یہ بات رہبانیت اور دنیا سے کنارہ کشی کی وجہ سے نہیں ہے نہ اس کی پشت پر خدا کے قانون میں دخل اندازی یا خدا کی آسان کردہ چیزوں میں تشدد پسندی یا اس کی حلال کی ہوئی چیزوں کو حرام قرار دینے کا جذبہ ہے، نہ انھوں نے مجبوری کی وجہ سے اس طرزِ زندگی کو اختیار کیا ہے بلکہ ان کے پیشِ نظر صرف محاسبہ کا خوف، خلقِ خدا پر شفقت، سنتِ رسول کی پیروی جود و عطا، ایثار و قربانی اور تمام اعمالِ صالحہ میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی اقتدا اور عملی مثالوں اور زندہ نمونوں کے ذریعہ ان کاموں کی خاموش ترغیب ہے، ان کے اس طرزِ عمل کا ان کے مریدین و اہلِ تعلق پر بہت گہرا اثر پڑتا تھا اور ان میں ان کے نقشِ قدم پر چلنے کا داعیہ اور جذبہ پیدا ہو جاتا تھا۔

عہدِ آخر میں اسلامی معاشرہ کی مابہ الامتیاز خصوصیت

اسلامی سوسائٹی اپنے نقائص اور کمزوریوں اور متعدد بیماریوں کے باوجود جس کا مقابلہ مصلحین امت برابر کرتے رہے ہیں اب بھی ہمدردی و غمخواری اور صدقہ و خیرات کے کاموں میں دوسری کسی سوسائٹی سے بہت ممتاز اور فائق ہے، باہمی ہمدردی اور اعانت و غمخواری کا جذبہ اسلامی تعلیمات کی بدولت اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کر گیا ہے، وہ مادہ اور معدہ کی پرستش سے بہ نسبت دوسرے معاشروں کے سب سے زیادہ آزاد ہے، اس کے علاوہ اس میں ایسے افراد کی کمی نہیں جو مادہ پرستی کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے رہتے ہیں اور اس کو دین اور اسلام کی اخلاقی قدروں کے دائرۂ اثر میں لانا چاہتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس میں تجارتی رقابت، انفرادی اور شخصی انانیت، اور دولت پرستی کا تناسب ان سوسائٹیوں کے بہ نسبت جو اس زندگی کے بعد کسی اور زندگی کی قائل نہیں اور عیش و آرام کے سوا اپنی زندگی کا کوئی مقصد نہیں رکھتیں اور خیالی معاشی معیاروں کے پیچھے دیوانہ وار سرپٹ دوڑ رہی ہیں، بہت کم ہے[1]۔

---

[1] مصنف سے حجاز کے بعض معمر اور معتبر بزرگوں نے جو اشراف کے عہد کو دیکھ چکے تھے خود بیان کیا کہ مکہ کے (باقی حاشیہ صفحہ ۲۱۴ پر)

یہ اسلامی معاشرہ کی موجودہ خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود اس کا ایک خاص امتیاز ہے، اس کے سامنے اجتماعی انصاف اور اعلیٰ انسانی قدروں کے اختیار کے مواقع دنیا کی ہر سوسائٹی سے زیادہ ہیں اور اس کا اصل سبب کسی نہ کسی درجہ میں اسلامی زندگی کا احترام اور اس ایمانی رشتہ کا وجود ہے جس نے اس کے تمام اجزا کو ایک لڑی میں پرو دیا ہے،

(باقی حاشیہ صفحہ ۲۱۳ کا) تاجر اس زمانہ میں اپنے ہم پیشہ تاجروں کے ساتھ بڑی خیر خواہی اور تعاون کا معاملہ کرتے تھے، انھوں نے یہ واقعہ سنایا کہ بعض تاجر ایسے تھے کہ شام کے وقت اگر کوئی خریدار ان کے پاس آتا اور وہ سمجھتے کہ جتنا حساب ایک دن کے لئے انھوں نے مقرر کیا تھا وہ پورا ہو چکا ہے اور اتنی بکری ہو گئی ہے جو ایک دن کے لیے کافی ہو جائے گی جبکہ اس کا پڑوسی تاجر اس دن زیادہ خوش قسمت ثابت نہیں ہوا ہے، تو وہ بڑی نرمی سے اس خریدار سے کہتا کہ میرے بغل میں جو دکان ہے یہ سامان آپ وہاں سے لے لیجئے کہ آج ان کے یہاں خریدار زیادہ نہیں آئے ہیں۔

محمد اسد صاحب نے ایک اور مشہور اسلامی شہر دمشق کی زندگی پر اسی سے ملتے جلتے تاثرات قلمبند کئے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ "یہاں پہونچکر مجھے ان عربیوں کے اندرونی سکون و اطمینان یا قلبی طمانیت کا سراغ مل گیا یہ دراصل اس معاشرت اور برتاؤ کا نتیجہ تھا جو وہ ایک دوسرے کے ساتھ کرتے تھے اس کے بعد وہ اس معاشرت اور برتاؤ کی نشاندہی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "یہ اندرونی سکون و اطمینان اس طریقہ میں نظر آیا جس طریقہ سے دکاندار اپنے گاہکوں سے برتاؤ کرتے ہیں، یہ لوگ جن میں خوف اور حسد کا کوئی شائبہ ہی نہیں معلوم ہوتا تھا، اگر کسی دکاندار کو اپنی کسی ضرورت سے غیر حاضر رہنا پڑتا تو وہ اپنے پڑوسی یا اپنے ہم پیشہ قریبی دکاندار کی نگرانی میں بے تکلف اپنی دکان چھوڑ کر چلا جاتا، اکثر ایسا ہوتا کہ کوئی گاہک آتا اور دکان کو خالی پاکر سوچنے لگتا کہ لاؤ دوسری جگہ سے سودا خرید لیں اس وقت وہ دکاندار اپنی دکان چھوڑ کر آجاتا اور سودا بیچتا، اپنا سودا نہیں اپنے غیر ساتھی کی دکان کا سودا اور قیمت اسکے کاونٹر پر رکھ دیتا، کیا یورپ میں بھی کبھی ایسی تجارت دیکھی گئی ہے؟"

("الطریق الی مکۃ صـ۱۶۷")

موجودہ زمانہ میں جو معاشی

رضاکارانہ اور فطری جذبۂ ہمدردی یا جبری اور محدود نظریۂ مساوات

اور ترقی پسندانہ تحریکیں

پیدا ہوئی ہیں ان کی قدر مشترک یہ ہے کہ وہ انسان اور انسانیت پر کوئی بھروسہ نہیں رکھتیں، ان تحریکوں کے داعیوں اور حامیوں نے جبری اور محدود طرز کی مساوات کو انسان کے فطری، اندرونی اور رضاکارانہ جذبۂ ہمدردی و خیر خواہی پر ترجیح دی ہے اور اس اہم حقیقت کو فراموش کر دیا ہے کہ صرف مال ہی انسان کی ضرورت نہیں، اور تنہا مال میں شرکت یا مساوات اس کے دل اور احساسات و جذبات کے خلا کو پر نہیں کر سکتی، اور نہ اس کے ہر زخم پر مرہم رکھ سکتی ہے، زندگی میں عام جذبۂ ہمدردی کی اس کو ذرائع آمدنی اور ذرائع پیداوار میں شرکت سے کہیں زیادہ ضرورت ہے، بعض اوقات ایک قطرۂ اشک جو کسی دکھے ہوئے دل کا غماز ہوتا ہے وہ کام کر جاتا ہے جو زر و جواہر اور لعل و گہر سے بھی نہیں ہوتا، ہر انسان کو اپنے بھائی کے تعاون کی ضرورت پڑتی ہے اور وہ بھی اس کے تعاون کے محتاج ہوتے ہیں، دونوں ایک دوسرے کی تکلیفوں اور دکھوں میں ہاتھ بٹاتے ہیں اس کو لطافت حس کی بھی ضرورت ہے اور نزاکت خیال کی بھی، دل کی گرمی، گرمجوشی، اور خندہ پیشانی کی بھی، خوش خلقی و خوش دلی اور بشاشت و انبساط کی بھی، اس کو پیش نظر رکھا جائے تو نظر آئے گا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی ہدایت و تعلیم ہمدردی و غمخواری کی تمام قسموں اور اس کے باریک سے باریک اور نازک سے نازک گوشوں پر حاوی ہے، اور اس میں انسانی احساسات کی سب سے سچی اور اچھی تصویر پیش کی گئی ہے، خیر خواہی اور نیکی کے کاموں اور صدقہ کی قسموں کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا۔

تعدل بین الاثنین صدقة وتعین	دو آدمیوں کے درمیان انصاف کر دو یہ صدقہ ہے
الرجل فی دابته فتحمله علیها او ترفع	کسی کو سہارا دے کر سواری پر بٹھاؤ تو یہ بھی صدقہ ہے
له علیها متاعه صدقة والکلمة	اس کا سامان اٹھا کر اوپر رکھ دو یہ بھی صدقہ ہے
الطیبة صدقة وبکل خطوة تمشیها	اچھی بات کہنا بھی صدقہ ہے، نماز کی طرف ایک قدم
الی الصلوٰة صدقة وتمیط الاذی عن	اٹھانا بھی صدقہ ہے اور راستہ سے کوئی خراب اور

الطریق صدقۃ[۱]۔ تکلیف دینے والی چیز (اینٹ پتھر کانٹے وغیرہ) ہٹادینا

بھی صدقہ ہے،

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ "مصیبت زدہ حاجتمند کی مدد کرے، دریافت کیا گیا کہ اگر ایسا نہ کر سکے، فرمایا کہ اچھائی اور نیکی کا حکم دے، صحابہ کرام نے پوچھا کہ اگر یہ بھی نہ کر سکے آپؐ نے ارشاد فرمایا برائی سے باز رہے یہ بھی صدقہ ہے[۲]"

ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ "اگر تم کسی کام کرنے والے کی مدد کرو یا کسی پھوہڑ[۳] کا کام بنا دو تو یہ بھی صدقہ ہے، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ اگر اتنا کمزور ہو کہ اس طرح کے بعض کام نہ کر سکے، ارشاد ہوا، اپنے شر سے لوگوں کو بچاؤ تو یہ تمہارے نفس پر تمہارا صدقہ ہوگا[۴]"

ایک اور دوسری حدیث میں ہے کہ "اپنے بھائی سے مسکراتے ہوئے ملنا بھی صدقہ ہے، اچھائی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا بھی صدقہ ہے، بھٹکے ہوئے آدمی کی رہنمائی کرنا اور راستہ بتانا بھی صدقہ ہے، جسے کم نظر آتا ہو اس کو اپنی نظر سے فائدہ پہونچانا بھی صدقہ ہے، راستہ سے پتھر، کانٹا، ہڈی ہٹا دینا بھی صدقہ ہے، اپنے ڈول سے اپنے بھائی کے ڈول میں پانی بھر دینا بھی صدقہ ہے[۵]"

انسان کی فطری ہمدردی پر جس کا سوتا دل کی گہرائیوں سے ابلتا ہے اور زندگی کی رگوں اور معاشرہ کے تمام گوشوں میں خون کی طرح جوش مارتا ہے، برآمد کی ہوئی مساوات کو (جو طاقت کے بل پر نافذ کی جاتی ہے) ترجیح دینے کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کمیونسٹ اور سوشلسٹ ملکوں میں ایسا معاشرہ پیدا ہو گیا جو انسانی ہمدردی سے ناآشنا اور جذبۂ خیر خواہی سے محروم ہے، اس کے افراد اس طرح کے تاجر بن گئے ہیں جو باہم دست و گریباں ہیں، نہ کوئی کسی پر بھروسہ کرتا ہے، نہ دوسرے کی خاطر اپنے حق سے کبھی دست بردار ہو سکتا ہے، ہر شخص ایک دوسرے

---

[۱] صحیحین [۲] صحیحین [۳] جس کو اس کام کا سلیقہ نہ ہو [۴] صحیحین [۵] صحیحین۔

کے خلاف جاسوسی میں مصروف ہے، اس کے خلاف جھوٹی خبریں اور جعلی دستاویزات تیار کرتا ہے اس کی مصیبت و ابتلا پر خوش ہوتا اور اس کی ترقی و کامیابی پر غمگین ہوتا ہے، غرض کہ پورا ملک ایک ایسا میدان کارزار بن جاتا ہے جہاں کسی کی جان محفوظ نہیں، یا کچہری و عدالت میں جہاں کسی کی آبرو کی ضمانت نہیں۔

اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں میں احساس ذمہ داری اور اپنے فرض کے صحیح طور پر بجاآوری کا جذبہ جس میں انسانی شرافت وعظمت کا راز پوشیدہ ہے بالکل مفقود ہوگیا ہے، وہ ہر پابندی ذمہ داری اور احساس فرض سے آزاد ہوکر بالکل چھٹے ہوئے آوارہ جانوروں کے مشابہ ہوگئے ہیں جن کو سوائے چرنے، جگہ جگہ منہ مارنے اور مسلسل کھاتے رہنے کے اور کوئی کام نہیں، ہر قسم کی ذمہ داری حکومتوں اور ان کی انتظامی مشنری اور ملک کے تعزیری قوانین پر ڈال دی گئی ہے، معاشرہ کے ساتھ ایک ایسے نابالغ بچہ کی طرح معاملہ کیا جاتا ہے جو عقل وتمیز سے بالکل محروم ہے، حکومت ہی سب کچھ لیتی دیتی ہے اور ہر شخص کی ضرورت پوری کرتی ہے، اس لئے ہمدردی اور رحمدلی، سخاوت وایثار اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون قدرتی طور پر بے معنی الفاظ بن گئے ہیں، ہر شخص کے حقوق کی ضمانت اور ضروریات زندگی کی کفالت حکومت اپنے ذمہ رکھتی ہے اور لوگ گونگے بہرے مشینی پرزوں کی طرح اس کے اشارہ پر چلتے ہیں، اس لئے قدرتی طور پر ان میں سے کسی چیز کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

اس کے برخلاف قدرتی، فطری اور قلب انسانی کے اندر سے ابھرنے والی ہمدردی اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والا سکون واطمینان، باطنی سعادت، باہمی اعتماد اور محبت ومودت، امن واطمینان، روح کی لذت، ضمیر کی آسودگی، انسانیت پر ناز اور زندگی کے تابناک پہلو کو دیکھنے کا ولولہ، اپنے فرض وذمہ داری کا مکمل احساس اسلام کے اولین معاشرہ میں اپنی تمام گہرائیوں، بلندیوں اور رعنائیوں کے ساتھ موجود تھا اور زندگی کے ہر شعبہ پر اس کی چھاپ تھی، لیکن انقلاب حال صرف اسی زمانہ تک محدود نہیں، جو انسانی معاشرہ جبری اور محدود مساوات کے مقابلہ میں اس جامع فطری اور رضاکارانہ جذبہ ہمدردی کو اپنا اصول اور نظام

زندگی بنائے گا اس کے سب افراد باہم شیر وشکر اور ایک دوسرے کے خیر خواہ اور ہمدرد بن جائیں گے، سب ایک دوسرے کا کھلے دل سے اعتراف کریں گے اور فراخ دلی سے اس کے حق میں شہادت دیں گے، ہر نسل اپنی گذشتہ نسل کیلئے سبقت وفضیلت کی شہادت دے گی، اور اس کیلئے قبولیت ومغفرت کی طلبگار اور دعا جو ہو گی۔

اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے متعلق ارشاد فرماتا ہے،

وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ [۱]

اور ان لوگوں کا (بھی حق ہے) جو ان کے بعد آئے (اور وہ) یہ دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو بخش دے اور ہمارے بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہیں اور ہمارے دلوں میں ایمان والوں کی طرف سے کینہ نہ ہونے دے، اے ہمارے پروردگار تو تو بڑا شفیق ہے، بڑا مہربان ہے۔

یہ وہ اسلامی معاشرہ ہے جس کا ہر فرد اپنے بھائی کا آئینہ ہے جو ہر تہمت اور ہر الزام اور ہر نقص اور عیب سے اس کو بری دیکھنا چاہتا ہے اور اس کیلئے وہی پسند کرتا ہے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے،

لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا ۙ وَّقَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ [۲]

جب تم لوگوں نے یہ (افواہ) سنی تھی تو کیوں نہ سب مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں نے اپنوں کے حق میں نیک گمان کیا اور (یہ کیوں نہ) کہہ دیا کہ یہ تو صریح طوفان بندی ہے

معاشرہ کی اس کیفیت کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بڑی بلیغ مثال سے بیان فرمایا ہے، آپؐ نے فرمایا کہ مسلمانوں کی مثال اپنی مودت وترحم اور شفقت میں ایک جسم واحد کی ہے اگر ایک عضو کو کوئی شکایت ہو جاتی ہے تو سارا جسم بخار اور بے خوابی کا شکار ہو جاتا ہے" [۳]

---

[۱] سورہ حشر ۔ ۱۰ [۲] سورہ نور ۔ ۱۲ [۳] صحیحین

یہ ایک ایسا معاشرہ ہے جس کا ہر رکن محافظ، دیانتدار، شریف اور امین، اور قابل بھروسہ ہے، حدیث میں ہے کہ "مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس کی خیانت کرتا ہے، نہ اس سے جھوٹ بولتا ہے، نہ اس کو رسوا کرتا اور بے یار و مددگار چھوڑتا ہے، مسلمان کی عزت، مال اور خون دوسرے مسلمان پر حرام ہے[1]"،

اس کے برعکس بہت سے ملکوں میں زندگی عذاب جان اور جہنم کا نمونہ بن گئی ہے،

كُلَّمَا دَخَلَتْ أُمَّةٌ لَّعَنَتْ أُخْتَهَا ؕ[2] جس وقت بھی کوئی (نئی) جماعت (دوزخ میں) داخل ہوگی اس کی ہمرنگ دوسری جماعت اس پر لعنت کریگی۔

چنانچہ جب کوئی ڈکٹیٹر آتا ہے تو اپنے پیشرو کو لعنت کرتا اور اس پر غداری، ملک دشمنی اور خیانت کا الزام لگانا اپنا فرض سمجھتا ہے، جس کو ایک دن کیلئے بھی اقتدار مل جاتا ہے وہ اپنے دشمنوں، رقیبوں اور مخالفوں سے سخت سے سخت انتقام لینا چاہتا ہے اور اس کیلئے ہر قسم کی سفاکی، ظلم و تشدد اور خوں ریزی جائز سمجھتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے،

وَإِذَا تَوَلَّىٰ سَعَىٰ فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ۝[3]

اور جب پیٹھ پھیر جاتا ہے تو اس دوڑ دھوپ میں رہتا ہے کہ زمین پر فساد کرے، اور کھیتی اور جانوروں کو تلف کرے درانحالیکہ اللہ فساد کو (بالکل) پسند نہیں کرتا،

اب اگر کسی کو یہی پر مشقت اور طویل راستہ اور تلخ و ناکام تجربہ پسند ہے تو اس کے لئے قرآن مجید کا یہ ارشاد کافی ہے۔

أَتَسْتَبْدِلُونَ الَّذِي هُوَ أَدْنَىٰ بِالَّذِي تو کیا جو چیز ادنیٰ ہے تم اسے لینا چاہتے ہو اس

---

[1] ترمذی [2] سورہ اعراف ـ ۳۸ [3] سورہ بقرہ ـ ۲۰۵

هُوَ خَيْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ[1] چیز کے مقابلہ میں جو بہتر ہے (تو خیر) کسی شہر میں اتر پڑو (وہیں) مل جائے گا جو کچھ تم مانگتے ہو،
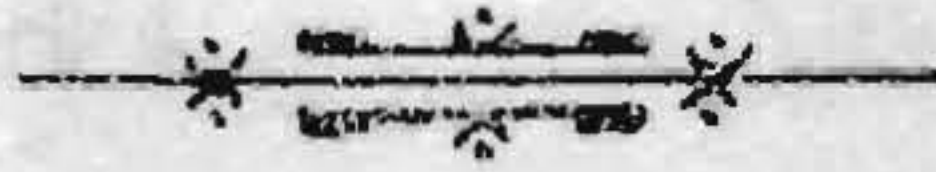
[1] سورہ بقرہ — ۶۱

روزہ

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ○

(اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے جیسا کہ ان لوگوں پر فرض کئے گئے تھے جو تم سے قبل ہوئے ہیں،

عجب نہیں کہ تم متقی بن جاؤ۔ سورہ لبقرہ — ۱۸۳)

روزہ

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝[1]

اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے جیسا کہ ان لوگوں پر فرض کئے گئے تھے جو تم سے قبل ہوئے ہیں، عجب نہیں کہ تم متقی بن جاؤ۔

نہ حیوان نہ فرشتے

انسان، حیوانات اور فرشتوں کی درمیانی مخلوق ہے، اس میں ان دونوں متضاد جنسوں کے طبائع بہت لطیف اور نازک طریقہ پر ودیعت کئے گئے ہیں، وہ ملکوتی صفات اور حیوانی خصوصیات کا عجیب وغریب مجموعہ ہے، جس منصب کیلئے وہ نامزد کیا گیا ہے اور جن مقاصد کی تکمیل خدا کی طرف سے اس کے سپرد کی گئی ہے اور اس میں اس کی استعداد اور صلاحیت بھی پیدا کی گئی ہے اس کیلئے نہ فرشتے موزوں ہیں نہ جانور، یہ خلافت، امانت، اور عبادت کا منصب جلیل ہے جس کو قرآن مجید میں اس طرح بیان کیا گیا ہے،

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ

اور (وہ وقت یاد کرو) جب تیرے پروردگار نے فرشتوں

---

[1] سورہ بقرہ ۔ ۱۸۳

فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْہَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْہَا وَیَسْفِکُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ وَنُقَدِّسُ لَکَ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝[1]

سے کہا میں زمین پر اپنا نائب بنانا چاہتا ہوں، وہ بولے کیا تو اس میں ایسے کو بنائے گا جو اس میں فساد برپا کریگا اور خون بہائے گا، درآنحالیکہ ہم تیری حمد کی تسبیح کرتے رہتے ہیں، اور تیری پاکی پکارتے رہتے ہیں؟ (اللہ نے) فرمایا یقیناً میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

دوسری جگہ آتا ہے،

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَہَا وَاَشْفَقْنَ مِنْہَا وَحَمَلَہَا الْاِنْسَانُ اِنَّہٗ کَانَ ظَلُوْمًا جَہُوْلًا ۝[2]

ہم نے (یہ) امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کی، سو ان سب نے انکار کیا اس سے کہ اسے اٹھائیں اور وہ اس سے ڈرے، اور اسے انسان نے اپنے ذمہ لے لیا بیشک وہ بڑا ظالم ہے، بڑا جاہل ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ۝ مَآ اُرِیْدُ مِنْہُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِیْدُ اَنْ یُّطْعِمُوْنِ ۝[3]

اور میں نے تو جنات اور انسان کو پیدا ہی اسی غرض سے کیا ہے کہ میری عبادت کیا کریں، میں ان سے نہ روزی چاہتا ہوں اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ مجھے کھلایا کریں۔

خلافت کے تقاضے اور اسکے لوازمات

منصب خلافت نہ صرف اس ہستی سے جس کی خلافت کا فرض اس کے سپرد کیا جارہا ہے بہت مناسبت چاہتا ہے بلکہ اس جگہ سے بھی اس کو مناسبت ہونی چاہیئے جہاں رہ کر اس کو یہ فرض انجام دینا ہے، اس مخلوق سے بھی اس کو پوری مناسبت ہونی چاہیئے جن کی ذمہ داری، اور نگرانی اور حکومت و تولیت اس کے ذمہ ہے چنانچہ پہلی چیز سے اس نے اس اخلاق کا پرتو اور ان صفات عالیہ کا عکس قبول کیا جن کو ہم پاکی اور بلندی،

---

[1] سورہ بقرہ ۔ ۳۰ [2] سورہ احزاب ۷۲ [3] سورہ ذاریات ۔ ۵۶ ۔ ۵۷

بے نیازی و استغنا، رحم و کرم، ہمدردی و شفقت، صبر و حلم، قوت و قہر، صفائی و پاکیزگی، اور امن و سلامتی سے تعبیر کرسکتے ہیں اسکی دلیل یہ ہے کہ اپنی طویل تاریخ کے ہر دور میں اس نے ان اخلاق فاضلہ میں ہمیشہ بڑی لذت اور عزت محسوس کی، اور انکے حاملین کو عزت کی نگاہ سے دیکھا اور اگر کبھی اسکی ہمت اس سے قاصر رہی اور وہ خود ان صفات سے آراستہ نہ ہوسکا تو اس نے دوسروں کو (جو ان صفات کے حامل تھے) عظمت و محبت کے ساتھ اپنے سر پر بٹھایا اور انکو خوش نصیب اور کامیاب و بامراد سمجھا،

دوسری چیز سے بھی اس نے اس کے خواص و طبائع اخذ کئے، اور اس کے کمزور پہلوؤں میں شرکت محض اسلئے گوارا کی، کہ وہ اپنے دکھ درد میں اس کو شریک سمجھ سکے، زمین کے خزانوں، دفینوں اور سرچشموں اور دنیا کی نعمتوں اور پاک چیزوں سے فائدہ اٹھاسکے، اور ان کو صحیح محل میں صرف کرسکے، مثال کے طور پر کھانے پینے کی خواہش، جنسی جذبہ، بھوک پیاس، راحت طلبی، جدت پسندی، صنعت و حرفت اور ماکولات و مشروبات میں وسعت و تنوع اس کی سرشت میں داخل ہے۔

روح و جسم کی باہمی کشمکش اور اُن کے متضاد میلانات

اس لحاظ سے وہ روح اور جسم دونوں کا مجموعہ ہے، روح اس کو اپنے اصل منبع اور سرچشمہ کی طرف کھینچتی ہے، اس کو اس کا منصب، مرکز، مقصد اور فریضہ یاد دلاتی ہے، اس کے سامنے وہ روزن کھولتی ہے جس سے وہ اس نئے عالم کی وسعت و بلندی اور لطافت و جمال کا مشاہدہ کرسکے، وہ اس کے دل میں اس کا شوق پیدا کرتی اور اس کا حوصلہ بڑھاتی ہے، کثیف اور ثقیل مادیت کے خلاف بغاوت پر اور اس قفس زریں سے رہائی پر اکساتی ہے اور ان لامحدود وسعتوں میں پرواز پر آمادہ کرتی ہے جو مادیت کی ان پستیوں سے کوئی علاقہ نہیں رکھتیں، وہ انسان کو اس بات کی دعوت دیتی ہے کہ وہ کبھی کبھی (خواہ سال میں ایک ہی مرتبہ ہو) خورد و نوش اور عادت و حاجت کے اس بندھے ٹکے نظام سے آزاد ہوکر زندگی کے چند لمحے گزارے، اسباب رزق کی فراوانی کے باوجود بھوک اور پیاس کا مزہ چکھے اور اس میں وہ لذت محسوس کرے جو انواع و اقسام کے لذیذ ترین کھانوں میں بھی

محسوس نہیں ہوتی، وہ اس مختصر وقفہ کو جو فراغ خاطر، سکون قلب، صفائے نفس، معدہ کی سبکساری ولطافت، روح کی بالیدگی، خواہشات نفسانی سے آزادی، اور زندگی کے خشک، فرسودہ، یکساں اور بے رنگ نظام سے تھوڑے عرصہ کیلئے علیحدگی میں گزارتا ہے، زندگی کی اصل قیمت، اور نفس کی تازگی، سبک روحی، اور مسرت و انبساط کا بہترین وقت قرار دیتی ہے اور اس کیلئے اس طرح بے قرار رہتی ہے جس طرح کوئی پرندہ دن بھر کے سفر کے بعد شام کو اپنے آشیانہ کیلئے بے قرار ہوتا ہے یا مچھلی پانی کے لیے، یہ سب اسی روح کا کرشمہ ہے جو عالم غیب اور عالم قدس سے اس کی طرف منتقل ہوئی ہے،

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ [۱]	اور آپ سے یہ روح کی بابت پوچھتے ہیں۔ آپ کہہ دیجیے کہ روح میرے پروردگار کے حکم سے (ہی) ہے،
وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ [۲]	اور اس میں اپنی طرف سے روح پھونک دی ۔

دوسری طرف جسم بھی اس کو اپنے اصل مرکز کی طرف کھینچتا ہے، یہ مرکز زمین ہے جو اپنے ساتھ ہر قسم کی کثافت اور پستی رکھتی ہے، اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے،

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ [۳]	اور بالیقین ہم نے انسان کو کس دار گارے کی کھنکھناتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا۔

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

فَاسْتَفْتِهِمْ اَهُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمْ مَّنْ خَلَقْنَا اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ [۴]	تو آپ ان سے پوچھیے کہ خلقت میں یہ لوگ زیادہ مضبوط ہیں یا وہ جنھیں ہم نے پیدا کیا ہے، ہم نے ان لوگوں کو تو چپکتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا ہے۔

ایک اور جگہ آیا ہے۔

---

[۱] سورہ بنی اسرائیل - ۸۵ [۲] سورہ حجر - ۲۹ [۳] سورہ حجر - ۲۶ [۴] سورہ صافات - ۱۱

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ [۱] اسی نے انسان کو پیدا کیا (ایسی) مٹی سے جو ٹھیکرے کی طرح بجتی تھی۔

جب روح کی گرفت انسان پر کمزور پڑ جاتی ہے اور اس کے اثرات کم ہونے لگتے ہیں یا زائل ہو جاتے ہیں اور زمام اقتدار جسم کے ہاتھ میں آجاتی ہے تو پھر انسان خواہش نفس اور لذت پسندی کے دھارے میں بالکل بے قابو ہو کر بہنے لگتا ہے، وہ آوارہ مویشیوں کی طرح ہر جگہ منھ مارتا ہے اس کو کھانے پینے اور خواہشات نفس پوری کرنے کا جنون ہو جاتا ہے وہ اس میں بڑے تکلف، اختراع اور باریک بینی سے کام لیتا ہے اور اپنی ذہانت سے اس میں ایسے ایسے نئے راستے پیدا کرتا ہے جو عقل و دستور، طب و صحت اور قانون و شریعت کی تمام حدود کو توڑ دیتے ہیں، اس کی تمام تر صلاحیت و ذہانت کھانوں کو زیادہ سے زیادہ لذیذ، پر تکلف، اور متنوع بنانے میں صرف ہونے لگتی ہے، وہ ہاضم دواؤں اور بھوک کھولنے والے مشروبات ایجاد کرتا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ کھانے اور جلد سے جلد ہضم کرنے کا موقع مل سکے، اور یہ سلسلہ بلا کسی وقفہ کے برابر جاری رہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنی ساری ترقی و دانائی کے باوجود اور علم اور مادی خوشحالی کی اس بلند ترین سطح پر ہوتے ہوئے بھی کولھو کے بیل اور زمین جوتنے والے جانور کی طرح ہو جاتا ہے اور اس کا دائرہ عمل صرف دو چیزوں کے درمیان محدود رہتا ہے، کھانے کے کمرے (ڈائننگ ہال) اور بیت الخلا [۲]، وہ ان دونوں کے سوا کسی اور مبدأ و معاد سے ناواقف، اور اس "طواف" کے سوا کسی اور طواف وسعی سے ناآشنا رہتا ہے، کھانے پینے کی خواہش کے سوا اس میں ہر چیز کی خواہش مر جاتی ہے اور آرام طلبی اور عیش پرستی کی حس کے سوا ہر حس کند ہو جاتی ہے اس کی تمام فکریں صرف ایک فکر میں ڈھل جاتی ہیں، وہ صرف اسلئے کماتا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ کھا سکے، اور اس لئے کھاتا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ کما سکے، قرآن مجید نے انسانوں کے اس طبقہ یا "انسان نما" جانوروں کے اس ریوڑ کی جو معجزانہ تصویر کھینچی ہے اس سے سچی اور نازک تصویر نہیں ہو سکتی، وہ کہتا ہے:

---

[۱] سورہ رحمٰن - ۱۴ [۲] یہ تمثیل مولانا عبد الباری صاحب ندوی کے ایک مضمون سے ماخوذ ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ۝ [۱]

اور جو کافر ہیں وہ عیش کر رہے ہیں اور کھا (پی) رہے ہیں جس طرح چوپائے کھاتے (پیتے) ہیں، آگ ہی ان کا ٹھکانا ہے،

دراصل یہ جسم کا مزاج اور خاصیت ہے جو روحانیت اور نبوت کی روشنی سے محروم، ہوائے نفس کا پرستار اور اپنے مرکز اصلی کی طرف مائل ہے اور خود بخود پستی کی طرف بڑھتا اور زمین پر گرتا ہے،

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ۝ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ۝ [۲]

اور ان لوگوں کو اس شخص کا حال پڑھکر سنایئے جس کو ہم نے اپنی نشانیاں دی تھیں، پھر وہ ان سے بالکل نکل گیا سو شیطان اس کے پیچھے لگ گیا، اور وہ گمراہوں میں داخل ہو گیا، اور اگر ہم چاہتے تو ہم اس کا مرتبہ ان (اپنی نشانیوں) کے ذریعہ سے اونچا کر دیتے، لیکن وہ زمین کی طرف مائل ہو گیا اور اپنی خواہش نفسانی کی پیروی کرنے لگا، سو اس کی مثال کتے کی سی ہو گئی کہ اگر تو اس پر حملہ کرے (جب بھی) ہانپے، اسے چھوڑے رہے (جب بھی) ہانپے، یہ مثال ہے ان (سب) لوگوں کی جنھوں نے جھٹلایا ہماری نشانیوں کو، سو آپ بیان کیجیے (یہ) حالات شاید کہ لوگ سوچیں،

انسانی زندگی اور مذاہب و اخلاق کی تاریخ میں اس کشمکش کے اثرات

انسان کی مذہبی اور اخلاقی تاریخ دراصل

---

[۱] سورہ محمدؐ۔ ۱۲ [۲] سورہ اعراف۔ ۱۷۵۔ ۱۷۶

اسی کشمکش کی کہانی ہے، چنانچہ جب کبھی اس کی پہلی طبیعت غالب آئی اور اس کو اقتدار حاصل ہوا تو اس نے رہبانیت کی داغ بیل ڈالی، اور زندگی میں مبالغہ کی حد تک تقشف، مباحات و طیبات سے انکار، اور نفس پر ظلم کا راستہ اختیار کیا اور جسم کو اذیت پہنچانے اور نفس کو فقر و فاقہ میں مبتلا کرنے کو عین سعادت قرار دیا اس نے رات رات بھر جاگنا شروع کیا اور آبادیوں کو چھوڑ کر جنگلوں کی راہ لی، قرون وسطیٰ کے یورپ میں عیسائی راہبوں کے واقعات جو سب کو معلوم ہیں[1] دراصل اسی جذبہ کے آئینہ دار ہیں۔

وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا[2]

اور رہبانیت کو انھوں نے خود ایجاد کر لیا ہم نے ان پر واجب نہیں کیا تھا، انہیں نے اللہ کی رضامندی کی خاطر (اسے اختیار کر لیا تھا) سو انھوں نے اس کی رعایت پوری پوری نہ کی۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان کا جسم اور عقل دونوں کمزور ہو گئے، خاندانوں کا شیرازہ منتشر ہو گیا اور انسانی سوسائٹی سخت خطرہ سے دوچار ہو گئی، انسان اس منصب خلافت سے کنارہ کش ہو گیا جس کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اس پر ڈالی تھی، اس نے جد وجہد اور ذمہ داری کے میدان کو چھوڑ کر فرشتوں کو اپنا آئیڈیل بنا لیا اور ان کا محسود اور مسجود بننے کے بجائے خود ان پر رشک و حسد کرنے لگا۔

کبھی اس میں حیوانی صفات اور ارضی و جسمانی رجحانات کا ایسا غلبہ ہوا کہ وہ عقل و شریعت کی ہر بندش اور اخلاق و روحانیت کی ہر گرفت اور بالادستی سے آزاد ہو کر مادہ اور معدہ کے تیز دھارے میں بہنے لگا اور اپنی جسمانی و نفسانی خواہشات اور مادی تقاضوں کی تسکین اور تکمیل کیلئے ہر کام کرنے پر تیار ہو گیا، اور اس کیلئے

---

[1] اس کی تفصیل کے لئے "لیکی" کی کتاب History of European Morals by W. E. H. Lecky یا مصنف کی کتاب "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" باب پنجم، عنوان "جنون رہبانیت" ملاحظہ ہو۔ [2] سورہ حدید - ۲۷

اس نے کسی حد، مقدار اور نصاب کی رعایت بھی ملحوظ نہ رکھی، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے روح اور دل کی انگیٹھیاں بالکل سرد ہو گئیں، عقل اور ضمیر سکڑتے گئے، اور معدہ نے اتنا طول و عرض اختیار کر لیا کہ بعض وقت پورے پورے خاندان کی غذا اور خوراک ایک انسان کی ہوس "نائے و نوش" کے لئے ناکافی ثابت ہونے لگی، اس کے جسم میں ایک ایسا مصنوعی اور خیالی معدہ اور ایک ایسی جوع البقر پیدا ہو گئی جو کھانے کی بڑی سے بڑی مقدار اور غلہ کے وافر ذخیروں سے بھی نہ بجھتی تھی، اس کے نتیجہ میں قدرتی طور پر ایسے مظالم اور جرائم وجود میں آئے جنھوں نے انسان کو ایک بے رحم اور پھاڑ کھانے والا درندہ بنا دیا، جو نہ صرف بنی نوع انسان بلکہ خود اپنے خاندان کے افراد کو پھاڑ کھاتا اور نگل لیتا ہے، تاریخ کی یہ ساری جنگیں اور مہم جوئیاں (جہاد کو مستثنیٰ کر کے جو خالص دینی مقاصد کیلئے کیا جاتا ہے) دراصل اسی شخصی انانیت یا جماعتی عصبیت، حرص و طمع، توسیع پسندانہ جذبات، اقتدار کی ہوس اور طاقت کے جنون کا مظہر ہیں،

معدہ کی پرستش اور اسکے مہلک اثرات

جب یہ حیوانی جبلت انسان پر غالب آتی ہے اور زندگی کی زمام اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے اور انسان کے احساسات و جذبات اور اعصاب اس کی مکمل گرفت میں آجاتے ہیں اور سارا انسانی نظام "معدہ" کے گرد گردش کرنے لگتا ہے تو پھر انسان اور اس کی خواہشات کی تکمیل کے راستہ میں کوئی چیز حائل نہیں ہوتی، اس کے نفس پر ہر وہ چیز گراں اور شاق ہوتی ہے جو اس کی خواہش کی راہ میں مزاحم ہو یا اس کو اس کا انجام یاد دلائے، حساب و کتاب اور جزا و سزا کی تلقین کرے، بعض اوقات اس کی پوری پوری عمر گزر جاتی ہے اور پرسکون دل، بیدار دماغ، اور زندہ ضمیر کا کوئی لمحہ اس کو نصیب نہیں ہوتا، عبادت اور ذکر الٰہی سے اس کی طبیعت پر گرانی اور بوجھ محسوس ہوتا ہے اور اس کو اس میں یا اس طرح کی چیزوں میں قدرتی طور پر کوئی لذت معلوم نہیں ہوتی اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے۔

وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ الَّذِيْنَ (اور وہ بیشک گراں ہے، مگر خشوع رکھنے والوں پر نہیں)

يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝[1]

جنھیں اس کا خیال رہتا ہے کہ انھیں اپنے پروردگار سے ملنا (بھی) ہے، اور اس کا کہ انھیں اس کی طرف واپس ہونا ہے،

وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝[2]

اور یہ لوگ جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو بہت ہی کاہلی سے کھڑے ہوتے ہیں (صرف) لوگوں کو دکھاتے ہیں۔ اور اللہ کی یاد کچھ یوں ہی سی کرتے ہیں،

انسان کے مقصد زندگی کی تکمیل اور اعلیٰ اخلاقی قدروں کی تشکیل کے لئے نبوت کی چارہ سازی

نبوت نے تاریخ انسانی کے مختلف وقفوں اور کرۂ ارض کے مختلف حصوں میں اس انسانیت کی چارہ سازی کی جو انتہا پسندانہ مادیت اور حیوانی بغاوت کی زد میں آکر ہلاکت سے قریب ہو چکی تھی، اس نے اخلاق و روحانیت، لطیف احساسات اور نفس کے مارے اور مادیت کے کچلے ہوئے مفلوج اور نیم جاں دل کو معدہ کی قساوت اور خواہشات کی آلودگی سے پاک و صاف کیا اور اس کو اس مقصد زندگی کی تکمیل کیلئے نئے سرے سے تیار کیا، جس کو "عبادت" کہا جاتا ہے اس کو اس کمال انسانی سے آراستہ کیا جس کو "ولایت" کہا گیا ہے اور اس منصب اور اس مشن کی تکمیل کے قابل بنایا جس کی خاطر اس کو دنیا میں اتارا گیا ہے اور جس کو "خلافت" سے تعبیر کیا گیا ہے،

یہ وہ کام ہے جو نہ تنہا فرشتوں والی روحانیت سے انجام پا سکتا تھا نہ بہائم والی مادیت سے، اس کیلئے ہر سال ایسے روزہ کا انتظام کیا گیا جو معدہ پرستانہ مادیت میں کسی قدر تخفیف کر سکے، زندگی کے کھوئے ہوئے نشاط، تازگی اور قوت کو دوبارہ واپس لا سکے اور اس کے اندر ایمان اور روحانیت کی اتنی مقدار

---

[1] سورہ بقرہ - ۴۵ - ۴۶ [2] سورۂ نساء - ۱۴۲

داخل کرسکے جس کے ذریعہ زندگی کے اعتدال اور توازن کو برقرار رکھنا ممکن ہو نفس کی ترغیبات کا مقابلہ اور پُرخوری کے مفاسد کا سدباب ہوسکے، انسان کچھ وقفہ کیلئے اپنے اندر اخلاق الٰہی کا کسی قدر عکس اتار سکے اور اس میں سے کچھ حصہ پاکر سرفراز و سرخرو ہوسکے، ملائکہ اور ملاءِ اعلیٰ سے اس کو نسبت حاصل ہو، روح اور قلب کی پرفضا وسعتیں اور آسمان و زمین کی سلطنتیں اس کی جولان گاہ ہوں اور اس کو وہ نئی لذت حاصل ہو جو انواع و اقسام کے کھانوں یا ہر وقت کھاتے رہنے اور آخری حد تک پیٹ بھر لینے کی لذت سے بہت بلند، لطیف، حقیقی اور دائمی ہے،

روزہ کے مقاصد اور زندگی پر اسکے اثرات

امام غزالیؒ نے اپنے مخصوص انداز بیان میں اس حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:۔

"روزہ کا مقصد یہ ہے کہ آدمی اخلاق الٰہیہ میں سے ایک اخلاق کا پرتو اپنے اندر پیدا کرے جس کو صمدیت کہتے ہیں، وہ امکانی حد تک فرشتوں کی تقلید کرتے ہوئے خواہشات سے دست کش ہو جائے، اس لئے کہ فرشتے بھی خواہشات سے پاک ہیں اور انسان کا مرتبہ بھی بہائم سے بلند ہے، نیز خواہشات کے مقابلہ کے لئے اس کو عقل و تمیز کی روشنی عطا کی گئی ہے، البتہ وہ فرشتوں سے اس لحاظ سے کمتر ہے کہ خواہشات اکثر اس پر غلبہ پالیتی ہیں اور اس کو ان سے آزاد ہونے کے لئے سخت مجاہدہ کرنا پڑتا ہے، چنانچہ جب وہ اپنی خواہشات کی رو میں بہنے لگتا ہے تو اسفل سافلین تک جا پہونچتا ہے اور جانوروں کے ریوڑ سے جا ملتا ہے اور جب اپنی خواہشات پر غالب آتا ہے تو اعلیٰ علیین اور فرشتوں کے آفاق تک پہونچ جاتا ہے"[1]

---

[1] احیاء العلوم ج ۱ صـ ۲۱۲

علامہ ابن القیمؒ اسی بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"روزہ سے مقصود یہ ہے کہ نفس انسانی خواہشات اور عادتوں کے شکنجہ سے آزاد ہو سکے، اسکی شہوانی قوتوں میں اعتدال اور توازن پیدا ہو اور اس ذریعہ سے وہ سعادت ابدی کے گوہر مقصود تک رسائی حاصل کر سکے اور حیات ابدی کے حصول کے لئے اپنے نفس کا تزکیہ کر سکے، بھوک اور پیاس سے اس کی ہوس کی تیزی اور شہوت کی حدت میں تخفیف پیدا ہو اور یہ بات یاد آئے کہ کتنے مسکین ہیں جو نان شبینہ کے محتاج ہیں، وہ شیطان کے راستوں کو اس پر تنگ کر دے اور اعضاء و جوارح کو ان چیزوں کی طرف مائل ہونے سے روک دے جن میں کی دنیا و آخرت دونوں کا نقصان ہے، اس لحاظ سے یہ اہل تقویٰ کی لگام، مجاہدین کی ڈھال اور ابرار و مقربین کی ریاضت ہے"۔[1]

علامہ موصوف روزہ کے اسرار و مقاصد پر نہایت بلاغت کے ساتھ روشنی ڈالتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:۔

"روزہ جوارح ظاہری اور قوائے باطنی کی حفاظت میں بڑی تاثیر رکھتا ہے، فاسد مادہ کے جمع ہو جانے سے انسان میں جو خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں اس سے وہ اس کی حفاظت کرتا ہے، جو چیزیں مانع صحت ہیں ان کو خارج کر دیتا ہے اور اعضاء و جوارح میں جو خرابیاں ہوا و ہوس کے نتیجہ میں ظاہر ہوتی رہتی ہیں وہ اس سے دفع ہوتی ہیں، وہ صحت کیلئے مفید اور تقویٰ کی زندگی اختیار کرنے میں بہت ممد و معاون ہے"

اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ — اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۱۵۲

الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ جیسا کہ ان لوگوں پر فرض کئے گئے تھے جو تم سے قبل
لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ [1] ہوئے ہیں عجب نہیں کہ تم متقی بن جاؤ۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

الصوم جُنّۃ روزہ ڈھال ہے،

چنانچہ ایسے شخص کو جو نکاح کا خواہشمند ہو اور استطاعت نہ رکھتا ہو روزہ رکھنے کی ہدایت کی گئی ہے اور اسکو اسکا تریاق قرار دیا گیا ہے مقصود یہ ہے کہ روزہ کے مصالح اور فوائد چونکہ عقل سلیم اور فطرت صحیحہ کی رو سے مسلمہ تھے اسلئے اسکو اللہ تعالےٰ نے اپنے بندوں کی حفاظت کی خاطر محض اپنی رحمت اور احسان سے فرض کیا ہے۔[2]

اسی سلسلہ کلام میں آگے ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"چونکہ قلب کی اصلاح اور استقامت حال سلوک الی اللہ اور جمعیت باطنی پر منحصر ہے اور اللہ تعالےٰ کی طرف بالکلیہ توجہ وانابت پر اس کا دارومدار ہے اس لئے پراگندہ خاطری اس کے حق میں سخت مضر ہے، کھانے پینے کی زائد مقدار، لوگوں سے زیادہ میل جول، ضرورت سے زیادہ گفتگو وہ چیزیں ہیں جن سے جمعیت باطنی میں فرق آتا ہے اور انسان اللہ تعالےٰ سے منقطع ہو کر مختلف راستوں پر بھٹکنے لگتا ہے بعض وقت محض اسی وجہ سے اس کی راہ کھوٹی ہوتی ہے، ان سب باتوں کی وجہ سے اللہ تعالےٰ کی رحمت اس کی مقتضی تھی کہ اپنے بندوں پر روزہ فرض کرے اور اس کے ذریعہ کھانوں کی زائد مقدار اور خواہشات کے فضلہ کا ازالہ وتنقیہ ہو سکے جس کی وجہ سے آدمی وصول الی اللہ سے محروم رہتا ہے وہ اس سے دنیا وآخرت دونوں جگہ فائدہ اٹھا سکے اور اس کی عارضی اور مستقل کسی مصلحت کو نقصان نہ پہونچے۔"[3]

---

[1] سورہ بقرہ - ۱۸۳ [2] زاد المعاد ج ا ص ۱۵۲ [3] زاد المعاد ج ا ص ۱۶۵

روزہ قدیم مذاہب میں

دنیا کے جن قدیم مذاہب وادیان اور تاریخ کے جن مذہبی قوانین ورسوم میں ہم کو "روزہ" ملتا ہے، ان قدیم ترین مذاہب میں ہندوستان کا ہندو مذہب بھی ہے، جس سے اس ملک کی بہت بڑی تعداد وابستہ ہے اس مذہب کے ایک نمائندہ (T. M. P. Mahadevan) جو مدراس یونیورسٹی میں شعبۂ فلسفہ کے صدر بھی ہیں ہندو مذہب اور ہندو سماج میں روزہ کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں،

"ان تہواروں میں جن کو سالانہ منایا جاتا ہے بعض تہوار روزہ (برت) کیلئے مخصوص ہیں جو تزکیہ نفس کیلئے رکھا جاتا ہے ہر ہندو فرقہ نے دعا و عبادت کے لئے کچھ دن مقرر کرلئے ہیں جن میں اس کے اکثر افراد روزہ رکھتے ہیں، کھانے پینے سے باز رہتے ہیں، رات رات بھر جاگ کر اپنی مذہبی کتابوں کی تلاوت کرتے اور مراقبہ کرتے ہیں، ان میں سب سے اہم اور مشہور تہوار جو مختلف فرقوں میں رائج ہے" ویکنتا ایکادشی" کا تہوار ہے جو" وشنو" کی طرف منسوب ہے لیکن اس میں صرف وشنو ہی کے ماننے والے نہیں بلکہ دوسرے بہت سے لوگ بھی روزہ رکھتے ہیں، اس تہوار میں وہ دن میں روزہ رکھتے ہیں اور رات کو پوجا کرتے ہیں۔

بعض دن ایسے ہیں جو عورتوں کے ساتھ مخصوص ہیں، وہ ان دیبیوں سے دعائیں کرتی ہیں جو ایشور کی ان نسوانی صفات کا مظہر ہیں جو مختلف اشکال میں ظاہر ہوئی ہیں، ان دونوں کو ان کی مخصوص اہمیت کے پیش نظر "برت" یا عہد و معاہدہ کہا جاتا ہے اور یہ روح کے تزکیہ کیلئے مخصوص ہیں اور ان کا مقصد روح کو معنوی غذا پہونچانا ہے[۱]"

مولانا سید سلیمان ندوی نے سیرۃ النبی جلد پنجم میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے حوالہ سے لکھا ہے کہ:۔

"قدیم مصریوں کے ہاں بھی روزہ دیگر مذہبی تہواروں کے شمول میں نظر آتا ہے، یونان میں

---

۱ Outlines of Hinduism Chapter 4, Section 6.

صرف عورتیں تھسموفیریا کی تیسری تاریخ کو روزے رکھتی تھیں، پارسی مذہب میں گو عام پیروؤں پر روزہ فرض نہیں، لیکن ان کی الہامی کتاب کی ایک آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ روزہ کا حکم انکے یہاں موجود تھا خصوصاً مذہبی پیشواؤں کے لئے تو پنجسالہ روزہ ضروری تھا۔[۱]

روزہ یہودیوں میں جہانتک یہودیوں کا تعلق ہے عہد بابل میں روزہ انکے نزدیک ماتم اور سوگ کا رمز بن گیا تھا، اگر کوئی خطرہ درپیش ہوتا یا کوئی کاہن کسی الہام اور نبوت کیلئے تیاری شروع کرتا تو اس وقت روزہ ضرور رکھا جاتا، یہودی اس وقت بھی عارضی طور پر روزہ رکھتے جب وہ سمجھتے کہ خدا ان سے ناراض ہے، ملک میں کوئی وبا آتی مصیبت نازل ہوتی، قحط سالی کا سامنا ہوتا یا بادشاہ کسی بڑی مہم پر روانہ ہوتے تب بھی روزہ رکھا جاتا،

یہودی تقویم میں روزہ کے دن محدود اور قدیم ہیں، یہ اس کفارہ کے روزہ کے علاوہ ہیں جو موسوی مذہب میں واحد روزہ ہے، اس کے علاوہ ان کے ہاں "مسلسل روزہ" کے بھی موسم ہیں جن کا تعلق قدیم حوادث اور واقعات سے ہے، مثلاً بابل کے عہد میں زمانہ 'اسیری'، یہ چوتھے مہینہ (مئی) اور پانچویں مہینہ (جون) اور چھٹے مہینہ تشری (جولائی) اور دسویں مہینہ تبت (Tebet) میں پڑتے ہیں، "تلمود" کے بعض عالموں کا خیال ہے کہ ان دنوں کے روزے عہد غلامی میں لازمی اور آزادی وخوشحالی کے زمانہ میں اختیاری ہیں،

ان روزوں کے علاوہ کچھ روزے اور بھی ہیں جو ان مختلف المناک حوادث کی یاد میں رکھے جاتے ہیں جو یہودیوں کے ساتھ پیش آئے، یہ روزے بھی دوسرے روزوں کے ساتھ شامل کر لئے گئے ہیں، یہ لازمی اور جبری نہیں ہیں اور ان کو عوام میں زیادہ مقبولیت بھی حاصل نہیں ہو سکی، تھوڑے اختلاف کے ساتھ ان کی تعداد ۲۵ ہے،

ان کے علاوہ کچھ روزے اور ہیں جو مقامی اور علاقائی کہے جا سکتے ہیں، ان کا تعلق بھی یہودیوں کے تاریخی مصائب سے ہے، بہت سے روزے مختلف طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں، ہر طبقہ ایک مخصوص

---

[۱] سیرت النبی ج ۵ ص ۲۱۳

اور المناک تاریخی واقعہ کی یاد میں یہ روزہ رکھتا ہے یا غمی خوشی کی تقریبات کی یادگار کے طور پر اس کو مناتا ہے سال کے پہلے دن کا روزہ یہودیوں کے بہت سے طبقوں میں رائج ہے، بہت سے روزے یہودی عالموں کے اختیار میں ہیں، جو قحط سالی، کسی خطرہ اور مصیبت، یا حکومت وقت کے ظالمانہ قوانین، نیز مختلف آفتوں اور بلاؤں سے حفاظت کے لئے اپنی صوابدید پر وقتاً فوقتاً یہ روزے عوام پر فرض کرتے رہتے ہیں،

کچھ انفرادی روزے بھی ہیں جن کو ہر شخص اپنے حالات اور ضروریات کے پیش نظر رکھ سکتا ہے، یہ روزے بھی شخصی واقعات کی یاد میں گناہوں کے کفارہ کیلئے، یا کسی مصیبت اور افتاد کے وقت رحمت خداوندی کے حصول کیلئے رکھے جاتے ہیں، لیکن یہود کے علماء و فقہاء کے نزدیک یہ روزے اس شخص کیلئے ہیں جو خود عالم یا معلم ہو تاکہ اس کی جمعیت خاطر میں کوئی فرق نہ آنے پائے اور اس کی صحت پر بُرا اثر نہ پڑے، نیز ڈراونا خواب بھی دیکھ کر روزہ رکھا جاتا ہے، عید کے مواقع پر یہودی شریعت میں روزہ رکھنا ممنوع ہے لیکن "تلمود" نے ان دنوں میں روزہ رکھنے کی اجازت اس شرط پر دی ہے کہ عام دنوں میں اس کا کفارہ روزہ ہی کے ذریعہ ادا کیا جائے،

روزہ یہودیوں میں اشراق کے وقت سے شروع ہوتا ہے اور رات کے پہلے تارہ کے طلوع تک جاری رہتا ہے سوائے اس روزہ کے جو کفارہ کیلئے ہے[1]، اور مئی کے نویں روز[2] رکھا جاتا ہے، یہ روزہ شام سے شام تک چلتا ہے، عام روزوں کے لئے کوئی خاص احکام و قوانین نہیں ہیں روزہ میں صدقہ دینے اور مسکینوں کو کھانا کھلانے کی بھی ترغیب دی گئی ہے خصوصاً رات کے اس کھانے کی غرباء میں تقسیم پر جو معمولاً تیار کیا جاتا ہے زیادہ زور دیا گیا ہے

---

[1] یہ ساتویں مہینہ (تشری) TISRI کے دسویں دن رکھا جاتا ہے دیکھئے کتاب Judaism in Islam by Abraham I. Katish- New York 1954. نیز کتاب "الیہودیۃ والاسلام" (Jewish Encyclopaedia) U.S.A (1916)

[2] یہ روزہ ہیکل کے پہلی یا دوسری بار جلانے کی یادگار میں رکھا جاتا ہے،

ماہ آب کے پہلے نو دن اور تموز کی سترہویں تاریخ اور آب کی دسویں تاریخ کے درمیانی دن جزئی روزہ کیلئے مخصوص ہیں یعنی اس میں صرف گوشت کھانا اور شراب پینا منع ہے، [۱]

عیسائیوں میں روزہ کے احکام

عیسائیوں میں روزہ کی حقیقت کیا ہے، اس کی تفصیل اور تشریح کچھ دشوار طلب ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسیحی شریعت فقہ اور احکام کے لحاظ سے دوسرے مذاہب سے پیچھے ہے، اس کے احکام و قوانین زمانہ کے ساتھ اور سیاسی و اجتماعی عوامل کے اثر سے اکثر بدلتے رہے ہیں، اس سلئے اس پر شریعت الٰہیہ کے لفظ کا اطلاق بہت مشکل ہے، تاہم اس کا مختصر خاکہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے اس سے ان تغیرات کا بھی اندازہ ہو گا جو مختلف اوقات میں اس میں برابر ہوتے رہے،

"حضرت مسیح نے اپنی نبوت کے آغاز سے قبل ۴۰ دن روزہ رکھا تھا، وہ کفارہ کا روزہ تھا جو موسوی شریعت میں فرض کے درجہ میں ہے، وہ اسکو اسی طرح پابندی کے ساتھ رکھتے تھے جو کوئی مخلص یہودی رکھ سکتا ہے، انھوں نے روزہ کے کچھ احکام اپنے پیچھے نہیں چھوڑے، انھوں نے صرف اس کے اصول و کلیات بیان کئے اور اس کی تشریح و تطبیق کلیسا پر چھوڑ دی چنانچہ عیسائیت میں کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ روزہ کے احکام و قوانین خود اس کے نکالے ہوئے ہیں، مسیحی مصادر میں "پولس" کے روزہ کا ذکر ملتا ہے، اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ پہلے زمانہ کے وہ عیسائی جو یہودی النسل تھے کفارہ کا روزہ برابر رکھتے تھے، راہب LUKE نے اس کا خاص اہمیت سے ذکر کیا ہے لیکن وہ عیسائی جو دوسرے اصولوں کی طرف اپنا انتساب کرتے ہیں اس پر زور نہیں دیتے،

"پولس" کے انتقال کے ڈیڑھ سو سال بعد لوگوں میں روزہ کے قوانین کو ضبط میں لانے کی شدید خواہش پیدا ہوئی بہت سے راہب اور کلیسا کے ذمہ دار جنسی ترغیبات کے مقابلہ کیلئے بھی روزہ کی تلقین کرتے تھے، اس زمانہ میں اس کا بہت خیال رکھا جاتا تھا کہ روزہ کوئی ایسی خارجی چیز بن کر نہ رہ جائے جو روزہ دار پر کوئی اثر نہ ڈال سکے، "ایرنیس" کا روزہ کے اقسام کے متعلق یہ بیان ہے کہ روزہ ایک دن کا بھی ہوتا تھا اور دو دن کا بھی اور مسلسل

[۱] یہ معلومات جیوش انسائیکلوپیڈیا سے ماخوذ ہیں Jewish Encyclopaedia.

۱۴ گھنٹے کا بھی، یہ صورت حال مدتوں برقرار رہی" دکھوں اور صلیب کے جمعہ" کا روزہ ایک عوامی اور مقبول روزہ تھا جو دوسری صدی مسیحی میں بعض ممالک میں رائج تھا، اسی طرح جو لوگ بپتسمہ کے خواہشمند ہوتے تھے وہ بھی ایک دن یا دو دن کا روزہ رکھتے تھے اور اس میں بپتسمہ کرنے اور کرانے والے دونوں شریک ہوتے تھے،

عیسائیوں کے مختلف فرقوں میں روزہ کے طریقہ اور احکام کے معاملہ میں جزئی اختلافات بھی پائے جاتے ہیں[۱]، روزہ کی تنظیم اور قانون سازی کا سب سے زیادہ کام دوسری اور پانچویں صدی (مسیحی) کے درمیانی وقفہ میں انجام پایا، اس وقت کلیسا نے بعض احکام اور ہدایات پر مشتمل ایک بیان شائع کیا، چوتھی صدی مسیحی میں روزہ میں تشدد اور سختی کا عنصر بہت بڑھ گیا اور اس سے توسع، نرمی، اور لچک کی خاصیت جاتی رہی ایسٹر (عید الفصح) سے قبل دو دن روزے کیلئے مخصوص کر دئے گئے تھے، ان دونوں کا روزہ نصف شب کو ختم ہوتا تھا، بیماروں کو جو ان دنوں میں روزہ رکھنے سے معذور تھے سنیچر کو روزہ رکھنے کی اجازت تھی، تیسری صدی مسیحی میں روزہ کے دن مقرر کئے گئے، روزہ کے اختتام پر بھی بہت اختلاف تھا، بعض لوگ مرغ کی بانگ پر افطار کرتے تھے اور بعض لوگ تاریکی اچھی طرح پھیل جانے پر،

۴۰ دن کے روزہ کا کوئی سراغ چوتھی صدی مسیحی تک ہم کو نہیں ملتا، مختلف ممالک کی آب وہوا، ماحول، اور طرز زندگی بھی روزہ پر اثر انداز تھا، چنانچہ رومیوں کا روزہ "اسکندریہ" اور "لاتان" کے روزہ سے مختلف ہوتا تھا، بعض لوگ جانوروں کے گوشت سے پرہیز کرتے تھے، بعض اس کو جائز سمجھتے تھے، کچھ لوگ صرف مچھلی اور پرندوں کے گوشت پر اکتفا کرتے تھے، بعض لوگ انڈے اور پھلوں سے پرہیز کرتے تھے، کچھ صرف سوکھی روٹی کھاتے تھے، اور بعض لوگ ان سب چیزوں کو ناجائز سمجھتے تھے، بعد میں حضرت مسیح کی زندگی کے اہم واقعات، اور مسیحی تاریخ کی روشنی میں مختلف روزے تجویز ہوئے جو مرور زمانہ کے ساتھ اپنی شکل بدلتے رہے۔ اس کے علاوہ ملکوں کے اختلاف کے لحاظ سے روزے بھی زیادہ تر ایک، دوسرے سے مختلف ہوتے تھے،

---

[۱] دیکھئے "انسائیکلوپیڈیا مذاہب واخلاق"

عہد اصلاح کے بعد انگلستان کے کلیسا نے روزے کے دن تو مقرر کئے لیکن روزہ کے آداب واحکام اور حدود و قوانین روزہ دار کے ضمیر اور احساس ذمہ داری پر چھوڑ دئے گئے، البتہ ایڈورڈ ششم جیمس اول اور الزبتھ کے عہد میں انگلستان کی پارلیمنٹ نے روزہ کے دنوں میں گوشت خوری ممنوع قرار دے دی اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ مچھلیوں کے شکار اور بحری تجارت کی ہمت افزائی اور اس سے نفع اندوزی ضروری ہے،[۱]

یہی وجہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے روزہ کا حکم نازل فرمایا اور مسلمانوں پر اسکو فرض کیا تو یہ ارشاد فرمایا،

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ[۲]

اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے جیسا کہ ان لوگوں پر فرض کئے گئے تھے جو تم سے قبل ہوئے ہیں عجب نہیں کہ تم متقی بن جاؤ۔

روزوں کے تعین و تعداد میں آزادی اور خودرائی کے مفاسد

بعض قدیم مذاہب اور شریعتوں میں روزہ کے دنوں کی کوئی تعیین یا تفصیل نہیں ملتی ان مذاہب میں ان کے ماننے والوں کو خود اس بات کا اختیار تھا کہ وہ جو دن چاہیں روزہ کے لئے مقرر کریں ان کو اس کا اختیار تھا کہ کھانے پینے کو بالکل ترک کردیں یا صرف تقلیل غذا پر اکتفا کریں، ان کو بعض چیزوں کے ترک کا حکم تھا بعض کو اختیار کرنے کی ہدایت تھی، جیسا کہ ہندوستان کے بعض مذاہب میں اسی پر عمل ہے، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ بعض آدمی گوشت کھانا ناجائز سمجھتے تھے اور بعض صرف اس کھانے سے احتراز کرتے تھے جو آگ پر پکایا گیا ہو، بعض لوگ صرف نمکین پانی یا اسی طرح کی دوسری چیزوں کو کافی سمجھتے تھے،[۳] ان تمام چیزوں نے روزہ کی روح کو سخت نقصان پہونچایا اور اس کی طاقت اور اثر کو بہت کمزور کردیا، چونکہ سارا اختیار

۱؎ اقتباس از مقالہ (Fasting Christian) Encyclopaedia of Religion and ETHICS

۲؎ سورہ بقرہ — ۱۸۳ ۳؎ گاندھی جی اور ان کے متبعین بھی اسی آخری

صفحہ میں آتے ہیں اور ان کے برت کی نوعیت اسی سے ملتی جلتی ہے،

روزہ دار کو حاصل تھا اور روزہ کے دن کھانے کی مقدار اور ان کی قسموں کا تعین سب اسی کے سپرد تھا اس لئے اس میں قدرتی طور پر سستی، غفلت، اور خیانت کی عادت پیدا ہوگئی، لوگوں نے حدود سے تجاوز کرنا شروع کر دیا اس کی نگرانی اور محاسبہ بہت دشوار تھا اس لئے کہ اگر روزہ خور سے یہ کہا جاتا کہ تم روزہ کے دن کھا کیسے رہے ہو، تو وہ کہہ سکتا تھا کہ میرا روزہ ختم ہو چکا ہے، اسی طرح اگر کسی سے کہا جاتا کہ افطار کے وقت تم روزہ کیسے ہو تو وہ یہ جواب دے سکتا تھا کہ میرا روزہ تو اب شروع ہوا ہے، یہی وہ چیز تھی جس کی وجہ سے قدیم اقوام اور مذاہب روزہ کے روحانی اور اخلاقی فوائد سے بالکل محروم ہوگئے بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں روزہ کی حقیقت ان کے ہاتھ سے نکل گئی، روزہ کے دن اور اوقات کے تعین اور اس کے احکام کی تفصیل میں سب سے بڑا راز، سب سے بڑی حکمت دراصل یہی ہے،

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں:۔

"روزہ میں اختیار دیدینے سے تاویل اور فرار کا دروازہ کھل جائیگا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا دروازہ بند ہو جائے گا اور اسلام کی یہ سب سے بڑی اطاعت غفلت کا شکار ہو جائے گی۔"[۱]

اس کے بعد اس کی مقدار و تعداد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اسکی (مدت کی) تعیین بھی ضروری تھی تاکہ اس میں افراط و تفریط کا موقع نہ ہو، اگر ایسا نہ ہوتا تو کوئی اسپر اتنا عمل کرتا کہ جس سے اسکو کوئی فائدہ نہ پہونچتا اور کوئی اثر مرتب نہ ہوتا اور کوئی اتنا غلو سے کام لیتا، اور اتنی کثرت کرتا کہ اس کی ناطاقتی اور کمزوری حد کو پہونچ جاتی اور وہ نیم مردہ ہو کر رہجاتا، اصل میں روزہ تریاق ہے جو نفس کے زہر کو مارنے کے لئے مہیا کیا جاتا ہے، اس لئے اس میں ضرورت کی رعایت ضروری ہے۔"

غذا کی تقلیل و تعیین یا مطلق ممانعت

شاہ روزہ کی دونوں قسموں (یعنی ایک وہ روزہ جس میں کھانے پینے اور ان تمام چیزوں سے جو روزہ

---

[۱] حجۃ اللہ البالغہ۔ ج ۲ ص ۳۷

کے منافی ہیں یکسر پرہیز کیا جاتا ہے اور دوسرے وہ روزہ جس میں بعض چیزوں سے پرہیز کیا جاتا ہے اور بعض سے نہیں)
کے درمیان موازنہ کرتے ہوئے اول الذکر کو ترجیح دیتے ہیں اور تجربہ، تحلیل علمی، اور علم النفس کی روشنی میں اس کی
افضلیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"تقلیل غذا کے دو طریقے ہیں ایک یہ کہ خوراک کی مقدار کو کم کر دیا جائے، دوسرے یہ کہ کھانوں کے درمیان وقفہ اتنا طویل کر دیا جائے کہ یہ مقصد پورا ہو سکے، شریعت میں یہی آخر الذکر صورت اختیار کی گئی ہے اس لئے کہ اس سے بھوک اور پیاس کا صحیح اندازہ ہوتا ہے حیوانی خواہشات پر چوٹ پڑتی ہے، اور محسوس طور پر نظر آتا ہے کہ اس میں کمی آئی ہے، اس کے برخلاف اول الذکر صورت میں قبل اس کے کہ آدمی پر کوئی خاص اثر مرتب ہو، غذا کے تسلسل کی وجہ سے یہ بات پیدا نہیں ہو پاتی، دوسرے یہ کہ اول الذکر کیلئے کوئی عمومی قانون بنانا بہت مشکل بات ہے اس لئے کہ لوگ مختلف حالات رکھتے ہیں، ایک آدمی ایک پاؤ کھاتا ہے، دوسرا آدھ سیر کھاتا ہے، چنانچہ اس قسم کے تعین سے اگر ایک کا بھلا ہو گا تو دوسرے کا نقصان بھی ہو گا۔"[1]

وہ کہتے ہیں کہ اس تعین اور اوقات کی پابندی میں اعتدال ضروری ہے، لکھتے ہیں:۔

"یہ بھی ضروری تھا کہ یہ مدت تکلیف مالایطاق میں مبتلا کرنے والی نہ ہو مثلاً تین دن تین راتیں، اس لئے کہ یہ شریعت کے موضوع سے خارج اور اس کے مقصد کے خلاف ہے اور عام طور پر اس پر عمل بھی ناممکن ہے"[2]

مسلسل روزہ یا توڑ توڑ کر

روزہ کی شکل قدیم مذاہب میں زیادہ تر یہ تھی کہ توڑ توڑ کر مختلف دنوں میں رکھتے تھے، وہ سال کے مختلف دنوں میں تقسیم تھا نیز اسکے درمیان میں اتنے طویل وقفے ہوتے تھے کہ اس کی تاثیر ہی ختم ہو جاتی تھی اور قبل اس کے کہ انسان کے رجحانات

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۳۷ [2] ایضاً ص ۳۱

وخیالات اور جذبات واحساسات پوری طرح اس رنگ میں رنگ پائیں اس کا سلسلہ ٹوٹ جاتا تھا، حکمت و مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ یہ دن تسلسل کے ساتھ گزریں، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اس مسئلہ پر لکھتے ہیں :۔

"یہ ضروری تھا کہ کھانے پینے سے پرہیز کا موقع بار بار آئے تاکہ اطاعت کی مشق ہو ورنہ ایک دفعہ کا بھوکا رہنا (خواہ جس قدر سخت اور تکلیف دہ بھوک ہو) کچھ فائدہ نہیں پہونچا سکتا" [1]

ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ اسلامی شریعت ان تمام شرائط وصفات کی جامع ہے، اور اس سے وہ تمام روحانی اخلاقی، نفسیاتی اور اجتماعی فوائد اور ثمرات حاصل ہوتے ہیں جو مقصود ہیں اور اس کا بڑا حصہ اس روزہ کی شکل میں ہے جو مسلمانوں پر فرض کیا گیا ہے،

رمضان سے پہلے "عاشورا" کے روزہ کا حکم ہے جس کو یہودی رکھا کرتے تھے اور حجاز کے عرب بھی اسکے عادی تھے، یہ موضوع تشریح طلب ہے اور اس کو کسی قدر تفصیل سے یہاں بیان کیا جا رہا ہے۔

عاشورا کا روزہ

امام بخاریؒ ... اپنی سند کیساتھ ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں .... کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو آپ نے دیکھا کہ یہودی عاشورا کا روزہ رکھتے ہیں، آپ نے پوچھا کہ یہ کیا ہے، عرض کیا گیا کہ یہ وہ دن ہے جس میں اللہ تعالےٰ نے بنی اسرائیل کو ان کے دشمنوں سے نجات دی تھی اور حضرت موسیٰؑ نے اس کی یاد میں روزہ رکھا تھا، آپ نے فرمایا کہ میں موسیٰ کا تم سے زیادہ حقدار ہوں، پھر آپ نے اس دن روزہ رکھا اور اس کا حکم بھی دیا" [2]

مسلم کی روایت میں یہ ہے کہ یہ بہت بڑا دن ہے اس دن اللہ تعالےٰ نے موسیٰ اور ان کی قوم کو نجات دی تھی اور فرعون اور اس کی قوم کو غرق کر دیا تھا، اس خوشی میں حضرت موسیٰ نے اس دن روزہ رکھا تھا، امام بخاری نے ہجرت کے باب میں ابی بشرؓ کی روایت سے اتنا اضافہ کیا ہے کہ ہم بھی ان کی تعظیم میں روزہ رکھتے ہیں، امام مسلم ابن عباسؓ سے روایت کرتے ...... ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۳۷ [2] بخاری "کتاب الصوم"

تو آپؐ نے دیکھا کہ یہودی عاشورا کا روزہ رکھتے ہیں جب ان سے پوچھا گیا تو انھوں نے کہا کہ یہ وہ دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ اور بنی اسرائیل کو فرعون پر غالب کیا اس لئے ہم تعظیماً اس دن روزہ رکھتے ہیں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم موسیٰؑ کے تم سے زیادہ حق دار ہیں پھر آپؐ نے اس دن روزہ کا حکم کیا[1]۔

طبرانی معجم میں روایت کرتے ہیں کہ "جب حضور صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو آپ نے دیکھا کہ یہودی عاشورا کا روزہ رکھتے ہیں، آپ نے دریافت فرمایا کہ یہ کون سا دن ہے، انھوں نے کہا کہ عاشورا اس دن موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے نجات پائی تھی، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم موسیٰ کی اتباع کے زیادہ حق دار ہیں،

مشہور ماہر ریاضیات ابوالریحان بیرونی (م ۔۴۴۴ھ) نے اس کو بہت مستبعد قرار دیا ہے اور یہودی تقویم اور عربی تقویم کے موازنہ کے بعد ان احادیث کی صحت میں شک کیا ہے، وہ اپنی کتاب "الآثار الباقیہ عن القرون الخالیہ" میں لکھتا ہے۔

"کہا جاتا ہے کہ عاشورا عبرانی لفظ ہے[2] جو معرب ہو کر عاشورا ہو گیا ہے اس سے مراد یہود کے مہینہ "تشری" کا دسواں روز ہے جس کا روزہ "یوم الکبور" YOM KIPPUR کہلاتا ہے، اس کو عربوں کے مہینہ میں شمار کیا جانے لگا اور ان کے سب سے پہلے مہینہ کا دسواں روز قرار پایا جس میں یہودیوں کے پہلے مہینہ کا دسواں روز تھا، اس کا روزہ ہجرت کے پہلے سال فرض کیا گیا، پھر اس کے بعد رمضان کے مہینہ نے اس کو منسوخ کر دیا، ایک روایت یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے اور آپؐ نے دیکھا کہ

---

[1] صحیح مسلم ج ۱ کتاب الصوم (باب الصوم یوم عاشورا)

[2] ابن منظور نے لسان العرب (ج ۶ ص ۲۴۵) میں لکھا ہے کہ عاشورا و عشورا دونوں مد کے ساتھ ہیں، یہ محرم کا دسواں دن ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نواں ہے ازہری نے لکھا ہے کہ فاعولاء کے وزن پر اس قسم کے اسماء بہت کم آئے ہیں۔

یہودی عاشورا کا روزہ رکھتے ہیں تو آپ نے اس کے متعلق دریافت فرمایا، لوگوں نے عرض کیا کہ یہ وہ دن ہے جس میں اللہ تعالٰے نے فرعون اور اس کی قوم کو غرق کر دیا تھا اور موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو نجات دی تھی، آپ نے یہ سن کر فرمایا کہ "ہم موسیٰ ؑ کے ان سے زیادہ حقدار ہیں" پھر آپؐ نے اس دن روزہ رکھا اور اپنے اصحاب کرام کو بھی اس کی ہدایت کی، جب رمضان کا روزہ فرض ہوا تو آپ نے عاشورا کے روزہ کا نہ حکم دیا، نہ اس سے منع ہی فرمایا لیکن یہ روایت صحیح نہیں ہے اس لئے کہ تحقیق اس کے خلاف پڑتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہجرت کے پہلے سال محرم کا پہلا دن جمعہ کا تھا جو ۱۶ تموز ۹۳۳ سنہ اسکندر کے مطابق ہے، دوسری طرف یہودیوں کے اس سال کا پہلا دن ۱۲ ایلول اتوار کا دن ہے جو ۲۹ صفر کے مطابق ہے، اس لحاظ سے عاشورا کا روزہ ۹ ربیع الاول منگل کو ہونا چاہیئے، جب کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ہجرت ربیع الاول کے نصف اول ہی میں ہوئی ان دونوں تاریخوں کا تطابق ہر حالت میں ناممکن ہے"

وہ کہتا ہے کہ:۔

"ان کا یہ کہنا بھی کہ اس دن اللہ تعالٰے نے فرعون کو غرق کیا تھا تورات کی روایت کے خلاف ہے، اس کی غرقابی کا واقعہ تورات کے بیان کے مطابق ۲۱ "نیسن" میں پیش آیا تھا جو ایام الفطیر کا ساتواں دن ہے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مدینہ تشریف آوری کے بعد یہودیوں کے عید الفصح کا پہلا روزہ منگل ۲۲ آذار" ۹۳۳ سنہ اسکندر ہے جو ۷ ا رمضان کے مطابق ہے اس لئے اس روایت کی کوئی اساس نہیں"[1]

بیرونی کا یہ بیان (اسکی حساب دانی اور غیر معمولی ذہانت کے اعتراف کے ساتھ) متعدد مفروضوں پر

---

[1] الآثار الباقیہ عن القرون الخالیہ ص ۳۳۱

قائم ہے،

اس کا پہلا مفروضہ تو یہ ہے کہ یہ گفتگو جو حضرت ابن عباسؓ اور دوسرے صحابہ سے منقول ہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مدینہ تشریف آوری کے پہلے ہی دن ہوئی تھی، اس لئے کہ ان کے الفاظ یہ ہیں۔

لمّا قدم النبی صلے اللہ علیہ وسلم المدینۃ أو لمّا دخل المدینۃ۔	جب حضور مدینہ تشریف لائے یا جب حضور صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ میں داخل ہوئے؛

حالانکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ہجرت تو ربیع الاول کے نصف اول میں ہوئی تھی، یہ وہم دراصل فن حدیث سے اس کی بے تعلقی اور صحابہ کرام کے طرز کلام اور ان کی تعبیرات سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے، یہ اسلوب احادیث میں بکثرت ملتا ہے ابو داؤد میں انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ۔

قدم النبی صلے اللہ علیہ وسلم المدینۃ ولھم یومان یلعبون فیھما، فقال ماھذان الیومان، قالوا: کنّا نلعب فیھما فی الجاھلیۃ، فقال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قد أبدلکم اللہ بھما خیرًا منھما یوم الأضحٰی ویوم الفطر۔	رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے اور وہاں دو دن ایسے تھے جن میں لوگ جشن مناتے تھے، آپ نے دریافت فرمایا کہ یہ دن کیسے ہیں عرض کیا گیا کہ عہد جاہلیت میں یہ ہمارے کھیل تماشے کے دن تھے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالےٰ نے ان دونوں کے بدل میں تم کو دو دن اس سے بہتر عطا کئے ہیں عید الفطر اور عید الاضحےٰ،

تو کیا اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح ہوگا کہ آپ کی تشریف آوری عین اسی دن ہوئی تھی جو ان کے کھیل تماشہ کا دن تھا اور کیا دونوں ایک دن میں جمع ہو سکتے ہیں، اسی قسم کی تعبیرات کھجور کی پیوند کاری وغیرہ کے سلسلہ میں بھی آئی ہیں، علامہ ابن حجر عسقلانی اس مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"ان کو اس حدیث میں اشکال محض اس خیال کی بنا پر ہوا کہ جب حضور صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ

تشریف لائے تو آپ نے یہودیوں کو عاشورا کے روزہ کی حالت میں پایا اور آپ کی تشریف آوری مدینہ ربیع الاول میں ہوئی، اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث کا مفہوم وہ نہیں جو بیرونی نے سمجھا ہے بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ آپؐ کو اس بات کا سب سے پہلے علم مدینہ تشریف لانے کے بعد ہوا اور آپؐ نے اس کے متعلق سوال بھی سب سے پہلے وہیں کیا، مطلب یہ ہے کہ جب حضور صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے اور عاشورا تک قیام فرمایا تو آپ نے دیکھا کہ یہود اس دن روزہ سے ہیں[1]"

اس کے بعد اب اس حدیث اور مذکورہ بالا حسابی تحقیق میں کوئی تضاد باقی نہیں رہتا،

ان کا دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ حدیث میں جس صوم عاشورا کا ذکر ہے وہ یہود کے مذہبی مہینہ "تشری" کا دسواں روز ہے جس کو "یوم کبور" کہا جاتا ہے یعنی کفارہ کا روزہ جو یہودیوں میں بہت مشہور و معروف ہے، اور جس کا اور تمام دنوں اور روزوں کی بہ نسبت زیادہ اہتمام کیا جاتا ہے یہ ان کی شریعت اور مذہبی کتابوں میں اسی صیغہ یعنی Yom Kirpur کے ساتھ مذکور ہے اور اسکو انگریزی میں Day of Atonement. کہتے ہیں[2] لیکن یہ مفروضہ حدیث کے الفاظ کے خلاف ہے، تورات بھی اس کی تصدیق نہیں کرتی اس لئے کہ یہ ان کے کسی بہت بڑے گناہ اور کسی تاریخی اور قومی جرم[3] کے کفارہ کے طور پر رکھا گیا ہے اور اس کو غم و ماتم و تعذیب نفس کا دن کہا گیا ہے،

"لاویین یا سفر الاحبار" میں کفارہ کے دن کا ذکر (جو ساتویں مہینہ "تشری" کا دسواں روز ہے) اس طرح ملتا ہے،

"اور یہ تمہارے لئے ایک دائمی قانون ہو کہ ساتویں مہینہ کی دسویں تاریخ کو تم اپنی جان کو دکھ دینا، اور اس دن کوئی خواہ وہ دیسی ہو یا پردیسی جو تمہارے بیچ بود و باش رکھتا ہو کسی طرح کا کام نہ کرے، کیونکہ اس روز تمہارے واسطے تم کو پاک کرنے کے لئے کفارہ دیا جائے گا سو تم

---

[1] فتح الباری ج ۴ صفحہ ۲۱۴ تا ۲۱۶ [2] دیکھئے جویش انسائیکلوپیڈیا Jewish Encyclopaedia [3] یہ غالباً گوسالہ پرستی ہے،

اپنے سب گناہوں سے خداوند کے حضور پاک ٹھیرو گے"[1]

دوسری جگہ آتا ہے،

"اور خداوند نے موسیٰ سے کہا اسی ساتویں مہینہ کی دسویں تاریخ کو کفارہ کا دن ہے اسی روز تمہارا مقدس مجمع ہو اور تم اپنی جانوں کو دکھ دینا اور خداوند کے حضور آتشیں قربانی گزارنا تم اس دن کسی طرح کا کام نہ کرنا کیونکہ وہ کفارہ کا دن ہے جس میں خداوند تمہارے خدا کے حضور تمہارے لئے کفارہ دیا جائے گا"[2]

"گنتی" میں ایک جگہ آیا ہے،

"پھر اسی ساتویں مہینہ کی دسویں تاریخ کو تمہارا مقدس مجمع ہو، تم اپنی اپنی جان کو دکھ دینا اور کسی طرح کا کام نہ کرنا"[3]

اس کے برخلاف احادیث صحیحہ میں اس کی صراحت موجود ہے کہ عاشورا کا دن (جس میں مسلمانوں کو روزہ رکھنے کا حکم ہے) یہود کے نزدیک بہت خوشی و مسرت اور عید کا دن تھا، امام بخاری حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت کرتے ہیں کہ یہودی عاشورا کو عید کا دن سمجھتے تھے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ کر ارشاد فرمایا کہ تم اس میں روزہ رکھو"[4]

امام مسلم قیس بن مسلمؓ سے اپنی سند کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ اہلِ خیبر عاشورا کا روزہ رکھتے تھے اور اس کو عید کے جشن کی طرح مناتے تھے اور اس دن اپنی عورتوں کو زیور اور بہترین پوشاکیں پہناتے تھے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم اس میں روزہ رکھا کرو"

---

[1] احبار باب ۱۶ آیات (۲۹-۳۰-۳۱) کتاب مقدس (پرانا اور نیا عہد نامہ) برٹش اینڈ فارن، بائیبل سوسائٹی، لاہور، [2] ایضاً باب ۲۳ (۲۶-۲۷-۲۸) [3] گنتی باب ۲۹ (۷)

[4] کتاب الصوم (باب صیام یوم عاشورا ج ۲)

کریب بن سعد عمر بن الخطابؓ سے روایت کرتے ہیں کہ" اللہ تعالےٰ قیامت کے روز تم سے دو ہی روزوں کے متعلق سوال کرے گا رمضان کا روزہ اور زینت کے دن (یعنی عاشورا) کا روزہ[1]"

ان تمام باتوں کے پیش نظر یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ یہ کفارہ کا دن ہے، اگر یہ مان لیا جاتا ہے تو یہ دن حزن وملال غم و ماتم اور عقوبت وتعزیر کا دن ہونا چاہیے" اسلئے کہ حدیث میں جس عاشورا کا ذکر ہے اس کو خوشی ومسرت اور زینت وتجمل کا دن قرار دیا گیا ہے،

یہ غلط فہمی بیرونی کے علاوہ بہت سے مشرقی ومغربی فضلاء اور محققین کو بھی ہوئی ہے عصر حاضر کے جدید مصنفین کا رجحان بھی اسی طرف ہے، Judaism in Islam. کا مصنف کفارہ کے دن کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:۔

"محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) نے ابتداء میں اس کو مسلمانوں کے روزہ کا دن قرار دیا[2]"

یہودیوں کا عاشورا کے متعلق یہ قول کہ یہ وہ دن ہے جس میں اللہ تعالےٰ نے بنی اسرائیل کو ان کے دشمنوں سے نجات دی خود اس سلسلہ میں ایک میزان قرار دیا جا سکتا ہے، اس لئے کہ یہ تعریف خود بخود اسی دن پر منطبق ہوتی ہے جس دن اللہ تعالےٰ نے بنی اسرائیل کو فرعون اور آل فرعون سے نجات عطا فرمائی، اس دن کا نام تورات میں متعدد جگہوں پر صراحت کے ساتھ "ابیب" آیا ہے جس کو بعد میں "نیسان" کہا جانے لگا، بستانی کے دائرۃ المعارف میں "ابیب" (ملاحظہ A) کے سلسلہ میں یہ الفاظ ملتے ہیں۔

"یہ ایک عبرانی لفظ ہے جس کے معنی "سبز" کے ہیں، یہ عبرانی سال کے پہلے مہینہ کا نام ہے، اس کا نام موسیٰ علیہ السلام کا رکھا ہوا ہے اور یہ تقریب تقریب "نیسان" (اپریل) کے مطابق ہے جب اسرائیلی بابل میں جلاوطن کیے گئے تو انھوں نے اس کا نام بدل کر نیسان کر دیا یعنی پھولوں کا مہینہ

---

[1] ابن مزدویہ کنز العمال ج ۴ صـ ۳۴۴

[2] Judaism in Islam.

اسی کے وسط میں ان کی عید الفطر بھی ہوتی ہے (خروج ۱۲: ۱۸)[1]"

اس کا اعتراف خود بیرونی نے بھی اپنی ایک گذشتہ عبارت میں کیا ہے، وہ کہتے ہیں:۔

"ان کا یہ قول کہ اس دن اللہ تعالے نے فرعون کو غرق کیا تھا تورات کے خلاف ہے اس لئے کہ اس کی غرقابی کا واقعہ ۲۱ نیسن (نیسان) کو پیش آیا جو ایام الفطیر کا ساتواں دن ہے" (تورات (خروج ۱۲-۱۸) میں ہے کہ پہلے مہینہ میں چودھویں روز شام کے وقت تم فطیر کھاؤ گے اور اس کا سلسلہ مہینہ کی ۲۱ تاریخ کی شام تک جاری رہے گا")

ان تمام مذکورہ بالا نصوص کے مطالعہ نیز یہود کی شریعت و تاریخ اور قومی خصائص و عادات کے جائزہ کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ جس عاشورا کا ذکر حدیث میں ابن عباسؓ وغیرہ سے مروی ہے اور جس میں مسلمانوں کو روزہ کی ہدایت کی گئی ہے اور جو رمضان سے قبل عزیمت کے دائرہ میں آتا تھا اس سے سب سے زیادہ مشابہ اور قریب ترین دن وہ ہے جو قدیم مہینہ "ابیب" (یا نیسان) کے وسط میں پڑتا ہے جس کا نام یہودیوں نے اپنی بابل میں جلاوطنی کے بعد بدل دیا تھا نیز اس کی حیثیت روز عید کی طرح تھی جس میں وہ مسرت وانبساط کا اظہار کرتے تھے اور جشن کی طرح اس کو مناتے تھے[2]، اور یہی وہ دن ہے جس میں بنی اسرائیل مصر سے نکلے اور فرعون غرق ہوا، اصحاح ۳۴ میں لکھا ہے کہ:۔

"اور موسیٰ نے لوگوں سے کہا کہ تم اس دن کو یاد رکھنا جس میں تم مصر سے جو غلامی کا گھر ہے نکلے

---

[1] بستانی کہتے ہیں کہ اسرائیلوں کے موجودہ مہینے اس طرح ہیں کہ ان کے سال کا پہلا مہینہ تشری ہے اور اس لحاظ سے "ابیب" کا مہینہ سال کا ساتواں مہینہ قرار پاتا ہے۔ [2] بعض لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ عید اور روزہ کا جوڑ ذرا مشکل سے سمجھ میں آنے والی چیز ہے، لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس خیال کی بنیاد صرف یہ ہے کہ ہم عیسائیوں اور یہودیوں کے روزہ کو اسلامی روزہ پر قیاس کرنے لگتے ہیں، جوئیش انسائیکلوپیڈیا میں ساتویں مہینہ کے اوائل کے متعلق وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ "یہ روزہ اور عید کا دن ہے!"

کیونکہ خداوند اپنے زور بازو سے تم کو وہاں سے نکال لایا، اس میں خمیری روٹی کھائی نہ جائے تم ابیب کے مہینہ میں آج کے دن نکلے ہو۔[1]

بہرحال ترجیح اسی بات کو ہے کہ یہ دن ہجرت کے دوسرے سال عربی مہینہ محرم کی دسویں تاریخ کے مطابق تھا پھر رمضان نے آکر اس کو منسوخ کیا،

اس کے علاوہ قمری اور عربی تقویم کے ساتھ شمسی اور یہودی تقویم کی تطبیق بجائے خود ایک تخمینی چیز ہے اور اس میں "نسئی" کو بھی دخل ہے (یعنی ایک مہینہ کو حسب خواہش اور ضرورت دو تین ماہ تک ملتوی سمجھنا اور اسکو کسی دوسری تاریخ اور دوسرے مہینہ کے بعد رکھ لینا) جیسا کہ اسلام سے قبل اور اسلام کے بعد بہت سے عربوں میں دستور تھا یہاں تک کہ اس آیت کے ذریعہ اس کی ممانعت فرمائی گئی،

(اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَۃٌ فِی الْکُفْرِ یُضَلُّ بِہِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا[2]) اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر ارشاد فرمایا کہ (بے شک زمانہ اپنی اس شکل کو پھر لوٹ گیا ہے جو زمین و آسمان کی پیدائش کے وقت تھی) آپ کا یہ فرمانا اللہ تعالے کی وحی اور الہام کی بنیاد پر تھا اس لئے کہ عربی تقویم میں اس قدر اضطراب واقع ہوچکا تھا کہ اس پر کسی طرح اعتماد ممکن نہ تھا اور نہ محض حساب کے زور سے اس کو اس کی اصل قدیم سے مربوط کیا جاسکتا تھا اس لئے یہ کسی طرح درست نہیں کہ محض اس مضطرب اور ناقابل اعتماد تقویم کی بنیاد پر جو جاہلیت اور اسلام دونوں میں ناقابل اعتماد تھی صحیح اور متواتر احادیث کی صحت میں شک کیا جائے،

یہ بھی ممکن ہے کہ مدینہ کے یہودی عاشورا کے روزہ میں منفرد ہوں اور اس کا دوسروں کی بہ نسبت زائد اہتمام التزام کرتے ہوں اور اس مسئلہ میں ان عربوں کے ساتھ ہم آہنگ ہوں جو یہ سمجھ کر کہ اس دن بڑے بڑے واقعات پیش آئے ہیں اس میں تعظیماً روزہ رکھا کرتے تھے، حضرت عائشہ رضؓ سے صحیح حدیث میں مروی ہے کہ "قریش جاہلیت میں عاشورا کے دن روزہ رکھتے تھے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بھی اس دن روزہ رکھتے

---

[1] خروج باب ۱۳ (۳) [2] مہینوں کا ہٹا دینا کفر میں اور ترقی کرنا ہے اس سے (عام) کفار گمراہ کیے جاتے ہیں۔ (سورۃ توبہ ۳۷)

تھے[1]، اس کے علاوہ مختلف ملکوں اور علاقوں میں یہودیوں کے روزے مختلف تھے جن میں بعض یہودی روزہ رکھتے تھے اور بعض نہ رکھتے تھے اس سلسلہ میں ...... جوئش انسائیکلوپیڈیا میں جو کچھ آیا ہے اسکا ذکر اوپر گزر چکا ہے اور اس میں اس کی صراحت موجود ہے کہ کچھ مقامی اور قومی روزے بھی تھے جو ملکوں اور علاقوں کے اختلاف کے ساتھ جہاں یہود قدیم زمانہ سے آباد تھے ایک دوسرے سے مختلف تھے، ایک جگہ لکھا ہے کہ "بہت سے ایسے روزے تھے جو کچھ طبقوں میں رائج تھے، کچھ میں نہیں اور ان کو تاریخی واقعات کی یادگار کے طور پر رکھا جاتا تھا" اس لئے یہ کچھ مستبعد نہیں کہ عاشوراکا روزہ اور پہلے عربی مہینہ کے دسویں دن اس کا التزام یہودِ عرب کے ساتھ مخصوص ہو، شاید یہی وجہ ہے کہ یہودی مصادر و مراجع بھی اس سلسلہ میں خاموش ہیں اکثر مورخین نے اس کو یہودیوں کے مشہور عام کفارہ کے روزہ پر محمول کیا ہے جس کو ہر یہودی اپنے اوپر فرض سمجھتا ہے خواہ وہ کسی جگہ آباد ہو چنانچہ جن لوگوں نے اس کو کفارہ پر محمول کیا انھوں نے احادیث کی صحت میں بھی شبہہ ظاہر کیا، لیکن یہ عاجلانہ فیصلہ دراصل یہودیوں کے عادات و خصائص اور مختلف ملکوں میں ان کے مذاہب اور فرقوں سے ناواقفیت اور حجاز کے ان یہودیوں کے سلسلہ میں معلومات کی کمی اور مراجع کی خاموشی کا نتیجہ ہے، جو صدیوں اور نسلوں سے ایک مستقل بالذات قوم کی حیثیت سے وہاں مقیم تھے، مخصوص عقائد، اخلاق اور عادات رکھتے تھے، اور دنیا کی دوسری قوموں، تہذیبوں، ثقافتوں، زبانوں اور لہجوں کی طرح اپنے ماحول اور گردوپیش سے قدرتی طور پر متاثر تھے،[2]

روزہ کا حکم اور اس سلسلہ کی آیات

ان نازک اور اعلیٰ مصالح کی رعایت اور بلند دینوی و اخروی مقاصد کی تکمیل کیلئے جو علم و ذہانت کی دسترس سے ماوراء ہیں، اس روح کی چارہ سازی کیلئے جو معدہ اور شکم کے بوجھ کے نیچے دب گئی تھی اور "ہوا و ہوس" اور "نائے و نوش" کے جنون اور غلبہ کی وجہ سے نیم جان اور زار و نزار ہو رہی تھی نیز اس فریضہ کی ادائیگی کیلئے جس کو خلافت کہا جاتا ہے۔ اور جس میں اعتدال و توازن اور صبر و تحمل کی سب سے زیادہ ضرورت ہے

---

[1] صحیح مسلم کتاب الصوم "باب صوم عاشوراء" [2] عاشوراء کی بحث میں مصنف کو مولانا ابوالجلال صاحب ندوی مرحوم کے اس محققانہ مضمون سے بڑی مدد ملی ہے جو "معارف" اعظم گڑھ اگست ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا ہے۔

اللہ تعالےٰ نے روزہ کا حکم مسلمانوں کے لئے نازل فرمایا، لیکن یہ روزہ ہجرت کے بعد اس وقت فرض کیا گیا جب سختیوں کے بادل چھٹ گئے، عسرت و تنگ دستی کا دور ختم ہوا اور مسلمانوں نے مدینہ میں اطمینان کی سانس لی اور ان کی زندگی کشادگی اور آرام کے ساتھ بسر ہونے لگی، ایسا شاید اس لئے ہوا کہ اگر پریشان حالی کے دور میں روزہ کا حکم نازل ہوتا تو بہت سے لوگ اس کو مجبوری کا روزہ اور معاشی حالات اور اس ماحول کا نتیجہ سمجھتے جو مکہ میں تھا اور یہ محسوس کرتے کہ روزہ صرف غربا و مساکین اور مصیبت زدوں اور مظلوموں کیلئے ہے، اغنیا اور خوش حال لوگ جو باغات اور زمینوں کے مالک ہیں[1] اس سے مستثنیٰ ہیں،

اس کے علاوہ روزہ کی فرضیت کی آیت اس وقت نازل ہوئی جب عقیدہ مسلمانوں کے دلوں میں اچھی طرح پیوست اور پختہ ہو چکا تھا اور نماز سے بھی ان کو غایت درجہ تعلق بلکہ عشق پیدا ہو گیا تھا، تمام مسلمان احکام الٰہی اور قوانین شریعت کے سامنے ہر لمحہ سر تسلیم خم کرنے پر تیار رہتے، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ اسکے منتظر ہی ہوں، علامہ ابن القیم نے اس نکتہ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"چونکہ مالوفات و خواہشات سے انسان کو چھڑانا سب سے مشکل اور دیر طلب کام ہے اسلئے اس کی فرضیت کا حکم ہجرت کے بعد اس وقت تک نازل نہیں ہوا جب تک اس کا اطمینان نہیں ہو گیا کہ اب توحید اور نماز ان کے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکی ہے اور اوامر قرآنیہ سے ان کے دل پوری طرح مانوس ہیں، چنانچہ ہجرت کے دوسرے سال روزہ کا حکم آیا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس دنیا سے تشریف لے جانے سے قبل ۹ رمضانوں کے روزے رکھے"[2]

جس آیت کے ذریعہ روزے فرض ہوئے وہ آیت یہ تھی۔

---

[1] مدینہ میں انصار کی معاشی حالت بہت اچھی تھی ان میں سے اکثر باغات اور کھیتوں کے مالک تھے اور مال و دولت رکھتے تھے، مہاجرین بھی یہاں آکر تجارت میں مشغول ہو گئے اور اس کے نتیجہ میں ان کے یہاں بھی خوشحالی پیدا ہو گئی،

[2] زاد المعاد - ج ۱ ص ۱۵۲

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ	اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے جیسا کہ ان
كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ	لوگوں پر فرض کئے گئے تھے جو تم سے قبل ہو گئے ہیں عجب
أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ ۚ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا	نہیں کہ تم متقی بن جاؤ، (یہ روزے) گنتی کے چند روز
أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ وَعَلَى	کے (ہیں) پھر تم میں سے جو شخص بیمار ہو یا سفر میں ہو
الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ[1] فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۖ	اس پر دوسرے دنوں کا شمار رکھنا (لازم ہے) اور

---

[1] جن لوگوں نے عربی زبان و ادب کا کچھ مطالعہ کیا ہے اور اس کے طرز ادا اور اسالیب بیان سے آشنا ہیں، وہ جانتے ہیں کہ طاقت اور قدرت کا لفظ عربی زبان میں کئی طرح استعمال کیا جاتا ہے، اس کا پہلا درجہ "استطاعت ہے" اور آخری درجہ "اطاقت"، آخر الذکر کا استعمال اس مفہوم میں کیا جائے گا کہ یہ کام اس درجہ سخت تھا کہ اس نے ساری قوت نچوڑ لی اور گویا کمر توڑ دی، چنانچہ اگر کوئی یہ کہنا چاہے کہ میں لقمہ اپنے منہ میں لے جانے کی طاقت رکھتا ہوں، تو عربی کے لحاظ سے وہ "انی اطیق" نہیں کہے گا، اسی طرح قلم پکڑنا اور اس طرح کے وہ تمام کام جن میں کوئی دشواری نہیں ہوتی، البتہ اگر کسی کو یہ کہنا ہو کہ میں بھاری پتھر اٹھا سکتا ہوں، یا مسلسل روزے رکھ سکتا ہوں، یا رات بھر نماز پڑھ سکتا ہوں تو اس کے لئے اطیق کا لفظ استعمال کر سکتا ہے، ماہرین لغت اور محققین نے اس پر سیر حاصل بحث کی ہے، علامہ ابن منظور "لسان العرب" میں لکھتے ہیں۔ الطوق الطاقۃ سے مراد اس کا انتہائی آخری درجہ ہے جس چیز کیلئے غایت درجہ مشقت برداشت کرنا پڑے، یہ لفظ اس کیلئے بولا جاتا ہے، تاج العروس میں ہے الطوق الوسع والطاقۃ لیث کا شعر ہے ؎

کل امرئ مجاھد لطوقہ — والثور یحمی أنفہ بروقہ

کہتے ہیں کہ ہر آدمی اس کا مکلف ہے جس کی وہ طاقت رکھے، علامہ راغب اصفہانی "مفردات غریب القرآن" میں لکھتے ہیں "طاقۃ" کام کی اس مقدار کو کہتے ہیں جس کو انسان مشقت کے ساتھ انجام دے سکے یہ اس طوق سے مشتق ہے، جو کسی چیز کو گھیر لیتا ہے، قرآن شریف کی اس آیت "وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ" سے مراد یہی ہے کہ جس کا انجام دینا ہمارے لئے بیحد دشوار ہے، اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ ہمارے اوپر وہ بوجھ نہ ڈال جن کی ہم مطلقاً قدرت (باقی حاشیہ صفحہ ۲۵۵ پر)

فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ ۗ وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝

جو لوگ اسے مشکل سے برداشت کر سکیں ان کے ذمہ فدیہ ہے (کہ وہ) ایک مسکین کا کھانا ہے، اور جو کوئی خوشی خوشی

(باقی حاشیہ صفحہ ۲۵۴ کا) نہیں رکھتے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ انسان پر صرف اتنا ہی بوجھ رکھتا ہے جتنا وہ اٹھا سکے جیسا کہ ارشاد ہے "وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ" اور "وَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ" (یعنی ہم نے مشکل عبادتیں آپ کے لئے ہلکی کر دیں) اسی طرح "قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ" سے مراد یہی ہے کہ کبھی کبھی توسعا (نفی کے موقع پر) طاقت کیلئے قدرت کا لفظ بھی استعمال کر دیا جاتا ہے۔ اب "علی الذین یطیقونہ" کا مطلب یہ ہوا کہ وہ لوگ جو غایت درجہ مشقت، تعب، اور جانفشانی کے ساتھ روزہ رکھ سکیں، یعنی وہ بوڑھے مرد یا عورتیں جو بیماری یا ہلاکت کا خطرہ مول لینے کے بعد.. روزہ رکھنے کی ہمت کر سکتی ہیں،

ابن عباسؓ نے اس آیت کا جو مفہوم سمجھا تھا وہ بھی یہی ہے، بخاری ابوداؤد اور صحاح میں ان سے مروی ہے کہ آیت بہت ہی بوڑھے مرد یا عورت کے لئے آئی ہے، امام بخاری نے ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انھوں نے یہ آیت "وعلی الذین یطیقونہ" پڑھی اور کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو سخت تکلیف کے ساتھ رکھ سکیں یہ آیت بوڑھے مرد اور بوڑھی عورت کے لئے ہے جو لوگ روزہ کے فدیہ کے طور پر ایک مسکین کو کھانا کھلا سکتے ہیں قضا ان پر واجب نہ ہوگی، دارقطنی میں عطاء سے جو ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں مروی ہے کہ جو لوگ بہ مشقت تمام روزہ رکھ سکتے ہوں ان پر ایک مسکین کو کھلانے کا فدیہ ہوگا جو نیکی کے جذبہ کے ساتھ اس میں اضافہ کرے یعنی ایک اور مسکین کو بھی شامل کرے تو یہ بہتر ہے، وہ کہتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے ___ انھوں نے بوڑھے آدمی کو اس کی رخصت دی ہے کہ وہ اپنے جیسے سن رسیدہ شخص کو کھانا کھلائے جو روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتا، طحاوی نے بھی حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ "علی الذین یطیقونہ" کے متعلق انھوں نے کہا کہ بمشقت تمام روزہ رکھیں، یعنی حاملہ عورت، بہت سن رسیدہ شخص، بیمار اور جسکو چھینکوں کی دائمی شکایت ہو حضرت علیؓ، ابوہریرہؓ جیسے کبار صحابہؓ سے بھی یہی تفصیل منقول ہے، مجاہد کہتے ہیں کہ "حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ جب وہ بہت سن رسیدہ ہوگئے تو اس پر عمل کرنے لگے (باقی حاشیہ صفحہ ۲۵۶ پر)

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ أُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْآنُ
هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدٰى

نیکی کرے اس کے حق میں بہتر ہے، اور اگر تم علم رکھتے ہو تو
بہتر تمہارے حق میں یہی ہے کہ تم روزے رکھو، ماہِ رمضان

(باقی حاشیہ صفحہ ۲۵۵ کا) (بخاری میں بھی یہ حدیث درج ہے) خالد الحذاء عکرمہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ "و علی الذین یطیقونہ" کو منسوخ نہیں سمجھتے تھے، حجاج ابو اسحاق سے وہ حارثؓ سے وہ حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ "علی الذین یطیقونہ" سے مراد بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت ہے، سعید بن جبیر سے روایت ہے کہ ابن عباسؓ کے پاس ایک باندی تھی جو روزہ کی حالت میں بچہ کو دودھ پلاتی تھی اور اس کی وجہ سے تکلیف میں تھی، آپ نے اس سے کہا کہ تم افطار کرو اس لئے کہ تم بھی "علی الذین یطیقونہ" میں شامل ہو"

اس طرح "کتب علیکم الصیام" کا خطاب تین قسم کے لوگوں کی طرف ہے اول مقیم اور تندرست، ان پر روزہ بالکل حتمی ہے، دوسرے مریض اور مسافر ان کے لئے افطار جائز اور قضا واجب ہے، تیسرے وہ جن پر روزہ کسی لاعلاج بیماری کی وجہ سے سخت دشوار اور ناقابل برداشت ہو مثلاً بڑھاپا یا کوئی مزمن بیماری، یہ لوگ روزہ افطار کر سکتے ہیں لیکن اس کے فدیہ میں ان کو روزانہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہوگا، اسی طرح حاملہ یا دودھ پلانے والی عورت، یہ افطار کرے گی اور قضا کرے گی اس طرح آیت کا حکم علی حالہ ہے، اس میں نسخ کسی کلمہ کو حذف یا زائد سمجھنے یا اس میں تکلف سے کام لینے کی کوئی ضرورت نہیں، بعض کبار صحابہ کا یہی مسلک تھا اور اسی طرح اس مسلک میں کوئی تشدد یا غرابت باقی نہیں رہتی، جہاں تک اس آیت کے منسوخ ہونے کے سلسلہ میں بعض کبار صحابہ کی رائے کا تعلق ہے اور اکثر متقدمین نے اسی کو ترجیح دی ہے اور تفسیر و حدیث کی مستند اول کتابوں میں بھی عام معروف مسلک یہی ہے، اس کا اصل سبب صحابہ کرام کی تعبیرات اور طرز کلام کو عہد آخر کے منضبط اصولی مباحث پر قیاس کرنا اور ان کے الفاظ و تعبیرات کو ان مباحث پر کلی طور پر محمول کرنا ہے، اس لئے کہ صحابہ کرامؓ اور متقدمین ان الفاظ کے اطلاق میں بہت متوسع تھے، اور کبھی کبھی صرف اس لئے کہ کسی لغوی معنی کی طرف اشارہ کرتے تھے اور بعض وقت ادنیٰ مناسبت اور تعلق سے بھی ایسے الفاظ استعمال کرتے تھے،

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے اس مسئلہ پر جو کلام کیا ہے اس کا اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے، (باقی حاشیہ صفحہ ۲۵۷ پر)

وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۗ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝ [۱]

وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا ہے، وہ لوگوں کے لئے ہدایت ہے اور (اس میں) کھلے ہوئے (دلائل ہیں) ہدایت اور (حق و باطل میں) امتیاز کے، سو تم میں سے جو کوئی اس مہینہ کو پائے، لازم ہے، کہ وہ (مہینہ بھر) روزہ رکھے، اور جو کوئی بیمار ہو، یا سفر میں ہو تو (اس پر) دوسرے دنوں کا شمار رکھنا (لازم ہے) اللہ تمہارے حق میں

(باقی حاشیہ صفحہ ۲۵۶ کا) وہ کہتے ہیں "فن تفسیر میں جس کا میدان بہت وسیع اور اختلاف بہت زیادہ ہے سب سے مشکل مقام ناسخ و منسوخ کی پہچان ہے، اور اس دشواری اور پیچیدگی کا سب سے بڑا سبب متقدمین و متاخرین کی اصطلاحات کا فرق ہے، صحابۂ کرام اور تابعین کے اقوال اور طرز کلام کو دیکھ کر ہمیں جس بات کا اندازہ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ لوگ نسخ کو اس کے لغوی معنی (یعنی ایک چیز کو ہٹا کر دوسری چیز لانے) کے معنی میں استعمال کرتے تھے، اہل اصول کی اصطلاحات کے مفہوم میں نہیں، صحابہ کرام کے نزدیک آیت کے بعض اجزا یا بعض اوصاف کو بھی دوسری آیت سے منسوخ سمجھا جا سکتا ہے، کبھی اس کی مدت کے اختتام کی بنا پر، کبھی بات کا رخ متبادر سے غیر متبادر کی طرف پھیر کر، یا کسی قید کے اتفاقی ہونے یا عموم و تخصیص کی بنا پر، کبھی منصوص اور قیاس ظاہری کے فرق کی روشنی میں، یا جاہلیت کی عادات اور گذشتہ شریعتوں کی مسوخی کے باب میں، اس میں نسخ کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا، عقل کو اپنی جولانی دکھانے کا خوب موقع ملا اور اختلافات کی کثرت ہوئی" (الفوز الکبیر فی اصول التفسیر ص۱)

اس قول کو ہمارے زمانہ کے بعض ممتاز ترین علماء اور محققین نے بھی ترجیح دی ہے جن میں مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا شمس الحق دیانوی اور مولانا سید سلیمان ندوی شامل ہیں، مصر کے مفتی محمد عبدہ سے بھی یہی قول مشہور ہے اور ان کے شاگرد رشید سید رشید رضا نے تفسیر المنار میں اس قول کو ان کی طرف منسوب کیا ہے،

[۱] سورہ بقرہ ۔ ۱۸۳ تا ۱۸۵

. . . . سہولت چاہتا ہے، اور تمہارے حق میں دشواری نہیں

. . . . چاہتا، اور یہ (چاہتا ہے) کہ تم شمار کی تکمیل کر لیا کرو، اور

. . . . یہ کہ تم اللہ کی بڑائی کیا کرو، اس پر کہ تمہیں راہ بتا دی،

. . . . عجب نہیں کہ تم شکر گذار بن جاؤ،

یہ آیات جن میں پہلی بار روزہ فرض قرار دیا گیا ان خشک قوانین کی طرح نہیں تھیں جو محض اس سیاسی اور اجتماعی رابطہ کی بنیاد پر نافذ کیا جاتا ہے جو معاشرہ کے ایک فرد اور حکومت کے درمیان قائم ہوتا ہے، یہ آیات ایمان وعقیدہ، عقل وضمیر اور قلب وجذبات سب کو بیک وقت اپیل کرتی ہیں، اور ان تمام چیزوں کو غذا پہونچاتی ہیں، اور محض قانون کے اجراء ہی کے لئے نہیں خوشدلی کے ساتھ اس کے استقبال کے لئے بھی فضا سازگار کرتی ہیں، یہ قرآن کے اعجاز اصولِ دعوت، علم النفس اور حکیمانہ قانون سازی کا ایک ناقابل انکار معجزہ ہے،

تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ[1] ۔ (یہ کلام) نازل ہوا ہے (خدائے) باحکمت وپرحمد کی طرف سے،

اللہ تعالےٰ نے ان لوگوں کو جو اس قانون کے مکلف ہیں "يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا" سے خطاب کیا ہے اور اس طرح گویا ان کو پہلے ہی سے ان تمام احکام کی تعمیل اور بجا آوری کے لئے تیار کر دیا ہے، جو ان کو خدا کی طرف سے دئے جائیں، خواہ وہ ان کے نفس پر کتنے ہی شاق اور گراں کیوں نہ ہوں، اس لئے کہ ایمان کا یہی تقاضا اور مطالبہ ہے، اگر کوئی اللہ تعالےٰ پر ایمان لاچکا ہے، اس کو اپنا معبود اور رب، امر ونہی کا مالک اور اطاعت وفرماں برداری کے لائق تسلیم کر چکا ہے، اور اپنی زمام کار اس کے حوالہ کر چکا ہے، اور دل وجان سے اس کی محبت میں سرشار ہے تو اس کو بجا طور پر اس کے ہر حکم، ہر قانون، ہر فیصلہ اور ہر مطالبہ کے سامنے بے چون وچرا

---

[1] حٰم السجدہ ۔ ۴۲

سر تسلیم خم کر دینا چاہیئے۔

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ؕ[۱]	ایمان والوں کا قول تو یہ ہے جب وہ بلائے جاتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کی طرف کہ (رسول) ان کے درمیان فیصلہ کر دیں تو وہ کہہ اٹھتے ہیں کہ ہم نے سن لیا، اور مان لیا،
وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ۔[۲]	اور کسی مومن یا مومنہ کے لئے یہ درست نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی امر کا حکم دیدیں تو پھر ان کو اپنے (اس) امر میں کوئی اختیار باقی رہ جائے،
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ[۳]	اے ایمان والو اللہ اور رسول کو لبیک کہو جبکہ وہ (یعنی رسول) تم کو تمہاری زندگی بخش چیز کی طرف بلائیں۔

یہ اس شریعت کی پابندی ہے جو اپنے تمام فرائض، عبادات، اور احکام و قوانین میں نفوس انسانی کے لئے آب حیات ہے، اسکے بعد اللہ تعالٰے فرماتا ہے کہ اس نے ان پر روزہ فرض کیا، لیکن یہ مذاہب کی تاریخ میں پہلا موقع یا کوئی بدعت نہ تھی، اللہ تعالٰے نے ان سے پہلے بھی سب اہلِ کتاب اور مذہب و شریعت کی حامل تمام قوموں پر روزہ فرض کیا تھا، اس طرح اللہ تعالٰے نے اس گرانی اور بوجھ کو کم کر دیا ہے جو انسان کو تنہائی کے احساس سے ہوتا ہے، اگر آدمی کو معلوم ہو جائے کہ جس بات کا پابند اس کو کیا جا رہا ہے وہ کوئی نئی بات نہیں ہے، اس کی نظیریں پہلے بھی گزر چکی ہیں اور بہت سی قوموں اور ملتوں نے اس کی پابندی کی ہے، تو اس کو وہی چیز کسی قدر آسان معلوم ہونے لگے گی اور ہمت پہلے سے بڑھ جائے گی،

اس کے بعد اللہ تعالٰے ارشاد فرماتا ہے کہ یہ کوئی ایسی چیز نہیں جس کا مقصد بلا وجہ مشقت یا آزمائش

---

[۱] سورہ نور۔ ۵۱ [۲] سورہ احزاب۔ ۳۶ [۳] سورہ انفال۔ ۲۴

میں ڈالنا ہو، یہ ریاضت، تربیت اور اصلاح وتزکیہ کیلئے ہے، یہ دراصل اخلاقی تربیت گاہ ہے جہاں سے آدمی کامل ہو کر اس طرح نکلتا ہے کہ خواہشات کی لگام اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے، خواہشات اس پر حکومت نہیں کرتیں بلکہ وہ خواہشات پر حکومت کرتا ہے، جب وہ محض اللہ کے حکم سے مباح اور پاک چیزوں کو ترک کر دیتا ہے تو ممنوعات ومحرمات سے بچنے کی کوشش کیوں نہ کرے گا؟ جو شخص ٹھنڈے میٹھے پانی اور پاکیزہ ولذیذ غذا کو خدا کی فرماں برداری میں چھوڑ سکتا ہے، وہ حرام اور نجس چیزوں کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا کیسے گوارا کر سکتا ہے اور یہی " لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ" کا مفہوم ہے۔

پھر یہ ارشاد ہوتا ہے کہ مہینہ کی گنتی کو زیادہ نہ سمجھنا یہ تو چند گنے چنے دن ہیں جو مسلسل گزرتے ہیں اور دیکھتے دیکھتے ختم ہو جاتے ہیں، اس کے علاوہ اس ایک مہینہ کی (جس میں صرف دن کا روزہ ہوتا ہے) سال بھر کے شب وروز سے نسبت ہی کیا ہے جو راحت ولذت اور سکون وفراغت کے ساتھ گزرتے ہیں؟

تاہم مریض اور مسافر نیز ان لوگوں کو جو روزہ رکھنے سے عاجز ومعذور ہوں اس سے مستثنیٰ کیا گیا ہے،

پھر اس مہینہ کی فضیلت بیان کرتے ہوئے جس میں روزہ فرض کیا گیا ارشاد ہوتا ہے کہ یہ وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل ہوا اور نسل انسانی کو نئی زندگی کا پیغام ملا، ایک مسلمان کے لئے اس سے زیادہ مفید و موزوں بات کیا ہو سکتی ہے کہ وہ اس مبارک مہینہ میں صیام وقیام کے ذریعہ نئی زندگی نئے ایمان اور نئی قوت سے بہرہ مند ہو،

یہ وہ اسلامی روزہ یا روحانی غذا ہے جو بھرپور زندگی، ہر طرح کے فوائد اور ہر قسم کی برکتوں سے معمور اور ہر اس مشکل پسندی، تشدد اور ناروا بوجھ سے خالی ہے جو نفس انسانی کی طاقت سے باہر اور اس کی قوت برداشت سے زیادہ ہے۔

يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ

اللہ تمہارے حق میں سہولت چاہتا ہے اور تمہارے حق میں دشواری نہیں چاہتا، اور یہ (چاہتا ہے) کہ تم شمار کی

مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ[1] ـ تکمیل کر لیا کرو اور یہ کہ تم اللہ کی بڑائی کیا کرو، اس پر کہ تمہیں راہ بتا دی۔ عجب نہیں کہ شکر گذار بن جاؤ۔

روزہ کی خصوصیات اور اسکے فضائل واحکام

اسلام نے روزہ کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ قوانین ومقاصد دونوں کے لحاظ سے مکمل ہے، فائدہ کا سب سے زیادہ ضامن ہے اور اس میں عزیز وعلیم اور حکیم وخبیر خدا کی حکمت ومشیت پوری طرح جلوہ فگن ہے،

اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ، وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ[2] کیا وہی آگاہ نہ ہوگا جس نے پیدا کیا ہے؟ وہ تو (بڑا ہی) باریک بین اور (پورا) باخبر ہے،

اس نے پورا مہینہ (اور یہ رمضان کا وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل ہوا) مسلسل مہینہ بھر کے روزوں کے لیے مخصوص کیا ہے جس کے دنوں میں روزہ رکھنے کا حکم ہے اور راتوں کو کھانے پینے کی اجازت ہے اس وقت عربوں میں روزہ کا مفہوم یہی تھا، اور اسلام کی عالمی شریعت میں بھی اسی کا اعتبار اور اسی پر عمل ہے،

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں:۔

"(روزہ میں) دن کا دائرہ طلوع صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک ہے اسلئے کہ عربوں کا حساب اور ان کے دن کی مقدار اسی بنیاد پر ہے اور عاشوراء کے روزہ میں انکے یہاں یہی بات معروف ومسلم تھی، مہینہ کا آغاز رویت ہلال سے ہے اور رویت ہلال تک، ہے اسلئے کہ عربوں کا حساب شمسی مہینوں پر نہیں چلتا"[3]

رمضان کو روزہ کے ساتھ مخصوص کیوں کیا گیا؟

اللہ تعالے نے روزے رمضان میں فرض کئے ہیں اور دونوں کو ایک دوسرے کیساتھ

---

[1] سورہ بقرہ - ۱۸۵ [2] سورہ ملک - ۱۴ [3] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ صـ ۳۷

لازم وملزوم قرار دیا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ ان دو برکتوں اور سعادتوں کا اجتماع بڑی حکمت اور اہمیت کا حامل ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ رمضان ہی وہ مہینہ ہے جس میں قرآن مجید نازل ہوا اور گم کردہ راہ انسانیت کو صبح صادق نصیب ہوئی اس لئے یہ عین مناسب تھا کہ جس طرح طلوع صبح صادق روزہ کے آغاز کے ساتھ مربوط کر دیا گئی ہے اسی طرح اس مہینہ کو بھی جس میں ایک طویل و تاریک رات کے بعد پوری انسانیت کی صبح ہوئی پورے مہینہ کے روزے کے ساتھ مخصوص کر دیا جائے خاص طور پر اس وقت جب کہ اپنی رحمت و برکت، روحانیت اور نسبت باطنی کے لحاظ سے بھی یہ مہینہ تمام مہینوں سے افضل تھا اور بجا طور پر اس کا مستحق تھا کہ اس کے دنوں کو روزے سے اور راتوں کو عبادت سے آراستہ کیا جائے۔[1]

روزہ اور قرآن کے درمیان بہت گہرا تعلق اور خصوصی مناسبت ہے، اور اسی لئے حضور صلے اللہ علیہ وسلم رمضان میں تلاوت کا زیادہ سے زیادہ اہتمام فرماتے تھے، ابن عباسؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ سخی تھے لیکن رمضان میں جب جبریل آپ سے ملنے آتے اس زمانہ میں سخاوت کا معمول اور بڑھ جاتا، جبریل رمضان کی ہر رات میں آپ کے پاس آتے اور قرآن مجید کا دور کرتے، اس وقت جب جبریل آپ سے ملتے آپ سخاوت، داد و دہش اور نیکی کے کاموں میں تیز ہوا سے بھی تیز نظر آتے۔[2]

حضرت مجدد الف ثانیؒ اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"اس مہینہ کو قرآن مجید کے ساتھ بہت خاص مناسبت ہے اور اسی مناسبت کی وجہ سے قرآن مجید اسی مہینہ میں نازل کیا گیا، یہ مہینہ ہر قسم کی خیر و برکت کا جامع ہے، آدمی کو سال بھر میں مجموعی طور پر جتنی برکتیں حاصل ہوتی ہیں وہ اس مہینہ کے سامنے اس طرح ہیں جس طرح سمندر

---

[1] حضرت شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ کسی اور مہینہ کی تعیین ہونا ہی تھی تو اس کے لئے اس مہینہ سے بہتر کوئی مہینہ نہ تھا جس میں قرآن مجید نازل ہوا، ملت مصطفوی کی بنیاد مستحکم ہوئی، مزید براں یہ کہ شب قدر کا امکان بھی زیادہ تر اسی مہینہ میں ہے (حجۃ اللہ ج ۲ ص ۳۷) [2] متفق علیہ

کے مقابلہ میں ایک قطرہ، اس مہینہ میں جمعیت باطنی کا حصول پورے سال جمعیت باطنی کیلئے کافی ہوتا ہے اور اس میں انتشار اور پریشان خاطری بقیہ تمام دنوں بلکہ پورے سال کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے، قابل مبارکباد ہیں وہ لوگ جن سے یہ مہینہ راضی ہو کر گیا اور ناکام و بدنصیب ہیں وہ جو اس کو ناراض کر کے ہر قسم کے خیر و برکت سے محروم ہو گئے[1]۔

ایک دوسرے مکتوب میں فرماتے ہیں:۔

"اگر اس مہینہ میں کسی آدمی کو اعمال صالحہ کی توفیق مل جائے تو پورے سال یہ توفیق اس کے شامل حال رہے گی اور اگر یہ مہینہ بے دلی، فکر و تردد اور انتشار کے ساتھ گزرے تو پورا سال اسی حال میں گزرنے کا اندیشہ ہے[2]۔

حضرت ابوہریرہؓ حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ جب رمضان آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دئے جاتے ہیں جہنم کے دروازے بند کرائے جاتے ہیں اور شیاطین کو پابہ زنجیر کر دیا جاتا ہے اس سلسلہ کی احادیث بکثرت وارد ہوئی ہیں،

عبادات کا عالمی موسم اور اعمال صالحہ کا جشن عام

ان تمام چیزوں نے رمضان کو عبادت، ذکر، تلاوت اور زہد و تقویٰ کا ایک ایسا عالمی موسم اور جشن عام کا زمانہ بنا دیا ہے جس میں مشرق و مغرب کے تمام مسلمان عالم و جاہل، امیر و فقیر، کم ہمت اور عالی حوصلہ ہر قسم اور ہر گروہ کے لوگ ایک دوسرے کے شریک و رفیق اور ہمدم و دمساز نظر آتے ہیں، یہ رمضان ایک ہی وقت میں ہر شہر ہر گاؤں اور ہر دیہات میں ہوتا ہے، امیر کے محل اور غریب کی جھونپڑی دونوں میں اس کا جلوہ نظر آتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نہ کوئی شخص خود سری اور خود آرائی کرتا ہے، نہ روزے کے لئے دونوں کے انتخاب میں کوئی اختلاف اور جھگڑا پیدا ہوتا ہے، ہر وہ شخص جس کو اللہ تعالےٰ نے دو آنکھیں عطا کی ہیں عالم اسلام کے

---

[1] مکتوبات امام ربانی ج ۱ ص ۴۵ [2] مکتوبات امام ربانی ص ۴۵

وسیع وعریض رقبہ میں، ہر جگہ اس کے جلال وجمال کا مشاہدہ خود کرسکتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پورے اسلامی معاشرہ پر نورانیت اور سکینت کا ایک وسیع شامیانہ سایہ فگن ہے، جو لوگ روزہ کے معاملہ میں ذرا سست اور کاہل ہیں وہ بھی عامۃ المسلمین سے علیحدگی کے ڈر سے روزہ رکھنے پر مجبور ہوتے ہیں اور اگر کسی وجہ سے روزہ نہیں رکھتے تو چھپ کر اور شرم کے ساتھ کھاتے ہیں، سوائے ان چند ملحد اور فساق کے جن کو علانیہ کھلی اس بے شرمی میں کوئی عار نہیں ہوتا، یا ان بیماروں اور مسافروں کے جو شرعاً معذور ہیں، یہ ایک اجتماعی اور عالمی روزہ ہے جس سے خود بخود ایک ایسی سازگار اور خوشگوار فضا پیدا ہوتی ہے جس میں روزہ آسان معلوم ہوتا ہے، دل نرم پڑ جاتے ہیں اور لوگ عبادتوں اور طاعتوں اور ہمدردی وغمخواری کے مختلف کاموں کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں،

عالمی فضا اور سوسائٹی پر اس کے اثرات

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی چشم بصیرت نے اس کیفیت کو اچھی طرح محسوس کیا تھا وہ حدیث (اذا دخل رمضان فتحت ابواب الجنۃ الخ) کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"روزہ چونکہ ایک عمومی اور اجتماعی شکل کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے وہ رسوم کی دسترس سے محفوظ ہے اگر کوئی جماعت اور قوم اس کی پابندی کرتی ہے اس کے لئے تو شیاطین قید کر دئے جاتے ہیں، جنتوں کے دروازے کھول دئے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کر دئے جاتے ہیں"[1]

دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

"مسلمانوں کے مختلف طبقوں اور مختلف جماعتوں کا ایک وقت میں ایک چیز پر اجماع اور اجتماع جس میں سب ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں روزہ کو ان کے لئے آسان بنا دیتا ہے اور اس سے ان کی بہت ہمت افزائی ہوتی ہے"

"اسی طرح ان کی یہ اجتماعیت خواص وعوام دونوں کے لئے ملکوتی برکتوں کے نزول کا

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ صہ ۵۹

باعث ہے اس میں اس کا امکان بھی بڑھ جاتا ہے کہ ان کے کاملین و واصلین پر جو انوار نازل ہوں وہ ان سے نیچے والوں کو بھی فیضیاب کرتے جائیں اور ان کی دعائیں ان کے پیچھے والوں تک پہونچتی رہیں،"[1]

فضائل اور اس کی قوت و تاثیر

زندگی نفس کی خواہشات اور عقل کے تقاضوں کی مستقل کشمکش کا نام ہے، لیکن اس کشمکش میں ہمیشہ خواہشات کی ہی فتح نہیں ہوتی جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں، ایسا خیال درحقیقت فطرت انسانی سے بدگمانی اور حقیقت سے روگردانی ہے،

جو طاقت زندگی کے پہیہ کو تیزی کے ساتھ حرکت دیتی ہے اور جس کے دم سے دنیا کا بازار گرم اور اسکی رونق قائم ہے، وہ نفع پر یقین ہے یہی وہ یقین ہے جو کسان کو سخت سردی کے موسم میں اپنے بستر سے اٹھا دیتا ہے اور اندھیرے منہ کھیت میں پہونچا دیتا ہے اور لو کے تھپیڑوں اور سورج کی تپش میں کھیت جوتنے اور اپنا پسینہ بہانے کی قوت بخشتا ہے، یہی یقین ایک تاجر کو گھر بار اور راحت و آرام چھوڑ کر اپنے کاروبار میں مشغول ہونے پر آمادہ کرتا ہے، یہی یقین ایک فوجی کیلئے موت کو آسان اور زندگی کو دشوار بنا دیتا ہے، جو چیز اسکو اپنی محبوب اولاد کو چھوڑ کر بے تکلف میدان جنگ میں چلے جانے پر اکساتی ہے وہ نفع کا یقین اور مستقبل میں کسی فائدہ کی توقع ہے اور یہی وہ محور ہے جس کے گرد زندگی کی چکی گھومتی ہے،

لیکن اس یقین کے سوا ایک یقین اور ہے جو اپنی انقلاب آفرینی اور قوت و تاثیر میں اس یقین سے کہیں بڑھ کر ہے جس کی مثالیں اوپر پیش کی گئی ہیں یہ ان منافع کے حصول کا یقین ہے جس کی خبر انبیاء کرام اس دنیا میں لے کر آئے اور وحی اور تمام آسمانی صحیفوں نے اس کی تصدیق اور تلقین کی، اس کو ہم خدا کی خوشنودی اور دنیا و آخرت میں اعمال کے بدلہ سے تعبیر کر سکتے ہیں،

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۳۷

سب جانتے ہیں کہ روزہ صحت کیلئے بھی مفید ہے، اور خالص طبی نقطۂ نظر سے بھی ہر شخص کیلئے مناسب اور بہتر ہے کہ وہ سال میں کچھ دن ضرور روزہ رکھے اس لئے کہ زیادہ کھانے پینے اور ہر وقت انواع واقسام کے کھانوں کی فکر میں مبتلا رہنے کا نتیجہ یہ ہے کہ طرح طرح کے جسمانی اور اخلاقی عوارض پیدا ہو گئے ہیں اور تقریباً ہر شخص ان سے عاجز اور پریشان ہے، اور یہ ماننے پر مجبور ہے کہ طب وصحت کے نقطۂ نظر سے بھی روزہ کے بہت فوائد ہیں، لیکن اگر یہ تحقیق کی جائے کہ ان لوگوں کی تعداد اس سال کیا تھی جنھوں نے رمضان کا روزہ محض اپنی صحت ٹھیک کرنے کیلئے یا اقتصادی مصالح کی بنا پر رکھا؟ اور کتنے ایسے روزے تھے جو صرف معدہ کی اصلاح، صحت کے اصول، یا کفایت شعاری کے جذبہ سے رکھے گئے؟ تو ہم کو بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ ایسے لوگوں اور اس قسم کے روزوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی، یہاں تک کہ جاڑے کے روزوں میں بھی جب اس میں کوئی خاص دشواری نہیں ہوتی ان کی تعداد میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکا، حالانکہ طبی اور اقتصادی روزہ شرعی روزہ کی بہ نسبت زیادہ آسان اور سہل ہے اور اس میں اتنی نازک پابندیوں کی بھی ضرورت نہیں،

اس کے برعکس اگر ان روزہ داروں کی مردم شماری کی جائے جو روزہ محض ایک دینی فریضہ سمجھ کر اور اللہ تعالیٰ کے وعدہ اور آخرت کے بدلہ کی بنیاد پر رکھتے ہیں، تو ہمیں نظر آئے گا کہ مادیت کے غلبہ اور دینی جذبہ کے ضعف وافسردگی کے باوجود ان کی تعداد لاکھوں سے کسی طرح کم نہیں ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو شدید ترین گرمی اور پیاس کی تکلیف کے باوجود محض دینی احساس کی بنا پر خوشدلی سے روزہ رکھتے ہیں اور راتوں کو عبادت بھی کرتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اہلِ ایمان کی نظر میں ان دینی منافع اور فوائد کی قیمت (جن کا علم ہم کو انبیاء کرام کے ذریعہ حاصل ہوا) ان معاشی طبی فوائد سے کہیں زیادہ ہے جن کا علم اطباء، ڈاکٹروں اور اقتصادیات کے ماہروں سے ہم کو حاصل ہوتا ہے، روزہ کے متعلق ایسی ایسی بشارتیں اور وعدے ان کے علم میں ہوتے ہیں جن کے سامنے روزہ کی معمولی تکلیفات اور وقتی بھوک پیاس بالکل ہیچ اور ناقابلِ ذکر ہے،

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابن آدم کا ہر عمل کئی

گنا بڑھا دیا جاتا ہے اور نیکی دس گنا سے لے کر سات سو تک بڑھا دی جاتی ہے، اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ سوائے روزہ کے اس لئے کہ بیشک وہ خاص میرے لئے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا، میری خاطر اپنا کھانا اور اپنی خواہش نفس سب چھوڑ دیتا ہے، روزہ دار کے لئے دو خوشیاں ہیں ایک افطار کے وقت اور ایک اپنے رب سے ملاقات کے وقت اور بیشک روزہ دار کے منہ کی بو اللہ تعالےٰ کے نزدیک مشک سے زیادہ اچھی اور پاکیزہ ہے[1]

سہل بن سعدؓ حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ جنت میں ایک دروازہ ہے جس کا نام "ریّان" ہے اس کیلئے صرف روزہ دار بلائے جائیں گے، جو روزہ داروں میں سے ہوگا وہی اس میں داخل ہوگا اور جو اس میں داخل ہو جائے گا وہ کبھی پیاسا نہ ہوگا،[2]

روزہ کی روح اور حقیقت کی حفاظت اور ایجابیت و سلبیت کا امتزاج

رمضان کی اجتماعی نوعیت اور معاشرہ میں اسکے رواج و عمومیت کی وجہ سے اس کا پورا اندیشہ تھا کہ عادت اور تقلید اور رسم و رواج کا عنصر اس پر رفتہ رفتہ غالب آجائے گا اور بہت سے لوگ محض اپنی سوسائٹی اور ماحول کا ساتھ دینے اور طنز و ملامت سے بچنے کے لئے اور اس ڈر سے کہ ان پر انگلیاں نہ اٹھائی جائیں روزہ رکھنے پر مجبور ہوں گے، ایمان اور نیتِ روزہ کی اہمیت اور اللہ تعالےٰ کی نگاہ میں اس کی قیمت کے یقین اور استحضار سے ان کے دل خالی ہوں گے، بہت سے لوگ مادی اغراض و مقاصد یا طبی اور ظاہری فوائد کے حصول کیلئے روزہ رکھنے لگیں گے اور اس طرح اس کا اصل مقصد ہی فوت ہو جائے گا،

نبوت کی دوررس نگاہ نے اس کمزوری کا علاج اور اس فتنہ کا سد باب سب سے پہلے کیا اور یہ شرط لگادی کہ اللہ تعالےٰ کے نزدیک صرف وہ روزہ مقبول ہے جو ایمان و احتساب کے جذبہ کے ساتھ رکھا جائے، حدیث نبوی ہے، من صام رمضان ایمانًا و احتسابًا غفر لہ ما تقدم من ذنبہ،[3]

---

[1] صحاح ستہ [2] شیخین [3] متفق علیہ

جو شخص انسانی کمزوریوں اور خامیوں اور انسانوں کی مختلف اقسام سے واقف نہیں وہ کہہ سکتا ہے کہ اس قید اور شرط کی کیا ضرورت تھی، رمضان کے روزے صرف مسلمان ہی رکھتے ہیں اور خدا کی خوشنودی اور اجر و ثواب ہی کیلئے رکھتے ہیں، اس لئے ایمان و احتساب کی شرط لگانا ایک بالکل زائد چیز اور تحصیل حاصل ہے، لیکن جو شخص انسانی احساسات و نفسیات اور اخلاقی و اجتماعی محرکات سے گہری واقفیت رکھتا ہے، اور اس کا زندگی کا مطالعہ زیادہ وسیع ہے وہ اس دور رس انتظام اور اس دقیق و عمیق علم کے سامنے سر تسلیم عجز کے ساتھ خم کر دے گا جو خواہش نفس پر نہیں وحی الٰہی پر مبنی ہے" وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحٰى،[1]

ایمان و احتساب کی تشریح ایک دوسری حدیث میں یہ آئی ہے کہ "انسان تمام اعمال ثواب کی امید رکھتے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی مغفرت و خوشنودی کے وعدہ پر یقین کرتے ہوئے انجام دے،

عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "چالیس خصلتیں ہیں جن میں سب سے اعلیٰ بکری کا عطیہ ہے ان میں سے کسی ایک خصلت پر بھی ثواب کی امید اور اس پر جو اجر و ثواب مقرر ہے اسکے یقین کے ساتھ عمل کیا جائے تو اسکے ذریعہ اللہ تعالیٰ آدمی کو جنت میں داخل کر دے گا"[2]

شریعت اسلامی نے روزہ کی ہیئت اور ظاہری شکل پر اکتفا نہیں کی بلکہ اس کی حقیقت اور اس کی روح کی طرف بھی پوری توجہ دی ہے، اس نے صرف کھانے پینے اور جنسی تعلقات ہی کو حرام نہیں کیا بلکہ ہر اس چیز کو حرام اور ممنوع قرار دیا ہے جو روزہ کے مقاصد کے منافی اور اس کی حکمتوں اور روحانی و اخلاقی فوائد کے لئے مضر ہے، اس نے روزہ کو ادب و تقویٰ، دل اور زبان کی عفت و طہارت کے حصار میں گھیر دیا ہے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "تم میں سے کوئی روزہ سے ہو تو بد کلامی اور فضول گوئی کرے نہ شور و شر کرے، اگر کوئی اس کو گالی دے اور لڑنے جھگڑنے پر آمادہ ہو تو یہ کہہ دے کہ میں روزہ سے ہوں"[3] یہ بھی ارشاد فرمایا کہ

---

[1] سورہ نجم ۳، ۴ [2] بخاری شریف [3] ایضاً۔

"جس نے جھوٹ بولنا اور اس پر عمل کرنا نہ چھوڑا تو اللہ تعالیٰ کو اس کی کوئی حاجت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑے"[1]

وہ روزہ جو تقویٰ اور عفاف کی روح سے خالی اور محروم ہو وہ ایک ایسی صورت ہے جس کی حقیقت نہیں، ایسا جسم ہے جس کی روح نہیں، حدیث میں آتا ہے، آپ نے فرمایا کہ "کتنے روزہ دار ہیں جن کو ان کے روزہ سے سوائے پیاس سے کچھ ہاتھ نہیں لگتا اور کتنے ایسے عبادت گزار ہیں جن کو....... اپنے قیام میں شب بیداری کے سوا کچھ نہیں ملتا"[2]

حضرت ابو عبیدہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "روزہ ڈھال ہے جبتک اس کو پھاڑ نہ ڈالا جائے"[3]

اسلامی روزہ صرف سلبی امور واحکام کا نام نہیں جس میں صرف کھانے پینے، غیبت، چغلخوری، لڑائی جھگڑے اور گالی گلوج کی ممانعت ہو، وہ بہت سے ایجابی امور واحکام کا بھی مجموعہ ہے، یہ عبادت وتلاوت ذکر وتسبیح، ہمدردی وخیر خواہی اور غربا پروری کا زمانہ ہے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "اس میں جو کسی ایک خصلت اور ایک عمل سے خدا کا تقرب حاصل کرنا چاہے گا وہ دوسرے دنوں کے ادائگی فرض کے برابر سمجھا جائے گا اور جو اس میں فرض ادا... کرے گا وہ اس کی طرح ہوگا جو غیر دنوں میں ستر فرض ادا کرے، یہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا بدلہ جنت ہے اور غمخواری کا مہینہ ہے"[4]

زید بن خالد الجہنیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جو روزہ دار کو افطار کرائے اس کو روزہ دار کے برابر اجر ملے گا اور روزہ دار کے اجر میں کوئی کمی نہ کی جائے گی"[5]

اللہ تعالیٰ نے اس امت میں تراویح کی حفاظت اور اس کے اہتمام کا جذبہ بھی پیدا فرمایا ہے، تراویح

---

[1] متفق علیہ [2] بخاری، ابوداؤد، ترمذی، [3] نسائی، "اوسط" میں یہ اضافہ ہے کہ سوال کیا گیا کہ کس چیز سے پھاڑ ڈالے، ارشاد ہوا جھوٹ یا غیبت سے [4] یہ روایت ایک طویل حدیث کے ساتھ سلمان فارسیؓ سے مروی ہے (بیہقی شعب الایمان) [5] ترمذی شریف۔

کی نماز حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے لیکن آپ نے تین دن پڑھ کر اس کو اس لئے چھوڑ دیا تھا کہ کہیں یہ امت پر فرض نہ ہو جائے اور مشقت کا باعث ہو، ابن شہاب روایت کرتے ہیں کہ مجھ سے عروہ نے بتایا وہ کہتے ہیں کہ مجھے حضرت عائشہؓ نے خبر دی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایک بار دیر سے رات میں اپنے گھر سے نکلے اور مسجد میں نماز پڑھی اور آپ کے ساتھ کچھ اور لوگوں نے بھی نماز پڑھی، جب صبح ہوئی تو لوگوں نے اس کے متعلق گفتگو شروع کی اور بہت سے لوگ جمع ہو گئے (دوسرے روز) جب آپ نے نماز پڑھی تو سب نے آپ کیساتھ نماز پڑھی، پھر صبح ہوئی اور اس کا چرچا ہوا تیسری رات نمازیوں کی تعداد بہت بڑھ گئی، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اور نماز پڑھی اور سب نے آپ کے ساتھ نماز ادا کی، جب چوتھی رات آئی تو نمازیوں کی کثرت سے مسجد میں جگہ نہ رہی، یہاں تک کہ فجر کی نماز کیلئے آپ باہر تشریف لائے اور نماز پڑھنے کے بعد لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ تم لوگوں کی موجودگی مجھ سے پوشیدہ نہ تھی لیکن مجھے ڈر ہوا کہ یہ نماز تم پر فرض نہ کر دی جائے، پھر تم اس سے عاجز ہو جاؤ، پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی اور یہی صورت رہی[1]، آپ کے بعد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس پر عمل پیرا رہے اور اس امت نے مختلف ملکوں اور مختلف زمانوں میں اس کی پوری پوری حفاظت کی، یہاں تک کہ تراویح کی یہ نماز تمام اہل سنت اور صالحین امت کی علامت بن گئی، اس کے علاوہ اس سے حفظ قرآن میں بھی بڑی مدد ملی[2]، اور اس کو بہت رواج اور عمومیت حاصل ہو گئی نہ جانے کتنے سینوں

---

[1] بخاری شریف باب "فضل من قام رمضان" [2] اس سلسلہ میں بعض ان ممالک کے ساتھ جو مرکز اسلام سے بہت دور تھے اللہ تعالے کا خاص فضل رہا چنانچہ ہندوستان و پاکستان میں تراویح اور ختم قرآن کا جتنا اہتمام ہے اور عوام و خواص سب اسکے گرویدہ ہیں یہ بات اس درجہ میں کسی اور ملک میں نہیں ملتی یہاں محلہ کی چھوٹی چھوٹی مسجدوں میں بھی تراویح کا اہتمام کیا جاتا ہے اور کم از کم ایک ختم ضرور ہوتا ہے، بڑی اور خاص مساجد میں کئی کئی ختم ہوتے ہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس سنت کے التزام کی وجہ سے حفاظ کی تعداد میں بہت نمایاں اضافہ ہوا اور رمضان کی خاطر پورے سال قرآن مجید کے دور کا معمول بن گیا اور ایسے ایسے حفاظ پیدا ہوئے جو حیرت انگیز کمالات رکھتے تھے اور حفظ قرآن کے شعبہ میں غیر معمولی اور ممتاز حیثیت کے مالک تھے،

میں وہ محفوظ ہو گیا، مزید براں اس کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے عامۃ الناس کے ایک بہت بڑے طبقہ کو محض تراویح کے ذریعہ قیام لیل اور عبادت کی سعادت نصیب ہوتی ہے،

ان سب چیزوں نے رمضان کو عبادت کا جشن عام، تلاوت کا موسم، اور ابرار و متقین اور عبّاد و صالحین کے حق میں فصل بہار بنا دیا ہے، اس میں اس امت کا دینی جذبہ، دین کا احترام اور عبادت کا شوق پوری طرح جلوہ گر ہو کر سامنے آجاتا ہے[1] اور اس کی توبہ و انابت، قلوب کی نرمی، خدا کی طرف رجوع، احساس ندامت اور کار خیر میں جذبۂ مسابقت، اس نقطۂ عروج پر ہوتا ہے جس کے عشر عشیر تک دنیا کی کوئی قوم اور انسانوں کا کوئی گروہ نہیں پہونچ سکتا" ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ"

---

[1] رمضان میں زیادہ سے زیادہ عبادت، تقرب الی اللہ، خیر کے کاموں میں مسابقت، تلاوت اور ختم قرآن کا اہتمام ایسی میراث تھی جو مسلسل اور تواتر کے ساتھ ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتی رہی اور اللہ کے خوش نصیب بندوں نے اس میں ایسے ایسے مراتب اور کمالات حاصل کئے جن پر آسانی کے ساتھ یقین کرنا مشکل ہے اور جس کی تاویل اہل ایمان اور اہل یقین کی عزیمت اور طاقتور روحانیت کے سوا کسی اور چیز سے نہیں کی جاسکتی، ہم نے ان علماء ربانیین اور مشائخ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے جن کا معمول روزانہ ایک قرآن مجید ختم کرنے کا تھا، ان کی تقریباً پوری رات شب بیداری اور قیام میں گزرتی تھی، خوراک اس قدر کم ہو جاتی تھی کہ حیرت ہوتی تھی کہ اس قدر کم کھانے کے باوجود اس قدر نشاط اور مجاہدہ کیسے ممکن ہے، یہ مشائخ اس ماہ صیام کی ایک ایک سانس اور ایک ایک لمحہ کو غنیمت جانتے تھے اور اس کو کسی اور چیز میں ضائع کرنا پسند نہ کرتے تھے ان کو دیکھ کر رمضان کی اہمیت کا اندازہ ہوتا تھا اور زندگی کی قیمت کا بھی اور یہ بھی اچھی طرح سمجھ میں آجاتا تھا کہ متقدمین کے زہد و عبادت، قوت ارادی اور علو ہمت کے جو محیر العقول واقعات تاریخ میں منقول ہیں وہ یقیناً سچے ہوں گے۔

روزہ کے مقاصد کے باب میں کوتاہی اور عبادت پر عادت کا غلبہ

لیکن اسی کے ساتھ مسلمانوں نے روزہ کے مقاصد کیساتھ اکثر ناانصافی سے کام لیا اور مختلف عادتوں کی وجہ سے اس کے یقینی اور متوقع فوائد سے محروم ہوگئے، انھوں نے افطار اور کھانے میں اس قدر مبالغہ اور اسراف سے کام لینا شروع کردیا کہ روزہ کا اصل فائدہ اور اس کی اصلاحی اور تربیتی قوت بڑی حد تک ختم ہوگئی یا کمزور پڑگئی،

امام غزالیؒ نے اس نکتہ پر بڑی بلاغت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے وہ لکھتے ہیں:۔

"پانچواں ادب یہ ہے کہ افطار کے وقت حلال غذا میں بھی احتیاط سے کام لے اور اتنا نہ کھائے کہ اس کے بعد گنجائش ہی باقی نہ رہے، اس لئے کہ حلق تک بھرے ہوئے پیٹ سے بڑھ کر مبغوض اللہ کے نزدیک کوئی بھری جانے والی چیز نہیں ہے، اگر روزہ دار افطار کے وقت دن بھر کی تلافی کردے اور جو دن بھر کھانے والا تھا وہ اس ایک وقت میں کھالے تو دشمن خدا پر غالب آنے اور شہوت کو ختم کرنے میں روزہ سے کیا مدد مل سکے گی ؟ یہ عادتیں مسلمانوں میں اتنی راسخ اور عام ہوچکی ہیں کہ رمضان کیلئے بہت پہلے سے سامان خوراک جمع کیا جاتا ہے اور رمضان کے دنوں میں اتنا اچھا اور نفیس کھانا کھایا جاتا ہے جو اور دنوں میں نہیں کھایا جاتا، روزہ کا مقصود تو خالی پیٹ رہنا اور خواہشات نفس کو دبانا ہے تاکہ تقویٰ کی صلاحیت پیدا ہوسکے، اب اگر معدہ کو صبح و شام تک کھانے پینے سے محروم رکھا جائے اور شہوت اور بھوک کو خوب امتحان میں ڈالنے کے بعد انواع و اقسام کے کھانوں سے پیٹ بھر لیا جائے تو نفس کی خواہشات اور لذتیں کم نہ ہوں گی اور بڑھ جائیں گی، بلکہ ممکن ہے کہ بہت سی ایسی خواہشات جو ابھی تک خوابیدہ تھیں وہ بھی بیدار ہوجائیں، رمضان کی روح اور اس کا راز ان طاقتوں کو کمزور کرتا ہے جن کو شیاطین اپنے وسائل کے طور پر استعمال کرتے

ہیں اور یہ بات تقلیل غذا ہی سے حاصل ہوگی، یعنی یہ کہ شام کو اتنا ہی کھائے جتنا دونوں میں کھاتا تھا، اگر کوئی دن بھر کا حساب لگا کر ایک ہی وقت میں کھالے تو اس سے روزہ کا فائدہ حاصل نہ ہوگا۔"[۱]

"بلکہ یہ بھی آداب میں داخل ہے کہ دن میں زیادہ نہ سوئے تاکہ بھوک پیاس کا کچھ مزہ معلوم ہو، قویٰ کے ضعف کا احساس ہو، قلب میں صفائی پیدا ہو، اسی طرح ہر شب کو اپنے معدہ کو اتنا ہلکا رکھے کہ تہجد اور اوراد میں مشغولی آسان ہو اور شیطان اس کے دل کے پاس منڈلا نہ سکے اور اس صفائی قلب کی وجہ سے عالم قدس کا دیدار اس کیلئے ممکن ہو"[۲]

تحریف اور غلو سے حفاظت

رمضان میں غلو اور تشدد، مشکل پسندی و نکتہ آفرینی کا امکان بہت تھا اس لئے کہ بہت سے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ اس کا موضوع اور مقصد ہی نفس کو مارنا، خواہشات سے پیچھا چھڑانا اور اس کو آخری حد تک سختی اور مجاہدہ میں مبتلا کرنا ہے وہ سمجھتے تھے کہ جو شخص اپنے نفس کو جتنی مشکل میں ڈالے گا اور جس قدر سخت مجاہدہ کرے گا، کھانے پینے اور آرام و راحت سے اپنے کو جتنا دور رکھے گا، بھوک، پیاس کی تکلیف جتنی زیادہ اٹھائے گا، اور صبر اور قوت برداشت کا ثبوت دے گا اللہ تعالیٰ کا اسی لحاظ سے مقرب اور محبوب ہوگا اور عافیت پسندوں و مالداروں کی صف سے نکل کر متقین و صابرین کی صف میں داخل ہو جائے گا،

یہ وہ غلط اور سطحی خیال ہے جس نے قدیم اقوام اور مذاہب کے دین داروں اور زاہد و تارک الدنیا لوگوں میں (عبادات میں عام طور پر اور روزہ میں خاص طور پر) اس قدر غلو پیدا کر دیا تھا کہ انھوں نے کھانے پینے سے پرہیز کی مدت بہت بڑھا دی تھی، افطار بہت تاخیر سے کرتے تھے اور سحری جلد کھا لینا چاہتے تھے یا اس کو مطلق ترک کر دیتے تھے، وہ اس کو بڑی کمزوری اور عجز قرار دیتے تھے کہ آدمی ان چیزوں کا محتاج ہو

---

[۱] احیاء العلوم ص ۲۱۱ [۲] ایضاً

کبھی مسلسل روزے رکھتے تھے اور دن کے ساتھ رات کی پابندی بھی شامل کر لیتے تھے، بہت سے غالی اور متشدد مسلمانوں اور اہلِ بدعت نے بھی اس میں ان کی اتباع شروع کر دی، لیکن دراصل یہ کوشش دین میں تحریف اپنے نفس پر ظلم اور رہبانیت کے اختیار کرنے کے مرادف ہے اور اس سے فسادِ عام کا دروازہ کھلتا ہے، یہ اللہ تعالٰے کے اس فرمان کو کھلا ہوا چیلنج ہے کہ :-

يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ[1] — اللہ تمہارے حق میں سہولت چاہتا ہے اور تمہارے حق میں دشواری نہیں چاہتا۔

. . . .

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ[2] — اور اس نے تم پر دین کے بارے میں کوئی تنگی نہیں کی،

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

ان الدین یسر، ولا یشاد ھذا الدین أحد الا غلبہ فسددوا وقاربوا۔[3] — دین سہل ہے، اور جو شخص اس دین سے سینہ زوری کریگا (اور اپنی طاقت کا اظہار کرنے کے لئے اس میں تشدد سے کام لے گا) بالآخر اسی کو ہار ماننی پڑے گی پس درستی اور میانہ روی سے کام لو،

ان مصالح کے پیش نظر شریعت الٰہی نے اس کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا، اس نے سحری کی باقاعدہ ترغیب دی، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خود مسلمانوں کیلئے اس کو سنت قرار دیا، انس بن مالکؓ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ "سحری کھاؤ اس لئے کہ سحری میں برکت ہے"[4]،

حضرت عمرو بن العاصؓ حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں آپ نے فرمایا کہ "ہمارے اور اہلِ کتاب کے روزہ میں فرق اسی سحری کا ہے"[5]،

---

[1] سورہ بقرہ — ۱۸۵ [2] سورہ حج — ۷۸ [3] روایت حضرت ابوہریرہؓ (بخاری کتاب الایمان)

[4] شیخین، ترمذی، نسائی [5] مسلم شریف۔

آپ نے افطار میں تاخیر کرنے سے بھی منع فرمایا ہے اور اس کو فساد اور فتنہ کی نشانی اور اہلِ کتاب کے غالی دین داروں کا شعار قرار دیا ہے، سہیل بن سعدؓ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں آپ نے فرمایا کہ "جب تک لوگ افطار میں تعجیل سے کام لیتے رہیں گے اس وقت تک خیر پر رہیں گے"[۱] حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "جب تک لوگ افطار میں عجلت سے کام لیتے رہیں گے اس وقت تک دین غالب رہے گا، اس لئے کہ یہود و نصاریٰ اس میں تاخیر کرتے ہیں"[۲] اسی طرح سحور میں تاخیر بھی مسنون ہے اور صحابہ کرام اسی پر عامل تھے، زید بن ثابتؓ سے روایت ہے کہ "ہم نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سحری کھائی پھر نماز کیلئے کھڑے ہوئے، پوچھا گیا کہ ان کے درمیان کتنا وقفہ تھا، انھوں نے کہا کہ پچاس آیتوں کے برابر"[۳] حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دو موذن تھے بلالؓ اور ابن ام مکتومؓ، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بلالؓ کی اذان رات کی علامت ہے اس میں اس وقت تک کھاؤ پیو جب تک ام مکتومؓ اذان نہ دے دیں، وہ کہتے ہیں کہ ان دونوں میں بس اتنا وقفہ تھا کہ ایک اترتا تھا دوسرا چڑھتا تھا،،[۴]

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے اس موضوع پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے اور شریعت اسلامی اور سنت نبوی میں اس پہلو کی جو اہمیت ہے اس کو بہت فاضلانہ طریقہ پر اجاگر کیا ہے، وہ کہتے ہیں۔

"روزہ کے مقاصد میں ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ ضرورت سے زائد گہرائی میں نہ پڑا جائے، نکتہ آفرینی اور تشدد کی راہ اختیار کرنے کا دروازہ بند کر دیا جائے اس لئے کہ یہ عبادت یہود و نصاریٰ اور خود عرب کے عبادت گزار لوگوں میں معروف اور رائج تھی، انھوں نے یہ سوچ کر کہ روزہ کی بنیاد نفس کشی پر ہے اس میں بہت تشدد سے کام لیا اور نفس کو تکلیف پہونچانے کی غرض سے بہت سی چیزیں اپنی طرف سے ایجاد کرلیں اور یہی وہ نقطہ ہے جس سے تحریف کا

---

[۱] شیخین موطا، ترمذی [۲] ابوداؤد [۳] متفق علیہ [۴] متفق علیہ۔

آغاز ہوتا ہے جو کبھی کمیت میں ہوتی ہے کبھی کیفیت میں، کمیت میں اس کی مثال حضورؐ کے اس ارشاد سے سمجھ میں آتی ہے کہ رمضان سے پہلے (متصلا) کوئی ایک روزہ یا دو روزے نہ رکھے، اسی طرح عید اور شک کے روزہ سے آپ کا منع فرمانا کہ "اس کے اور رمضان کے بیچ میں کوئی فصل نہیں ہے"، اس لئے ہے کہ اگر یہ تشدد لوگ اس کو سنت بنالیں گے تو دوسرے انکی اتباع کریں گے اور اس طرح بات تحریف تک جا پہونچے گی، تشدد دراصل شدت احتیاط ہی سے پیدا ہوتا ہے اور شک کا روزہ اسی قبیل سے ہے،

کیفیت میں اس کی مثال صوم وصال کی ممانعت، سحری کی ترغیب اور اس کی تاخیر کا حکم ہے اس لئے کہ یہ سارا تشدد اور غلو جاہلیت کی پیداوار ہے[1]۔

روزہ دراصل امر الٰہی کی تعمیل کا نام ہے جس طرح فجر کے بعد کھانے پینے اور خواہشات کی تکمیل کی ممانعت ہے خواہ کتنی بھوک پیاس لگے اور طبیعت پر کیسا ہی تقاضا ہو، اسی طرح غروب آفتاب کے بعد کھانے پینے سے احتراز کی بھی ممانعت ہے، خواہ زہد و ترک دنیا کے جذبات اس وقت کتنے ہی طاقتور کیوں نہ ہوں، فیصلہ نفس پر، خواہشات پر، اور ذوق و عبادت پر نہیں بلکہ خدا کے حکم پر ہوگا' اور اس حکم سے سرتابی خدا کے سامنے بہادری دکھانے اور دین کے ساتھ کشمکش کے مرادف سمجھی جائے گی' روزہ دار اپنی خواہشات سے جتنا آزاد ہوگا حکم الٰہی، شریعت الٰہی کا جتنا پابند اور مشیت الٰہی پر جتنا راضی ہوگا اسی قدر اپنی عبودیت میں سچا اور انانیت سے پاک سمجھا جائے گا،

حضرت مجدد الف ثانیؒ اپنے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:۔

"سحور میں تاخیر اور افطار میں تعجیل سے روزہ دار کا عجز و احتیاج اچھی طرح ظاہر ہوتا

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۳۹

ہے اور یہ بات اس کی عبدیت کے عین مطابق ہے، اور اس کے مقصد کو پورا کرتی ہے[۱]،

اعتکاف

اعتکاف رمضان کے فوائد اور مقاصد کی تکمیل کیلئے ہے، اگر روزہ دار کو رمضان کے پہلے حصہ میں وہ سکون قلب، جمعیت باطنی، فکر و خیال کی مرکزیت، انقطاع الی اللہ کی دولت، رجوع الی اللہ کی حقیقت، اور اس کے درِ رحمت پر پڑے رہنے کی سعادت، حاصل نہیں ہو سکی تو اس اعتکاف کے ذریعہ وہ اس کا تدارک کر سکتا ہے،

علامہ ابن قیمؒ لکھتے ہیں:۔

"اعتکاف کی روح اور اس سے مقصود یہ ہے کہ قلب اللہ تعالےٰ کے ساتھ وابستہ ہو جائے اس کے ساتھ جمعیت باطنی حاصل ہو، اشتغال بالخلق سے رہائی نصیب ہو اور اشتغال بالحق کی نعمت میسر آئے، اور یہ حال ہو جائے کہ تمام افکار و ترددات اور ہموم و وساوس کی جگہ اللہ کا ذکر اور اس کی محبت لے لے، ہر فکر اس کی فکر میں ڈھل جائے اور ہر احساس و خیال اس کے ذکر و فکر اور اس کی رضا و قرب کے حصول کی کوشش کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے، مخلوق سے انس کے بجائے اللہ سے انس پیدا ہو اور قبر کی وحشت میں جب کوئی اس کا غمخوار نہ ہوگا یہ انس اس کا زادِ سفر بنے یہ ہے اعتکاف کا مقصد جو رمضان کے افضل ترین دنوں یعنی آخری عشرہ کے ساتھ مخصوص ہے[۲]"

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں:۔

"چونکہ مسجد میں اعتکاف جمعیت خاطر، صفائی قلب، ملائکہ سے تشبہ اور شب قدر کے حصول کا ذریعہ نیز طاقت و عبادات کا بہترین و پرسکون موقع ہے اس لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو عشرۂ اواخر میں رکھا ہے اور اپنی امت کے محسنین و صالحین کیلئے اسکو

---

[۱] مکتوبات امام ربانی، مکتوب ۴۵ [۲] زاد المعاد صفحہ ۱۷۵

سنت قرار دیا ہے[1]"

اسی لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس پر ہمیشہ مداومت فرمائی اور مسلمانوں نے بھی ہر جگہ اور ہر دور میں[2] اس کی پابندی کی، چنانچہ اس نے رمضان کے شعار اور سنت متواتر کی حیثیت اختیار کر لی، حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ "نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم رمضان کے اخیر عشرہ میں برابر اعتکاف فرماتے تھے، یہاں تک کہ آپ نے انتقال فرمایا، پھر آپ کے بعد آپ کی ازواج نے اعتکاف کا معمول قائم رکھا[3]"

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہر رمضان میں دس دن اعتکاف فرماتے تھے، جس سال آپ نے انتقال فرمایا اس سال آپ نے بیس دن اعتکاف کیا[4]"

شب قدر

قرآن وحدیث میں شب قدر کی فضیلت بہت اہمیت کے ساتھ متعدد جگہ بیان کی گئی ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے،

إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝ لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ ۝ تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِم مِّن كُلِّ أَمْرٍ ۝ سَلَامٌ هِيَ حَتَّىٰ مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝[5]

بے شک ہم نے اسے (قرآن کو) شب قدر میں اتارا ہے، اور آپ کو خبر ہے کہ شب قدر ہے کیا؟ شب قدر ہزار مہینوں سے بڑھکر ہے، اس رات فرشتے اور روح القدس اترتے ہیں اپنے پروردگار کے حکم سے ہر امر خیر کے لئے، سلامتی (ہی سلامتی) ہے وہ رہتی ہے طلوع فجر تک۔

حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "شب قدر میں جو ایمان واحتساب کے ساتھ عبادت کرے گا

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۴۲ [2] اعتکاف اکثر مذاہب فقہ میں سنت ہے اور اس پر سب کا اجماع ہے کہ واجب نہیں ہے، احناف کے نزدیک آخری عشرہ میں رکھنا سنت موکدہ اور سنت کفایہ ہے، بحوالہ برہان وغیرہ [3] متفق علیہ [4] بخاری شریف [5] سورہ قدر

اس کے پچھلے گناہ معاف کر دئے جائیں گے[۱]

اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت و رحمت سے اس کو رمضان کے آخری عشرہ میں پوشیدہ رکھا ہے تاکہ مسلمان اس کی جستجو میں رہیں، ان کی طلب اور ہمت بڑھے اور وہ یہ سب آخری راتیں اس کی لالچ میں قیام و عبادت اور دعا و مناجات میں گزاریں، جیسا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا راوی ہیں کہ جب رمضان کا آخری عشرہ شروع ہوتا تھا، تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پوری رات بیدار رہتے تھے اور اپنے گھر والوں کو بھی جگاتے تھے اور کمر کس لیتے تھے[۲]۔

احادیث کا زیادہ تر اجماع اسی پر ہے کہ شب قدر آخری عشرہ میں اور اس کے بھی آخری سات دنوں میں اور طاق راتوں میں ہے، ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے بعض کو آخری سات دنوں میں خواب میں شب قدر دکھائی گئی، اس پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں دیکھتا ہوں کہ تمہارا خواب زیادہ تر آخری سات دنوں کے متعلق ہے پس جو اس کو تلاش کرنا چاہے وہ آخری سات دنوں ہی میں تلاش کرے[۳]"، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرہ میں معتکف اور گوشہ نشین ہو جاتے تھے اور فرماتے تھے کہ شب قدر رمضان کے آخری عشرہ میں تلاش کرو[۴]" حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ شب قدر رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں تلاش کرو[۵]"

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے شب قدر پر حدیث و قرآن اور تجربہ و وجدان دونوں حیثیتوں سے کلام کیا ہے "حجۃ اللہ البالغۃ" میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"جاننا چاہئے کہ شب قدر دو قسم کی ہیں ایک وہ جس میں آسمان سے فیصلے کئے جاتے ہیں، یہ وہ رات ہے جس میں قرآن مجید (سماء دنیا پر) پورے کا پورا نازل ہوا اس کے بعد

---

[۱] متفق علیہ [۲] متفق علیہ [۳] ایضاً [۴] ایضاً [۵] بخاری شریف

تھوڑا تھوڑا نازل ہوتا رہا، یہ رات سال بھر میں صرف ایک مرتبہ آتی ہے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ رمضان ہی میں ہو، البتہ گمانِ غالب رمضان ہی میں ہونے کا ہوتا ہے، نزول قرآن کے موقع پر یہ رات رمضان ہی میں تھی،

دوسری وہ ہے جس میں ایک قسم کی روحانیت محسوس ہوتی ہے، فرشتے زمین پر اتر آتے ہیں، مسلمان اس رات میں طاعت میں مشغول ہوتے ہیں اور ان کے انوار و برکات سے ایک دوسرے کو فیض پہونچتا ہے، فرشتے ان سے قرب حاصل کرتے ہیں، شیاطین ان سے دور بھاگتے ہیں، ان کی دعائیں اور طاعات قبول کی جاتی ہیں، یہ رات ہر رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں ملتی ہے، یہ مقدم موخر ہو سکتی ہے لیکن رمضان ہی میں رہتی ہے اس لحاظ سے جو پہلی رات مراد لیتا ہے وہ کہتا ہے کہ یہ سال کے اندر دائر و سائر رہتی ہے، جس کی مراد دوسری رات ہوتی ہے وہ یہ کہتا ہے کہ رمضان کے آخری عشرہ میں پائی جاتی ہے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "میں دیکھتا ہوں کہ تمہارا خواب زیادہ تر آخری سات دنوں کے متعلق ہے پس جو اس کو تلاش کرنا چاہے وہ آخری سات دنوں ہی میں تلاش کرے"، ایک مرتبہ یہ بھی ارشاد ہوا کہ "یہ رات مجھے دکھائی گئی، میں نے دیکھا کہ میں پانی اور مٹی میں سجدہ کر رہا ہوں اور یہ اکیسویں شب تھی" اسی سلسلہ میں صحابۂ کرام کا اختلاف دراصل اختلافِ وجدان پر مبنی ہے[۱]"

روزہ میں اسلام کا اصلاحی کردار

اسلام نے جس طرح دوسرے تمام فرائض و عبادات اور مناسک میں اپنا اصلاحی کردار ادا کیا ہے اسی طرح اس نے روزہ کے مفہوم، آداب و احکام اور اس کی شکل اور طریقۂ کار میں بھی اپنا یہ اصلاحی و انقلابی کردار ادا کیا ہے،

---

[۱] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ صہ ۴۱، ۴۲

اور اس بات نے روزہ کو بہت آسان و خوشگوار، فطرت سلیم سے بہت قریب، متعدد روحانی و اجتماعی فوائد کا حامل، اور معاشرہ پر پوری طرح اثر انداز بنا دیا ہے،

ان متنوع اور دوررس اصلاحات میں سب سے پہلی اصلاح یہ ہے کہ پہلے روزہ کے مفہوم کو بالکل بدل دیا گیا تھا، ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ یہودی مذہب میں روزہ غم و ماتم کا رمز اور تاریخی مصائب کی الم انگیز یاد کی حیثیت رکھتا تھا، اسلام نے اس تاریک مفہوم کو جس پر حزن و یاس اور ناکامی کا سایہ تھا ایک ایسے ہمت افزا اور روشن مفہوم سے بدل دیا جس میں امید اور ذوق و شوق کی روح کارفرما ہے اس نے اس کو ایک عمومی عبادت بنا دیا جس میں روزہ دار خوشی و مسرت اور قوت و چستی کے ساتھ حصہ لیتا ہے اور اللہ تعالےٰ نے اس کی جزا اور اپنی رضا کے جو وعدے کئے ہیں اور بشارتیں دی ہیں ان سے خوش ہوتا ہے اور اطمینان قلب حاصل کرتا ہے، اس کے علاوہ جو آیات و احادیث اس سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں اور جو انسان میں طبعی طور پر جوش و مسرت پیدا کرتی ہیں، ان سے بھی روزہ دار کے اس شعور اور اعتماد میں بڑی مدد ملتی ہے، حدیث قدسی میں ہے کہ "صرف روزہ ایسی چیز ہے جس کا بدلہ میں ہی دوں گا"[1] اسی حدیث میں آگے آتا ہے کہ "روزہ دار کو دو خوشیاں حاصل ہیں ایک افطار کے وقت اور ایک اپنے رب سے ملاقات کے وقت"[2]

اس نے روزہ دار کو تقدس و پاکیزگی، رفعت و بلندی، اور خدا کے ہاں بلند مرتبہ و مقام کی ایک خاص فضا سے گھیر دیا ہے، ارشاد ہے کہ "روزہ دار کے منہ کی بو اللہ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے بہتر ہے"[3]

ظاہر ہے کہ یہ فضا غم و حزن اور بدگمانی و بدظنی کی اس فضا سے قطعاً مختلف ہے جو یہود کے یہاں ملتی ہے،

یہودیوں کے نزدیک روزہ جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، نفس کی تذلیل اور تعزیر کے مرادف ہے اور یہ تعبیر ان کی مذہبی کتابوں میں عام طور پر پائی جاتی ہے،

"اور یہ تمہارے لئے ایک دائمی قانون ہو، کہ ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ کو تم

---

[1] صحاح ستہ [2] روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ (صحاح ستہ) [3] ایضاً

اپنی جان کو دکھ دینا، اور اس دن کوئی خواہ وہ دیسی ہو یا پردیسی جو تمہارے بیچ بود و باش رکھتا ہو، کسی طرح کا کام نہ کرے، کیونکہ اس روز تمہارے واسطے تم کو پاک کرنے کیلئے کفارہ دیا جائے گا، سو تم اپنے سب گناہوں سے خداوند کے حضور پاک ٹھہرو گے۔"[1]

دوسری جگہ آتا ہے:۔

"اور خداوند نے موسیٰ سے کہا، اسی ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ کو کفارہ کا دن ہے اس روز تمہارا مقدس مجمع ہو، اور تم اپنی جانوں کو دکھ دینا، اور خداوند کے حضور آتشیں قربانی گذراننا، تم اس دن کسی طرح کا کام نہ کرنا، کیونکہ وہ کفارہ کا دن ہے جس میں خداوند تمہارے خدا کے حضور تمہارے لئے کفارہ دیا جائے گا۔"[2]

گنتی میں ایک جگہ آیا ہے:۔

"پھر اسی ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ کو تمہارا مقدس مجمع ہو، تم اپنی اپنی جان کو دکھ دینا اور کسی طرح کا کام نہ کرنا۔"[3]

اس کے برعکس شریعت اسلامی نے نہ روزہ کو نفس کو ایذا پہنچانے اور تکلیف میں مبتلا کرنے کا ذریعہ بنایا ہے نہ اس کو خدا کا عذاب قرار دیا ہے، پورے قرآن و حدیث میں ایک لفظ بھی ہم کو ایسا نہیں ملتا جس سے اس کا اشارہ نکلتا ہو، اس نے اس کو ایک ایسی عبادت کے طور پر پیش کیا ہے جس کا مقصد اللہ تعالے کا قرب حاصل کرنا ہے، اس لئے اس کے احکام اور قوانین بھی ایسے خشک اور ایسے ظالمانہ نہیں بنائے کہ اس کا قطعی نتیجہ نفس کی ایذا رسانی کی شکل میں ظاہر ہوتا اور اس پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ پڑ جاتا

---

[1] احبار ۱۶۔ آیات:۔ ۲۹۔ ۳۰۔ ۳۱، کتاب مقدس (پرانا اور نیا عہد نامہ) برٹش اینڈ فارن بائیبل سوسائٹی، انارکلی، لاہور، [2] ایضاً باب ۲۳ (۲۶۔ ۲۷۔ ۲۸)

[3] گنتی باب ۲۹ (۷)

بلکہ اس نے سحری کھانا سنت قرار دیا اور تاخیر کے ساتھ کھانے کو مستحب کیا اور ہدایت کی کہ فجر کی پو پھٹنے تک کھاتے رہو، افطار میں عجلت کا حکم دیا، رات اور دن دونوں میں سونے اور آرام کرنے کی اجازت دی، کاروبار، تجارت، اور مفید جائز کاموں میں انہماک و مصروفیت کو بھی، یہودی مذہب کے برعکس، جائز رکھا جس میں روزہ کی حالت میں کام کرنا ممنوع ہے اور مکمل طور پر خلوت و عبادت لازمی ہے،

روزہ بہت سے قدیم مذاہب میں (اور اب بھی اس کی مثالیں موجود ہیں) کسی ایک طبقہ کے ساتھ مخصوص سمجھا جاتا تھا، ہندو مذہب میں اس کی زیادہ تر ذمہ داری برہمنوں پر تھی، مجوسیوں کے نزدیک صرف مذہبی پیشواؤں اور پارسی عالموں (دستور) پر واجب تھا، یونانیوں کے نزدیک صرف عورتوں پر فرض تھا مرد اس سے مستثنیٰ تھے،

اسلام نے اس کو ہر قسم کی طبقہ واری قید اور بندش سے آزاد کر کے بالکل عام کر دیا اور اعلان کر دیا گیا کہ:۔

فَمَنۡ شَهِدَ مِنۡكُمُ الشَّهۡرَ فَلۡيَصُمۡهُ ؕ[1] — سو تم میں سے جو کوئی اس مہینہ کو پائے تو لازم ہے کہ وہ (مہینہ بھر) روزہ رکھے،

قدیم مذاہب میں اس تخصیص اور امتیازی حکم کے باوجود لوگ اس سے مستثنیٰ نہ تھے، اسلام نے آکر ان سب معذوروں کو سہولت بہم پہونچائی، ان کیلئے آسانی پیدا فرمائی اور ان کو پوری رعایت دی،

فَمَنۡ كَانَ مِنۡكُمۡ مَّرِيۡضًا اَوۡ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنۡ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ[2] — پھر تم میں سے جو شخص بیمار ہو، یا سفر میں اس پر دوسرے دنوں کا شمار رکھنا (لازم ہے)

دوسری جگہ آتا ہے،

وَعَلَى الَّذِيۡنَ يُطِيۡقُوۡنَهٗ فِدۡيَةٌ طَعَامُ مِسۡكِيۡنٍ ؕ[3] — اور جو لوگ اسے مشکل سے برداشت کر سکیں ان کے ذمہ فدیہ ہے (کہ وہ) ایک مسکین کا کھانا ہے۔

بہت سے مذاہب میں اس قدر غلو اور تشدد تھا کہ چالیس چالیس روز تک غذا کی ممانعت کر دی گئی تھی، بعض

---

[1] سورہ بقرہ — ۱۸۵ [2] بقرہ — ۱۸۴ [3] ایضاً ۱۸۴

مذاہب میں اس قدر آزادی اور توسع سے کام لیا گیا کہ صرف گوشت کھانا ممنوع قرار دیا گیا اور باقی ہر چیز جائز کردی گئی، لیکن اسلام کا حکیمانہ قانون اس تشدد و غلو اور ضرورت سے زائد توسع و آزادی دونوں کے خلاف ہے، اسلامی روزہ ایک معتدل اور عادلانہ روزہ ہے جس میں نہ جسم کو ایذا پہونچانے اور اپنے کو زندہ درگور کردینے کی اجازت ہے اور نہ لگام کو بالکل ہاتھ سے چھوڑ دینے اور "خیالی جنت" میں رہنے کی،

یہودی افطار کے وقت جتنا کھا لیتے اسی پر اکتفا کرتے تھے اور اس کے بعد کوئی اور چیز کھانا... یا آرام کرنا ناجائز سمجھتے تھے، رات میں بھی وہ ہر قسم کے مباح کاموں اور کھانے پینے سے احتراز کرتے تھے، اسلام نے ان سب خود ساختہ قیود کو ختم کیا اور قرآن مجید نے اعلان کردیا،

وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ [۱]

اور کھاؤ اور پیو جب تک کہ تم پر صبح کا سفید خط سیاہ خط سے نمایاں ہوجائے۔

اس نے خطا اور نسیان سے سرزد ہونے والی غلطیوں پر بھی کوئی گرفت نہیں کی، [۲]

اسلام میں اضطراری افعال اور مجبوریوں سے بھی روزہ نہیں ٹوٹتا، مثلاً قے، نکسیر پھوٹ جانا اور احتلام، [۳]

اکثر قدیم مذاہب میں روزہ شمسی مہینوں کے حساب سے رکھا جاتا تھا اور اس کے لئے ریاضیات و فلکیات کے بڑے علم اور تقویم شناسی کی ضرورت تھی، پھر یہ کہ یہ دن ہمیشہ خاص اور متعین مہینوں میں پڑتے تھے اور ان میں کوئی تغیر نہ ہوتا تھا، لیکن اسلامی روزہ قمری مہینوں کے ساتھ اور رویت ہلال کے ساتھ مربوط ہے، [۴]

---

[۱] سورہ بقرہ - ۱۸۷ [۲] حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے بھول کر کچھ کھا پی لیا وہ روزہ نہ توڑے، یہ اللہ کی طرف سے دعوت ہے جو اسکو عطا ہوئی" (ترمذی) شیخین نے بھی یہ روایت درج کی ہے انکے الفاظ یہ ہیں من نسی وھو صائم فاکل وشرب فلیتم صومہ فانما اطعمہ اللہ وسقاہ" (جو بھول گیا اور روزہ سے تھا اور کھا پی لیا وہ اپنے روزہ کو پورا کرے اسلئے کہ اللہ نے اسکو کھلایا پلایا ہے) [۳] حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین چیزوں سے روزہ نہیں ٹوٹتا پچھنا لگوانا، قے اور احتلام، [۴] شریعت میں اعتبار ظہور ہلال کا ہے وجود ہلال کا نہیں، اسلئے اسکے رویت ہلال کے اثبات کیلئے

(باقی حاشیہ صفحہ ۲۸۵ پر)

قرآن مجید میں آتا ہے کہ:۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ قُلْ هِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ [۱]

آپ سے (لوگ) نئے چاندوں کے باب میں دریافت کرتے ہیں، آپ کہہ دیجئے کہ وہ لوگوں کیلئے حج کیلئے اکہ شناختِ اوقات ہیں،

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "اس کو دیکھ کر روزہ رکھو اور اس کو دیکھ کر روزہ ختم کرو اگر بدلی آجائے (اور چاند نظر نہ آئے) تو تیس روزے پورے کرلو" [۲]

ایک دوسری حدیث میں آتا ہے "کہ جب تک چاند دیکھ نہ لو اس وقت تک روزہ نہ رکھو اور جب تک چاند دیکھ نہ لو روزے کا مہینہ ختم نہ سمجھو، اگر مطلع صاف نہ ہو تو اندازہ کرلو" [۳]

اس حکم کی سب سے بڑی سہولت اور فائدہ یہ ہے کہ دینا کے تمام مسلمان، خواہ وہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر رہتے ہوں یا دور دراز، نامعلوم مقامات پر، جنگلوں کے اندر بسنے والے ہوں یا دیہاتوں اور شہروں میں رہنے والے سب بلا کسی مشقت اور تکلف کے اور بلا علمِ ریاضی کئے آسانی کے ساتھ روزہ شروع کر سکتے ہیں اور ختم کر سکتے ہیں، اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ رمضان بدل بدل کر مختلف موسموں میں آتا ہے، یہ کبھی گرمی میں پڑتا ہے کبھی جاڑے میں، اسلئے مسلمانوں کو ہر سال جھلسا دینے والی گرمی اور جلا دینے والی لو یا صرف انتہائی سرد موسم اور کڑاکے کی سردی ہی سے واسطہ نہیں پڑتا، بلکہ موسموں کے تغیر اور آب و ہوا کی تبدیلی کا فائدہ بھی ان کو حاصل ہوتا ہے، وہ ان دونوں حالتوں سے مانوس اور دونوں چیزوں کے عادی ہوتے ہیں، اور ہر حالت میں صابر و شاکر، اجر و ثواب کے طالب، رحمت الٰہی کے امیدوار اور رضائے الٰہی کے آرزومند نظر آتے ہیں، [۴]

(باقی حاشیہ صفحہ ۲۸۴ کا) ریاضی اور مصنوعی تکلفات کا سہارا لینے کی مطلق ضرورت نہیں جیسا کہ بعض اسلامی ممالک میں ہونے لگا ہے، اس حدیث صحیح سے یہ مسئلہ بالکل صاف ہو جاتا ہے کہ "صوموا لرؤيته وافطروا لرؤيته" اسکو دیکھ کر روزہ رکھو اور اسکو دیکھ کر روزہ ختم کرو، اس مسئلہ میں مزید علمی مباحث ہیں جنکا یہ موقع نہیں

[۱] سورہ بقرہ۔ ۱۸۹ [۲] روایت حضرت ابن عباس رض (ترمذی) [۳] صحاح ستہ باستثناء بخاری شریف

[۴] اس باب میں مولانا سید سلیمان ندوی رح کی سیرۃ النبی ج ۵ سے استفادہ کیا گیا ہے،

جب کوئی ایسا شخص جو ایمان کی نعمت سے سرفراز اور اسلام کی دولت سے مالا مال ہے اور قدیم مذاہب میں روزہ کے آداب و احکام اور اس کی شکل و ہیئت، اور اس کے تاریخ و فلسفہ سے بھی واقف ہے نیز ان حالیہ مذہب کے روزہ داروں کی حالت بھی اس کی نظر کے سامنے ہے ان کے روزہ کا موازنہ اسلامی روزہ اور اس کے آداب و احکام کے ساتھ کرتا ہے تو اس کی زبان پر بے ساختہ خدا کی حمد و ثنا اور شکر کے زمزمے جاری ہو جاتے ہیں، اور اسکے روئیں روئیں سے یہ صدا آتی ہے،

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدَانَا لِھٰذَا وَمَا کُنَّا لِنَھْتَدِیَ لَوْلَآ اَنْ ھَدَانَا اللّٰہُ، لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ۔ [1]

(سازی) تعریف ہے اللہ کیلئے جس نے ہم کو اس (مقام) تک پہنچا دیا، اور ہم تو (کبھی بھی یہاں تک) نہ پہنچتے اگر اللہ نے ہم کو نہ پہنچا دیا ہوتا، واقعی ہمارے پروردگار کے پیمبر سچائی کے ساتھ آئے تھے،

---

[1] سورہ اعراف — ۴۳

حج

وَأَذِّن فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ ۝

(اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو، لوگ تمہارے پاس پیدل بھی آئیں گے اور دبلی اونٹنیوں پر بھی جو دور دراز راستوں سے پہنچی ہونگی۔ سورہ حج ۔ ۲۷)

حج

وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْکَ رِجَالًا وَّعَلٰی
کُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ ۝ لِّیَشْهَدُوْا
مَنَافِعَ لَهُمْ وَیَذْکُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِیْۤ اَیَّامٍ
مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰی مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِیْمَةِ الْاَنْعَامِ
فَکُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِیْرَ ۝
ثُمَّ لْیَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْیُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ
وَلْیَطَّوَّفُوْا بِالْبَیْتِ الْعَتِیْقِ ۝[1]

اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو۔ لوگ تمہارے پاس پیدل
بھی آئیں گے اور دبلی اونٹنیوں پر بھی جو دور دراز راستوں
سے پہنچی ہوں گی تاکہ اپنے فوائد کے لئے آموجود ہوں
اور تاکہ ایام معلوم میں اللہ کا نام لیں ان چوپایوں
پر جو اللہ نے ان کو عطا کئے ہیں۔ پس تم بھی اس میں سے
کھاؤ اور مصیبت زدہ محتاج کو بھی کھلاؤ، پھر لوگوں
کو چاہئے کہ اپنا میل کچیل دور کریں اور اپنے
واجبات کو پورا کریں اور چاہیے کہ (اس) قدیم گھر کا
طواف کریں۔

---

[1] سورہ حج آیت (۲۷، ۲۸، ۲۹)

اسلام توحید کا دین ہے اس میں وساطت و وکالت کی ضرورت نہیں

اسلام توحید خالص کا دین ہے، وہ خدا اور

بندہ کے درمیان کسی وساطت[1] اور "ایجنسی" کا قائل نہیں، وہ کسی ایسی محسوس اور مادی چیز کا روادار نہیں جس کو انسان اپنے فکر و خیال میں معبود کی طرح بسا کر اپنی ساری توجہ اور ہمت و قوت اس پر مرکوز کر دے اور اس کے دامن سے وابستہ ہو جائے، اس میں نہ تو واسطوں کی گنجائش ہے نہ مظاہر کی، نہ تصویروں کی نہ بتوں کی، نہ یہاں پادری اور پروہست کے قسم کا کوئی طبقہ پایا جاتا ہے، نہ کاہنوں اور مجاوروں کے طرز کی کوئی جماعت، اللہ تعالےٰ کا صاف ارشاد ہے،

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ۝[2]

اور جب آپ سے میرے بندے میرے باب میں دریافت کریں تو میں تو قریب ہی ہوں دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھ سے دعا کرتا ہے پس (لوگوں کو) چاہیے کہ میرے احکام قبول کریں اور مجھ پر ایمان لائیں، عجب نہیں کہ ہدایت پا جائیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہے،

فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ؕ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ؕ[3]

سو آپ خالص اعتقاد کر کے اللہ ہی کی عبادت کرتے رہیے، یاد رکھو عبادت خالص اللہ ہی کیلئے ہے اور جن لوگوں نے اس کے سوا اور شرکا تجویز کر رکھے ہیں (کہ) ہم تو

---

[1] سوائے انبیاء مرسلین کے، اس معنی میں کہ وہ تبلیغ و رسالت، اللہ تعالےٰ کی صفات اور اس کی پاکی کے بیان، اور صراط مستقیم کی طرف رہنمائی میں خدا اور اس کے بندوں کے درمیان ضروری واسطہ ہیں اور اسی پر ایمان کا انحصار ہے،

[2] سورہ بقرہ-۱۸۶ ۔ [3] سورہ زمر - ۲، ۳

. . . . ان کی پرستش بس اس لئے کرتے ہیں کہ یہ ہم کو خدا کا مقرب

. . . . بنا دیں۔

اس کے علاوہ، اسلام ایک ایسا دین ہے جو خیال کی پاکی، فکر کی بلندی، نیت و ارادہ کی صفائی و درستی غیر سے بے تعلقی، اور عمل میں اخلاص کے اس معیار اور فکر و عقیدہ کی اس سطح پر ہے جس سے بہتر معیار اور بلند سطح ناقابل تصور ہے، دنیا کے تمام مذاہب، فلسفے، دینی اور عقلی نظام اور پوری انسانیت مل کر بھی آج تک اس جیسی کوئی چیز پیش کرنے سے قاصر رہی اور اس معیار کے قریب بھی اسکی رسائی نہ ہو سکی، اللہ تعالےٰ نے قرآن مجید میں اپنا جو وصف بیان کیا ہے اس پر کوئی اضافہ نا ممکن ہے،

لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ج وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ[1] کوئی چیز اس کے مثل نہیں اور وہی (ہر بات کا) سننے والا ہے (ہر چیز کا) دیکھنے والا ہے۔

ایک مشہود کی ضرورت جو شوق و تعظیم کا مرکز بن سکے

لیکن فطرت انسانی، فطرت انسانی ہی ہے، ایک ایسی چیز کی جستجو اور آرزو ہر بشر کی سرشت میں داخل ہے جسکو وہ اپنی ان مادی آنکھوں سے دیکھ سکے اسکے ذریعہ اپنے جذبۂ شوق کی تسکین کر سکے اور قرب و وصال اور تعظیم و تسلیم کے اس شدید تقاضے کی آسودگی کا سامان کر سکے جو ہمیشہ سے اس کے خمیر میں ہے،

شعائر اللہ اور ان کی حکمت

اس کیلئے اللہ تعالےٰ نے کچھ ایسی ظاہری اور محسوس چیزیں مقرر کی ہیں جو اس کی ذات اقدس کے ساتھ کچھ خصوصیت رکھتی ہیں، اسی کی طرف منسوب ہیں، اسی کی کہلائی جاتی ہیں اور ان پر اس کی رحمت کی اس قدر تجلی اور عنایت کی ایسی نظر ہے کہ ان کو دیکھ کر ہی خدا یاد آتا ہے، اس کے علاوہ ان کے ساتھ بہت سے ایسے واقعات و معاملات اور اعمال واحوال وابستہ ہیں جو انسان کو اللہ تعالےٰ کی نشانیاں اور اس کے انعامات، اس کا دین توحید اور اسکے رسولوں کا جہاد اور صبر یاد دلاتے ہیں، ان چیزوں کا نام اس نے "شعائر اللہ"[2] رکھا، ان کی تعظیم اپنی تعظیم

---

[1] سورہ شوریٰ ۔ ۱۱ [2] اس پر نفیس بحث حجۃ اللہ البالغہ کی جلد اول میں "شعائر اللہ" کے عنوان سے ملاحظہ کی جائے۔

قرار دی اور ان میں کوتاہی اپنے حق میں کوتاہی کے مرادف بتایا، اور انسانوں کو اس کی اجازت بلکہ دعوت دی کہ اس کے ذریعہ وہ اپنی پوشیدہ و مستور محبت اور مشاہدہ و قرب کے فطری جذبہ کو تسکین دیں اور اپنی آسودگی کا سامان کریں،

ارشاد ہے،

ذٰلِكَ ۗ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ۝[1]

یہ بات ہو چکی اور جو کوئی (دین) خدا کی یادگاروں کا ادب رکھے گا سو یہ (ادب) دلوں کی پرہیزگاری میں سے ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے،

ذٰلِكَ ۗ وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۗ[2]

یہ بات ہو چکی اور جو کوئی بھی اللہ کے محترم احکام کا ادب کریگا سو یہ اس کے حق میں اس کے پروردگار کے پاس بہتر ہوگا

انسان کی فطرت میں عشق و محبت کا عنصر

انسان نہ صرف عقل محض ہے نہ مجبور محض، جو کسی قانون اور طاقت کے سامنے بے دست و پا ہو، نہ وہ ایسا مشینی پرزہ ہے جو کسی خاص قانون اور پہلے سے مقرر کردہ نقشہ کے مطابق ایک دائرہ میں گردش کرتا رہتا ہے، وہ عقل بھی ہے دل بھی، ایمان بھی ہے اور وجدان بھی، اطاعت بھی ہے اور محبت بھی، اور اسی میں اس کی عظمت و شرافت، اس کی طاقت و عبقریت، ذہانت و دقیقہ رسی، امتیاز و برتری اور ایثار و قربانی کا راز پوشیدہ ہے، اسی کی بدولت اس نے دشوار سے دشوار مسئلہ پر قابو پایا، محیر العقول کارنامے انجام دیئے، خارق عادت باتیں اس سے صادر ہوئیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسی کی وجہ سے وہ "امانت" اس کے حوالہ کی گئی جس سے آسمان زمین اور پہاڑ سب معذرت کر چکے تھے، اس شہپر کی مدد سے اس نے ان بلندیوں پر اپنا نشیمن بنایا جہاں مقرب

---

[1] سورہ حج ۳۲ [2] ایضاً - ۳۰

فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں، حیوانات، نباتات اور جمادات کا کیا ذکر ہے؟

اس انسان کا اپنے رب کے ساتھ رشتہ محض قانونی اور عقلی رشتہ نہیں، جس کا دائرہ صرف واجبات ادا کرنے، احکام کی تعمیل کرنے ٹیکس دینے اور اس کے بدلہ میں کچھ حقوق حاصل کرنے تک محدود ہو، یہ محبت اور پاکیزہ جذبات کا بھی رشتہ ہے، یہ ایسا رشتہ ہے جس پر ذوق و شوق اور عشق و قربانی، اور دل سوزی و بے قراری کا غلبہ ہونا چاہیئے، اور یہ عنصر اس رشتہ میں اس طرح جاری و ساری ہونا چاہیئے کہ کوئی عمل اس کے اثر سے خالی نہ رہنے پائے، دین اس سے منع نہیں کرتا بلکہ اس کی دعوت دیتا ہے، اس جذبہ کو غذا پہونچاتا اور اس کو مزید قوت بخشتا ہے،

قرآن مجید کا ارشاد ہے کہ

وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ[1] ط

اور جو ایمان والے ہیں وہ تو اللہ کی محبت سب سے قوی رکھتے ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے،

قُلْ اِنْ كَانَ آبَاۤؤُكُمْ وَاَبْنَاۤؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ اِقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ط وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ[2] ○

آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے لڑکے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے کنبہ اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس کے بگڑ جانے سے تم ڈر رہے ہو اور وہ گھر جنھیں تم پسند کرتے ہو، یہ سب تم کو اللہ اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ عزیز ہوئے تو منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ اپنا حکم بھیجدے اور اللہ تعالےٰ نافرمان لوگوں

---

[1] سورہ بقرہ - ۱۶۵ [2] سورہ توبہ - ۲۴

.... کو مقصود تک نہیں پہنچاتا۔

وہ اپنے رسولوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کی محبت وخلوص، اور ان کے شوق وفنائیت کو خاص طریقہ پر نمایاں کرتا ہے اور اس کی طرف خصوصیت سے متوجہ کرتا ہے، یحییٰ علیہ السلام کے متعلق آتا ہے کہ

وَآتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ۝ وَحَنَانًا مِّن لَّدُنَّا وَزَكَاةً ۖ وَكَانَ تَقِيًّا ۝[۵۱]

اور ہم نے انکو لڑکپن ہی میں سمجھ دیدی تھی۔ اور خاص اپنے پاس سے رقت قلب اور پاکیزگی۔ اور وہ بڑے پرہیزگار تھے۔

حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا پورا قصہ اسی محبت کی تصویر ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر یہ بیان کیا ہے کہ انھوں نے اپنے جگر کے ٹکڑے اور محبوب فرزند کی محبت کے گلے پر کس طرح چھری پھیری اور جب تک خدا نے ان کے صدق واخلاص اور صبر وقربانی کو دیکھ نہ لیا انھوں نے چھری گلے سے نہ ہٹائی،

يَا إِبْرَاهِيمُ ۝ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا ۚ إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝ إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ الْمُبِينُ ۝[۵۲]

اے ابراہیم تم نے خواب کو سچ کر دکھایا، ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں بے شک یہ تھا بھی کھلا ہوا امتحان۔

حضرت ابراہیمؑ کی تعریف میں آتا ہے،

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّاهٌ مُّنِيبٌ ۝[۵۳]

بیشک ابراہیم بڑے حلیم بڑے دردمند بڑے نرم دل تھے،

"صفات" ہی کے علم سے محبت پیدا ہوتی ہے اور اسی لئے قرآن مجید اس پر بہت زور دیتا ہے

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے صفات وافعال اور اس کے انعامات کا اتنی کثرت سے ذکر اور اسکے

---

[۵۱] سورہ مریم - ۱۲، ۱۳ [۵۲] سورہ صافات - ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، [۵۳] سورہ ہود - ۷۵

اعادہ وتکرار اور اس قدر شرح و بسط کے ساتھ بیان کا اصل راز یہی ہے، اس لئے کہ صفات ہی محبت وشوق کا سرچشمہ ہیں، اسی بات کو بعض ائمہ اسلام[1] "نفی مجمل اور اثبات مفصل" سے تعبیر کیا ہے یہی اثبات ہے (یعنی اللہ تعالےٰ کی صفات کریمہ کا بیان اور اس کے دلائل وشواہد کا ذکر) جس سے انسان کے ذوق وشوق کو غذا ملتی ہے اور محبت جوش مارنے لگتی ہے، اگر نفی رہبر عقل ہے تو اثبات رہبر دل[1]، اگر اللہ تعالےٰ کی یہ صفات عالیہ اور اسمار حسنیٰ ہمارے سامنے نہ ہوتے جن سے قرآن و حدیث بھرا ہوا ہے اور جن پر عشاق و محبین ہمیشہ اپنا سر دھنتے رہے، عارفین ان کے ترانے گاتے رہے، ذاکرین ان کی تسبیح میں مشغول رہے اور ان کا کلمہ پڑھتے رہے اور اہل معرفت وحقیقت زندگی بھر اس سمندر کے تہ نشین موتی چنتے رہے، تو یہ دین ایک چوبی یا آہنی نظام اور قانون کی طرح ہو جاتا جس کی دلوں میں کوئی جگہ نہ ہوتی، یہ نہ ان میں کوئی جذبہ اور گرمجوشی پیدا کر سکتا، نہ ان کے دلوں کو گرم اور آنکھوں کو نم کرنے کی صلاحیت رکھتا، نہ اس سے دعاءمیں انابت ورقت کی کیفیت پیدا ہوتی، نہ دل میں سرفروشی کا جوش، نہ سر میں اس کا سودا، اس کے بغیر خدا اور بندہ کا تعلق ایک مردہ اور محدود تعلق ہے جس میں نہ کوئی زندگی ہے نہ روح، نہ لچک، نہ وسعت، زندگی ایک ایسی خشک سخت اور بے جان چیز ہے جو لذت آرزو، متاع شوق اور جنون وشوریدگی کی دولت سے بالکل تہی دامن اور محروم ہے،

اگر انسانیت سے یہ دولت چھین لی جائے تو زندگی اور موت اور انسان اور جمادات میں آخر کیا فرق باقی رہ جائے گا؟

اس ساغر کی کیا قیمت جو کبھی چھلک نہ پائے

دل کی اس آنچ کو کچھ کم کرنے اور روح کی پیاس بجھانے کے لئے ایک مسلمان کو

---

[1] شیخ الاسلام ابن تیمیہ مراد ہیں [2] جہاں نفی ہے کہ خدا ایسا نہیں ہے، ایسا نہیں ہے، وہاں "لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ" پر اکتفا کیا گیا ہے لیکن جہاں اثبات ہے کہ خدا ایسا ہے ایسا ہے وہاں بڑی تفصیل اور تکرار واعادہ سے کام لیا گیا ہے ملاحظہ ہو سورہ حشر کا آخری رکوع،

اس کی ضرورت تھی کہ اس کے دل کا ساغر اور نگاہوں کا پیمانہ چھلک چھلک جائے، اس جام کی کیا قیمت جو بھرے لیکن چھلک نہ پائے، یہی نہیں اس کو اس کی بھی ضرورت تھی کہ یہ جام چھلک کر بہنے لگے اور دوری و مجبوری کی آگ میں جلے ہوئے دل کو سیراب کردے، وہ جام کیا جام ہے جو بھر کر چھلک تو جائے لیکن چھلک کر بہہ نہ پائے؟؟

حج بیت اللہ جذبۂ عشق کی تسکین کیلئے ہے

امام غزالیؒ نے اپنی نادرۂ روزگار ذہانت اور شریعت کے گہرے مطالعہ سے اس نکتہ کو خوب سمجھا تھا کہ محبت وشوق ایک زندہ اور سلیم الطبع انسان کی حقیقی ضرورت ہے، وہ اس کی تسکین کیلئے ہمیشہ طلب وجستجو میں رہتا ہے، بیت اللہ اور اس کے ساتھ جتنے شعائر اللہ اور حج کے مناسک ومقامات ہیں وہ اسکی اس سچی اور حقیقی ضرورت کو اچھی طرح پورا کرسکتے ہیں اور ان سے اس کو پوری تسکین اور تسلی حاصل ہوسکتی ہے اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے،

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ۝ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰي مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ۝ ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ۝

اور (وہ وقت یاد دلایئے) جب ہم نے ابراہیم کو بیت اللہ کی جگہ بتادی (اور حکم دیا) کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا اور میرے گھر کو پاک رکھنا طواف کرنے والوں اور قیام ورکوع وسجود کرنے والوں کے لئے۔ اور لوگوں میں حج کا اعلان کردو۔ لوگ تمہارے پاس پیدل بھی آئیں گے اور دبلی اونٹنیوں پر بھی جو دور دراز راستوں سے پہنچی ہوں گی، تاکہ اپنے فوائد کے لئے آموجود ہوں اور تاکہ ایام معلوم میں اللہ کا نام لیں۔ ان چوپایوں پر جو اللہ نے ان کو عطا کئے ہیں۔ بس تم بھی اس میں سے

سورہ حج ۲۶-۲۷-۲۸-۲۹

. . . . کھاؤ اور مصیبت زدہ محتاج کو بھی کھلاؤ۔ پھر لوگوں کو

. . . . چاہیئے کہ اپنا میل کچیل دور کریں اور اپنے واجبات کو

. . . . پورا کریں اور چاہیئے کہ (اس) قدیم گھر کا طواف کریں،

امام غزالیؒ لکھتے ہیں،

"اگر اللہ تعالٰی سے لقا کا شوق ہے تو مسلمان اس کے وسائل و اسباب اختیار کرنے پر لامحالہ مجبور ہوگا، عاشق اور محب ہر اس چیز کا مشتاق ہوتا ہے جس کی اضافت اس کے محبوب کی طرف ہو کعبہ کی نسبت اللہ عز وجل کی طرف ہے اس لئے مسلمان کو قدرتی طور پر اس کا سب سے زیادہ مشتاق ہونا چاہیئے علاوہ اس اجر و ثواب کی طلب و احتیاج کے جس کا وعدہ بھی اس سے کیا گیا ہے"[1]

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب بھی اسی نکتہ کو حج کی بنیادی حکمت بتاتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"کبھی کبھی انسان کو اپنے رب کی طرف غایت درجہ اشتیاق ہوتا ہے اور محبت جوش مارتی ہے اور وہ اس شوق کی تسکین کیلئے اپنے چاروں طرف نظر دوڑاتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سامان صرف حج ہے"[2]

یہ ہو سکتا تھا کہ وہ اس شوق و محبت اور ان جذبات و کیفیات کی تسکین ان نمازوں کے ذریعہ کر لیتا جو وہ دن میں کئی بار پڑھتا ہے وہ نماز میں اپنے پیمانۂ دل کو چھلکنے دیتا اور محبت و عشق کی اس تپش و بے قراری اور دل سوزی پر اپنے آنسوؤں کے کچھ چھینٹے ڈال لیتا، لیکن اشک کے یہ چند قطرے تھوڑی دیر کیلئے اس کے دل کو گرم اور آنکھوں کو نم ضرور کر سکتے ہیں، اس کی تشنگی کو دور نہیں کر سکتے، ان میں محبت کی اس تیز آنچ کو کم کرنے کی طاقت نہیں جو بعض وقت اس کے سینہ میں بھٹی کی طرح سلگتی ہے اور اس کو کسی

---

[1] احیاء العلوم ج ۱ ص ۲۴۴ [2] حجۃ اللہ البالغہ۔ ج ۱ ص ۵۹

پہلو چین نہیں لینے دیتی،

مادیت کے قفس زریں سے کائنات کی بیکراں وسعتوں میں

اسی طرح اس کو روح کی پیاس بجھانے، سوزشِ دل کو آرام پہونچانے، نفس کی سرکشی کو لگام لگانے، اور اپنی مرغوبات و عادات کی "وثنیت" کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے میں رمضان سے بھی مدد مل سکتی تھی، اس لئے کہ اس وقت خلوئے معدہ اور احتیاط و پرہیز کی وجہ سے اسکی روح کو غذا ملتی ہے اور صفائی قلب نصیب ہوتی ہے، لیکن یہ بھی چند گنی چنی گھڑیاں ہیں جو اکثر ایسی چیزوں سے گھری رہتی ہیں جن سے روزہ کا اثر برابر کمزور ہوتا رہتا ہے، اس کے چاروں طرف نفیس و مرغن کھانوں، انواع واقسام کے ذائقوں، اور راحت طلبی اور شکم پری کا ایسا ماحول بن جاتا ہے جو اس کو یکسو نہیں ہونے دیتا اسکا معاشرہ (جو انکار و بغاوت اور غفلت و معصیت کا علمبردار بن چکا ہے) چاروں طرف سے اس کو اسطرح گھیرے میں رکھتا ہے جس طرح کوئی چھوٹا سا جزیرہ متلاطم و غضبناک سمندر میں گھرا ہوا ہو،

ان تمام باتوں کی وجہ سے اس کو ایک ایسی جرأت مندانہ بلکہ رندانہ وقلندرانہ جست کی ضرورت تھی جو اس کے طوق وسلاسل کو پاش پاش کرکے رکھ دے، اور اس کو ایک ہی چھلانگ میں اپنے قدیم، تنگ و تاریک، اور شکستہ و بوسیدہ قید خانہ سے آزاد کردے، اور اس قدیم وفرسودہ، پابند و اسیر، پابہ زنجیر مصنوعی اور مشینی، مادی اور حسابی دنیا سے نکال کر ایک بالکل نو دریافت، آزاد و بے کراں، اور وسیع و لامحدود عالم میں پہونچا دے جہاں محبت کی فرماں روائی اور شوق کی حکمرانی ہے، یہاں پہونچ کر وہ ہر قسم کی غلامی سے آزاد اور ہر نوع کی وثنیت و بت پرستی سے پاک ہو جاتا ہے، رنگ ونسل اور ملک و وطن کی مصنوعی حدبندیاں اور رقبہ کی پیمائشیں اس کی نظر میں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں، وہ وحدت الوہیت، وحدت رزاقیت، وحدت انسانیت، وحدت عقیدہ، وحدت دعوت اور وحدت مقصد کا قائل ہوتا ہے اور اپنے دوسرے بھائیوں کے ساتھ ایک آواز ہو کر خدا کی حمد کا ترانہ گاتا ہے اور یہ نعرہ لگاتا ہے،

لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ ، لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ ، اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ ، لَا شَرِيْكَ لَكَ ،

اے میرے اللہ میں حاضر ہوں، حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں، میں حاضر ہوں، ساری تعریفیں اور نعمتیں تیرے ہی لئے زیبا ہیں، اور حکومت بادشاہت بھی تیرا ہی حق ہے، تیرا کوئی شریک نہیں،

مسلمان کو ان نمازوں کے بعد بھی جن کو وہ روزانہ پابندی کے ساتھ پڑھتا ہے، اس رمضان کے بعد بھی جس میں وہ ہر سال روزے رکھتا ہے، اور اس زکوٰۃ کے بعد بھی جو مالک نصاب ہونے اور سال گزرنے پر وہ ادا کرتا ہے، ایک ایسی فصل یا ایسے موسم کی ضرورت تھی جس کو ہم عشق و محبت کی فصل اور جنون و شوریدگی کا موسم بہار کہہ سکتے ہیں، اور اہلِ جنوں، اور اہلِ وفا کی قبلہ گاہ سے تعبیر کر سکتے ہیں،

عقل و مادیت کے پرستاروں کے خلاف نعرۂ بغاوت

اس کو کبھی کبھی اپنی سنجیدہ و متین اور جامد عقل کے خلاف بھی بغاوت کی ضرورت پیش آتی ہے، اور اس میں کوئی حرج بھی نہیں، اس لئے کہ جو زندگی بغاوت اور انقلاب کے بغیر گزر جائے وہ کیا زندگی ہے، اس کو اس کی ضرورت ہے کہ عادات و اطوار، پسند و ناپسند، خودساختہ قوانین، مصنوعی تہذیب، ظاہری تکلفات، رسمی وضعداریوں اور اس سخت و بے رحم سماج کے بندھے ٹکے نظام اور فرضی بندھنوں کو توڑ کر آزاد ہو جائے، زمام کار اس عقل سے لے کر جو عرصہ سے اس پر قابض ہے تھوڑی دیر کیلئے جذبۂ دل اور رہوارِ شوق کے حوالہ کر دے کبھی اس طرح بادیہ پیمائی و صحرانوردی کرے جس طرح عشاق و محبین اپنے محبوب کے لئے کرتے ہیں، کبھی اس شوریدگی و آشفتہ سری کا مظاہرہ کرے جو اہلِ جنوں و اہلِ وفا کا شعار ہے، اس لئے کہ جس کو سوسائٹی، سماج اور رسم و رواج نے اپنا غلام بنا لیا ہو اس کو آزاد کون کہہ سکتا ہے؟ جو اپنی عادات و خواہشات اور مرغوبات کا اسیر ہو اس کو موحد کیسے کہا جا سکتا ہے؟ اسی طرح اس شخص کو مطیع و فرماں بردار اور وفاشعار کیسے کہا جا سکتا ہے جو ہمیشہ اپنی عقل پر اعتماد کرتا ہو اور جب تک اپنی محدود اور مخلوق عقل کے پیمانہ سے کسی چیز کو

ناپ نہ لے اور اس کے محسوس اور مادی فوائد اس کے علم میں نہ آجائیں اس میں کسی کام کا ولولہ اور اطاعت کا جذبہ ہی پیدا نہ ہوتا ہو، یہ حج اپنی مخصوص شکل کے ساتھ عقل اور مادیت کے پرستاروں اور نظم و ڈسپلن کے اسیروں کے خود ساختہ قوانین اور زندگی کے اس "روٹین" کے بالکل منافی ہے جس کے وہ دلدادہ ہیں، اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان کے اندر ایمان بالغیب اور حکم کو محض حکم سمجھ کر بے چون وچرا بجالانے کا جذبہ اور ملکہ پیدا ہو، اور اس عقل کو تھوڑی دیر کے لئے اپنے اس منصب سے ہٹا دیا جائے جو ہر چیز کو منطق و فلسفہ، بحث و مناظرہ اور دلیل و حجت کے پیمانہ سے ناپتی ہے، اور ہر وقت اور ہر جگہ منطق و استدلال سے کام لیتی ہے،

امام غزالیؒ نے حج کی حقیقت اور روح کو (جس کو ایمان بالغیب اور مطلق امتثال امر سے تعبیر کیا جا سکتا ہے) بڑے عجیب اور بلیغ انداز میں بیان کیا ہے اور اپنے موئے قلم سے اس کی دلکش اور دل آویز تصویر کھینچ دی ہے، انھوں نے دین کے اس اہم رکن کے قلب و جگر میں اتر کر اس کی بہت اچھی تشریح کی ہے اور اس کے مغز اور جوہر کو ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے جو بہت سے قدیم و جدید اہل فکر کی نظر سے رہ گیا تھا، وہ لکھتے ہیں:۔

"اس (بیت اللہ کی) وضع اور شکل ایک شاہی دربار یا شاہی ایوان کی طرح ہے جہاں پر عشاق و اہلِ فراق ہر دشوار گزار اور دور دراز مقام سے افتاں و خیزاں، آشفتہ سر اور پراگندہ مُو ہو کر پہونچتے ہیں، رب البیت کے سامنے سرِ تسلیم خم کئے ہوئے، اپنی حقارت کا احساس لئے ہوئے اس کی عزت و جلال کے سامنے اپنے کو فراموش کئے ہوئے، اس علم و اعتراف کیساتھ کہ وہ اس سے پاک اور بلند و برتر ہے کہ کوئی گھر اور چہار دیواری اس کو گھیر سکے یا کوئی شہر اس کا احاطہ کر سکے تاکہ ان کی عبودیت و رقت اپنی انتہا کو پہونچ جائے اور اطاعت و انقیاد اور تسلیم و رضا میں کوئی کسر باقی نہ رہ جائے،

اسی لئے ان کو ایسے اعمال اور نقل و حرکت کا پابند کیا گیا ہے جن سے نہ نفس انسانی

کو کوئی لگاؤ ہے نہ عقل کی وہاں تک رسائی ہے، مثلاً رمی جمار (شیطان کو ایک خاص جگہ پہونچکر پتھر مارنا) صفا و مروہ کے درمیان بار بار دوڑنا، اس قسم کے اعمال کمالِ عبودیت اور غایت درجہ فنائیت کو ظاہر کرتے ہیں، زکوٰۃ ایک قسم کی ہمدردی و غمخواری ہے، اس کا مفہوم بھی آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے اور عقل بھی اس کو قبول کرتی ہے، روزہ نفس کشی اور ان خواہشات بشری کی سرکوبی کیلئے ہے جن کو شیطان اپنی مقصد براری کیلئے استعمال کرتا ہے اور اس میں دوسرے مشاغل کم کرکے عبادت میں انہماک و اشتغال کا پہلو واضح ہے، نماز میں رکوع و سجود اور ان افعال اور حرکات کے ذریعہ جن سے تواضع کی روح پیدا ہوتی ہے خدا کے سامنے اس کی کبریائی اور اپنے عجز کا اظہار ہے اور اس سے دلوں کو خاص لگاؤ محسوس ہوتا ہے، لیکن رمی جمار اور سعی اور اس طرح کے دوسرے اعمال ایسے ہیں جن سے دل کو کوئی حظ اور سرور حاصل نہیں ہوتا، طبیعت بشری بھی ان کی طرف مائل نہیں ہوتی اور عقل بھی ان کے معنی و مفہوم سے قاصر رہتی ہے، چنانچہ یہ عمل یا اقدام صرف اطاعت ہی کے جذبہ سے کیا جاتا ہے، یہ سمجھ کر کہ یہ خدا کا ایک حکم ہے جو بہر صورت واجب الاتباع ہے، اس سے مقصود عقل کو اس کے اختیارات سے محروم کر دینا اور نفس و طبیعت کو ان چیزوں سے دور رکھنا ہے جن سے اس کو لگاؤ اور انس پیدا ہو سکتا ہو، اس لئے کہ جب کوئی چیز عقل سے اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے تو طبیعت اسکی طرف خود بخود چلنے لگتی ہے، اور طبیعت کا یہ رجحان خود اس عمل کا باعث اور محرک بن جاتا ہے اور اس میں کمال عبدیت اور مجرد اطاعت کی شان باقی نہیں رہتی، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حج کے موقع پر خصوصیت سے یہ لفظ کہے،

لبیک بحجۃ حقاً تعبداً ورقاً — لبیک حج بر سچے دل کے ساتھ غلامی اور عبدیت کے جذبہ کے ساتھ۔

حج کے علاوہ یہ الفاظ آپ نے کسی اور عبادت حتیٰ کہ نماز کے لئے بھی استعمال نہیں فرمائے،
چونکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت نے مخلوق کی نجات کا دار و مدار اس پر رکھا ہے کہ ان کے
اعمال اطاعت و انقیاد اور تسلیم و عبودیت کے طریقہ اور سنت پر ہوں، اس لئے وہ اعمال
وعبادات (جن کے اسرار و معانی عقل انسانی کی دسترس سے باہر ہیں) تزکیہ نفوس اور رجحان
وطبیعت، اخلاق و فضائل سے ہٹا کر عبودیت کاملہ سے روشناس کرنے میں زیادہ موثر ہیں،
اس بات کی تہ تک پہونچ جانے کے بعد یہ بات ہماری سمجھ میں خوب آجائے گی کہ ان افعال
اور حرکات و سکنات پر تعجب دراصل ان عبادتوں کے مخصوص اسرار و مقاصد کو نہ سمجھنے کا
نتیجہ ہے، اور حج کی اصل بنیاد اور حقیقت سمجھنے کے لئے ان شاء اللہ اتنا ہی کافی ہے"[1]
رمی جمار کے متعلق کہتے ہیں کہ اس کا مدار ہی اطاعتِ محض اور مجرد امتثال امر پر ہے،
لکھتے ہیں:-

"اس سے مقصود مجرد امتثال امر ہے تاکہ مکمل عبودیت کا مظاہرہ ہو سکے عقل اور نفس کا
اس میں کوئی حصہ نہیں ہے، مزید براں اس سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام سے تشبہ ہے،
اس لئے کہ ابلیس ملعون اسی جگہ ان کے حج میں شبہ پیدا کرنے یا کسی معصیت میں مبتلا کرنے آیا
تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا کہ اس کو کنکریاں ماریں تاکہ وہ ان کے پاس سے دفع ہو جائے
اور اس کو ان سے کوئی توقع ہی باقی نہ رہ جائے، اگر کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ ان کے سامنے
شیطان حقیقت میں آگیا تھا اس لئے انھوں نے اس کو مارا، میرے سامنے تو شیطان نہیں ہے کہ
میں اس کو ماروں تو اس کو سمجھنا چاہیئے کہ یہ خیال بھی شیطان ہی کا پیدا کردہ ہے اور وہی
ہے جس نے یہ خیال تمھارے دل میں ڈالا ہے تاکہ شیطان کو ذلیل و خوار کرنے کا جو عزم اور

---

[1] احیاء العلوم ج ۱ صفحہ ۲۴۰

ارادہ تمہارے اندر تھا وہ کمزور پڑ جائے،

تم کو جاننا چاہئے کہ ظاہر میں تم جمرۂ عقبہ پر کنکریاں مارتے ہو لیکن حقیقت میں وہ کنکریاں شیطان کے منہ پر پڑتی ہیں اور اس کی کمر توڑ دیتی ہیں، اس لئے کہ اس کی تذلیل و توہین سب سے زیادہ اس تعمیل حکم سے ہوتی ہے جو اللہ تعالٰے کی تعظیم اور اطاعتِ محض کے جذبہ کے ساتھ ہو نفس یا عقل کا اس میں کوئی حصہ نہ ہو"[1]

قربانی کے سلسلہ میں کہتے ہیں:۔

"جاننا چاہئے کہ یہ امتثال امر (یعنی قربانی) تقرب الی اللہ کا ذریعہ ہے چنانچہ یہ حکم بھی فوراً بجالانا چاہئے اور یہ امید اللہ تعالٰے کی ذات سے رکھنی چاہئے کہ اس کے ایک ایک جز کے بدلے میں تمہارا ایک ایک جز آگ سے محفوظ رکھے گا، حدیث میں اسی طرح آیا ہے، قربانی جتنی بڑی ہوگی اور اس کے اجزا جتنے زیادہ ہوں گے آگ سے فدیئے بھی اسی قدر زیادہ ہو سکیں گے"[2]

حاجی حکم کا بندہ ہے اور اشاروں کا غلام ہے

حج اپنے سارے ارکان واعمال اور مناسک وعبادات کے ساتھ اطاعت محض، مجرد امتثال امر، بے چون وچرا حکم بجالانے اور ہر مطالبہ کے آگے سر جھکا دینے کا نام ہے، حاجی کبھی مکہ میں نظر آتا ہے، کبھی منیٰ میں، کبھی عرفات میں، کبھی مزدلفہ میں، کبھی ٹھہرتا ہے، کبھی سفر کرتا ہے، کبھی خیمہ گاڑتا ہے، کبھی اکھاڑتا ہے، وہ حکم کا بندہ اور اور چشم وابرو کا پابند ہے، اس کا خود نہ کوئی ارادہ ہوتا ہے نہ فیصلہ، نہ انتخاب کی آزادی، وہ منیٰ میں اطمینان سے سانس بھی لینے نہیں پاتا کہ اس کو عرفات جانے کا حکم ملتا ہے، لیکن مزدلفہ میں رکنے کی اجازت نہیں ہوتی، عرفات پہونچ کر وہ دن بھر دعا وعبادت میں مشغول رہتا ہے، غروب آفتاب

---

[1] احیاء العلوم ج ا ص ۲۴۳ [2] ایضاً

کے بعد اس کو اس کا تقاضا ہوتا ہے کہ ذرا سستا لے اور رات کو یہیں رہ جائے لیکن اس کے بجائے اسکو مزدلفہ جانے کا حکم ملتا ہے، وہ زندگی بھر نماز کا پابند رہا تھا لیکن عرفہ میں اس کو اس کا حکم ہوتا ہے کہ مغرب کی نماز ترک کردے اس لئے کہ وہ اللہ کا بندہ ہے، نماز یا اپنی عادت کا بندہ نہیں، وہ یہ نماز مزدلفہ پہونچنے کے بعد عشا کے ساتھ ملا کر پڑھتا ہے، مزدلفہ میں اس کا خوب جی لگتا ہے اور سوچتا ہے کہ یہاں جی بھر کر ٹھہرے مگر اس بات کی اجازت بھی اس کو نہیں ملتی اور اس کو منیٰ کی طرف رُخ کرنے کو حکم ہوتا ہے،

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور سب انبیاء کرام اور ان کے بعد تمام عشاق و اہلِ محبت، اہلِ دل اور اہلِ طلب کی زندگی کا طرز یہی تھا، کبھی سفر کبھی قیام، کبھی وصل کبھی ہجر، نہ عادت کی غلامی نہ ذوق کی اسیری، نہ خواہش کی تابعداری، نہ شہوت کے سامنے سپر اندازی،

رحمتِ خداوندی کو متوجہ کرنے میں زمان و مکان کا حصہ

اس کیلئے سب سے موزوں اور مناسب جگہ یہی تھی جہاں اہلِ محبت کے پیشوا مخلصین کے امام اور اپنے زمانہ میں اللہ کے سب سے زیادہ محب اور محبوب اور مقرب بندہ نے اخلاص و محبت، وفاداری و جاں نثاری، اور ایثار و قربانی کی ایسی دلآویز اور حیرت انگیز کہانی پیش کی جو پاکیزہ محبت، بےغرض وفاداری اور صدق و اخلاص کی تاریخ میں سب سے زیادہ تابناک اور دل فریب ہے، ان کے بعد جتنے انبیاء کرام، موحد و مخلص اور عاشق صادق پیدا ہوئے وہ سب اپنے اپنے دور میں انہی کے نقش قدم پر چلتے رہے، ان کی ایک ایک ادا کی نقل کرتے رہے اور صدق و وفا کی وہی کہانی دہراتے رہے، انھوں نے اسی طرح بیت اللہ کا طواف کیا، صفا و مروہ کے درمیان سعی کی، عرفات میں ٹھیرے، مزدلفہ میں رات گزاری جمرات میں کنکریاں ماریں اور منیٰ میں قربانی کی،

اس طرح زمان و مکان میں کہانی کی ان فصلوں میں جو بار بار دہرائی جا رہی ہیں، ان اعمال میں جن میں ان کی تقلید جاری ہے، محبت کے ان جاں نواز اور روح پرور جھونکوں میں جن سے حجاج از سر نو تازگی

حاصل کرتے ہیں، اس ذوق وشوق میں جس میں وہ ہمہ وقت ڈوبے رہتے ہیں، امت کے ان مختلف طبقوں اور جماعتوں کی صحبت میں جن کی رفاقت ان کو میسر آتی ہے، اس دینی اور روحانی اجتماع میں جس کی نظیر روئے زمین پر کہیں اور نہیں ملتی اور ذکر ودعا، تلبیہ واستغفار کے دلآویز زمزموں میں جو ہر وقت اس فضا میں گونجتے رہتے ہیں اور دل میں بس جاتے ہیں، وہ چیز اب بھی موجود ہے جو مردہ دلوں کو حیاتِ نو بخشتی ہے، پست ہمتوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے، مضمحل وافسردہ نفوس کو نئی زندگی عطا کرتی ہے اور عشق کی اس دبی ہوئی چنگاری کو پھر سے بھڑکا دیتی اور چھیڑ دیتی ہے، جو بجھنے کے قریب تھی یا بجھ چکی تھی، رحمت الٰہی کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے اور اس میں جوش پیدا کرتی ہے،

مسلمانوں کے اس عظیم الشان اجتماع اور اہلِ ایمان کی دعاؤں میں رحمت الٰہی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی جو خاصیت ہے اور اس کی بدولت سخت سے سخت دل والوں کو زندگی وحرکت اور ذوق وشوق کی جو کیفیت حاصل ہوتی ہے اس کی طرف بہت سے اہلِ نظر واہلِ دل علماء اسلام نے متوجہ کیا ہے،

امام غزالیؒ لکھتے ہیں:۔

"جب ہمتیں کسی خاص نقطہ پر مرکوز ہو جاتی ہیں، دل تضرع وبیتابی میں مشغول ہوتے ہیں، ہاتھ خدا کے سامنے پھیلے ہوتے ہیں، نگاہیں آسمان کی طرف اٹھی ہوتی ہیں اور سب ایک جان اور ایک دل ہو کر پوری توجہ کے ساتھ رحمت الٰہی کے امیدوار ہوتے ہیں تو اس وقت ایسا نہ سمجھنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ ان کو مایوس کر دے گا ان کی کوششوں کو ضائع فرما دے گا اور اپنی رحمت سے ان کو محروم وبے نصیب رکھے گا۔"[1]

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے حج پر بحث کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ:۔

"حج کی حقیقت یہ ہے کہ صالحین کی ایک بڑی جماعت ایک خاص زمانہ میں جمع ہو اور

---

[1] احیاء العلوم ج ۱ صـ ۲۴۳

ان لوگوں کا حال یاد کرے جن پر اللہ تعالےٰ کا انعام ہوا، مثلاً انبیار و صدیقین، شہدا و صالحین، اور اس جگہ جمع ہو جہاں اللہ تعالےٰ کی نشانیاں موجود ہیں، اور جہاں ائمہ دین اور صالحین امت شعائر اللہ کی تعظیم میں سرشار ہو کر گڑگڑاتے، روتے ہوئے خیر و بخشش کے طالب اور کفارۂ سیئات کے امیدوار بن کر آئے ہیں، اس لئے کہ جب ہمتیں اس کیفیت کے ساتھ جمع ہوتی ہیں تو رحمت و مغفرت کے نزول میں تخلف نہیں ہوتا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ شیطان اس قدر حقیر، راندۂ درگاہ، ذلیل و خوار اور غصہ سے جلا ہوا کسی دن نہیں ہوتا جتنا عرفہ کے دن[1]"

ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"یہ بات بھی طہارت نفس میں داخل ہے کہ آدمی ان جگہوں میں اترے اور قیام کرے جہاں صالحین اور اولیاء اللہ ہمیشہ سے دل کی تعظیم اور ارادت کے ساتھ اترتے آئے ہیں اور اس کو خدا کے نام سے معمور کرتے رہے ہیں، یہ اہل خیر کے حق میں ملائکہ اور ملاء اعلیٰ کو متوجہ کرنے کا باعث ہوگا اور جب وہ وہاں اترے گا تو ان کا رنگ اس پر بھی چڑھ جائے گا[2]"

ملت حنیفی کے امام حضرت ابراہیم علیہ السلام سے تجدید تعلق، حج کے سب سے اہم مقاصد میں ہے

حج کا ایک بڑا اور بنیادی مقصد یہ ہے کہ ملت حنیفی کے امام اور موسس حضرت ابراہیم علیہ السلام سے تجدید تعلق کیا جائے، ان کی میراث کی حفاظت کی جائے، ان کی زندگی اپنے سامنے رکھ کر اپنی زندگی کا موازنہ کیا جائے، مسلمانوں کی حالت کا جائزہ لیا جائے اور ان کی زندگی میں جو غلطیاں، فساد اور تحریف نظر آئے اس کو دور کیا جائے اور اس کے اصل سرچشمہ کی طرف رجوع کیا جائے، اس لئے کہ حج ایک قسم کا سالانہ اجتماع ہے جسکے

---

[1] حجۃ اللہ ج ا ص ۵۹ [2] ایضاً ج ا ص ۵۹

ذریعہ مسلمان اپنے اعمال اور اپنی زندگی کا احتساب و تجزیہ کر سکتے ہیں اور ان قوموں اور سوسائٹیوں کے اثرات سے چھٹکارا پا سکتے ہیں جن کے بیچ میں وہ رہتے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں :-

"(حج کے مقاصد میں) اس میراث کی حفاظت بھی ہے جو سیدنا ابراہیمؑ اور سیدنا اسمٰعیلؑ نے ہمارے لئے چھوڑی ہے اس لئے کہ یہ دونوں ملت حنیفی کے امام اور عرب میں اس کے مؤسّس اور بانی کہے جا سکتے ہیں، حضورؐ کی بعثت بھی اسی لئے ہوئی تھی کہ ملت حنیفی آپ کے ذریعہ دنیا میں غالب آئے اور اس کا پرچم بلند ہو،

اللہ تعالے کا ارشاد ہے" مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ"[1] (ملت ہے تمہارے باپ براہیم کی) اس لئے یہ ضروری ہے کہ اس ملت کے امام سے جو چیزیں ہم کو ورثہ میں ملی ہیں مثلاً خصائل فطرت[2] اور مناسک حج اس کی ہم حفاظت کریں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

"قِفُوْا عَلٰى مَشَاعِرِكُمْ فَاِنَّكُمْ عَلٰى اِرْثٍ مِنْ اِرْثِ اَبِيْكُمْ"، — اپنے مشاعر (مقامات حج) پر ٹھیرو اسلئے کہ تم اپنے باپ کی ایک وراثت کے وارث ہو"[3]

حضرت ابراہیمؑ کے قصہ کی حج میں تمثیل

حج کی سب سے نمایاں اور دلکش تصویر اور وہ روح جو اس کے تمام اعمال و مناسک میں جاری وساری

---

[1] سورہ حج ۷۸ ۔ [2] ان خصائل فطرت سے مراد یہ دس چیزیں ہیں :- مونچھیں ترشوانا، ڈاڑھی بڑھانا، سواک کرنا، پانی سے ناک صاف کرنا، ناخن کاٹنا، انگلی کے پوروں کا دھونا، بغل کے بال اکھاڑنا، موئے زیر ناف صاف کرنا، پانی سے استنجا کرنا، ختنہ کرنا، ابوداؤد بروایت حضرت عائشہؓ (دسویں چیز کے بارے میں راوی کہتے ہیں میں بھول گیا شاید وہ کلّی ہے۔ لیکن قاضی عیاضؒ اور امام نوویؒ نے دسویں چیز ختنہ بتائی ہے)

[3] حجۃ اللہ البالغہ ، ج ۱ صـ۲۲

نظر آتی ہے وہ عشق و شوریدگی، مرمٹنے اور قربان ہو جانے کا جذبہ ہے، اس میں جسم و عقل کی لگام دل اور جذبات کے حوالہ کر دی جاتی ہے اور عشاق و محبین اور ان کے امام و پیشوا ابراہیم خلیل اللہ کی ہر ہر ادا کی نقل کی جاتی ہے کبھی بیت اللہ کے طواف کا شوق ہوتا ہے، کبھی حجر اسود کا بوسہ، کبھی صفا و مروہ میں ماں کی مامتا اور جوش اضطراب کی اس طرح نقل کی جاتی ہے کہ جہاں وہ دوڑی تھیں اس جگہ دوڑا جاتا ہے اور جہاں وقار و متانت کے ساتھ چلی تھیں وہاں اسی طرح چلا جاتا ہے، پھر یوم الترویہ میں منیٰ روانگی کا حکم ہے، اس کے بعد عرفات کے میدان اور پہاڑی کے دامن میں ٹھیرنا اور دل کھول کر اور رو رو کر دعا و مناجات کی ہدایت ہے، رات مزدلفہ میں گزاری جاتی ہے اور اس کے بعد منیٰ واپسی ہوتی ہے اور یہ سب حضرات ابراہیمؑ اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی تقلید و پیروی میں کیا جاتا ہے،

لیکن اس عشق و محبت اور تقلید و نقل کی سب سے واضح تصویر رمی جمرات ہے جو صرف ایک ایسے فعل کی تقلید ہے جو حضرت ابراہیمؑ سے صادر ہوا تھا، عشاق و محبین کی تقلید ایک متعدی طاقت ہے، اس کی نقل کرنے والے میں بھی وہی جذبات محبت منتقل ہو جاتے ہیں اور گویا بجلی کے سوئچ یا پاور ہاؤس سے اس کا تعلق ہو جاتا ہے جس سے تمام تاروں میں بجلی دوڑ جاتی ہے اور پورے پورے شہر کو جگمگا دیتی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و عنایت کو متوجہ کرنے کا بہترین اور بہت موثر ذریعہ ہے جس نے اس محبت کا مزہ چکھا ہے اس کیلئے اس منظر سے زیادہ پرکیف اور دلفریب منظر کوئی اور نہیں ہو سکتا، جب وفا شعار اور جاں نثار عشاق و محبین اس کہانی کو دہرانے اور ان واقعات کی نقل کیلئے اس سرزمین میں جمع ہوتے ہیں جو ہزاروں سال پیشتر پیش آئے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو بقاء دوام اور قبول عام عطا فرمایا اور تمام مخلصین و محبین سے اس کا مطالبہ کیا کہ وہ شیطان کو ذلیل کرنے، ایمان کو مضبوط کرنے، اور ابراہیم خلیل الرحمٰن کی اقتدا و پیروی کے جذبہ کیساتھ یہ ساری کہانی اسی طرح دہرایا کریں؛

قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ کا قصہ و رہلد امین سے اس کا تعلق

حضرت ابراہیمؑ شہر کے ایک بڑے مجاور

یا پروہت کے گھر میں پیدا ہوئے جس کا پیشہ بت گری و صنم تراشی تھا اور جو شہر کے سب سے بڑے معبد میں مجاور تھا اور اپنے عقیدہ اور پیشہ دونوں میں اس معبد کے ساتھ منسلک، یہ بڑی دشوار صورت حال تھی اس لئے کہ جب عقیدہ پیشہ کے ساتھ اور دینی جذبہ مالی منفعت کے ساتھ مل جاتا ہے اور دونوں ساتھ چلنے لگتے ہیں تو اس وقت پیچیدگی اور دشواری پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے، اس سخت اور تاریک ماحول میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جو ایمان و محبت کو ابھار سکے اور اس مشرکانہ اور بت پرستانہ جہالت و حماقت کے خلاف بغاوت پر آمادہ کر سکے لیکن اس "قلب سلیم" کی بات ہی اور تھی جس کو نبوت اور عالم نو کی تعمیر کیلئے تیار کیا جا چکا تھا،

وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ[1] — اور بالیقین ہم (اس سے بھی) پہلے ابراہیم کو خوش فہمی عطا کر چکے تھے، اور ہم ان کو خوب جانتے تھے،

وہ اپنی بغاوت اس مرحلہ سے شروع کرتے ہیں جہاں بعض اوقات دنیا کے بڑے سے بڑے انقلاب کا گزر نہیں ہوتا، یہ گھریلو زندگی کا مرحلہ ہے اس گھر کا مرحلہ جہاں انسان پیدا ہوتا ہے، پلتا بڑھتا ہے اور جوان ہوتا ہے اور ہر چیز کا یہی تقاضا ہوتا ہے کہ وہ یہیں زندگی گزارے، اب وہ ساری باتیں پیش آتی ہیں جن کا قرآن مجید نے اپنے صاف، واضح، اور بلیغ و معجزانہ اسلوب میں ذکر کیا ہے، ان میں حضرت ابراہیمؑ کا بتوں کو توڑنا، پجاریوں کی اس پر سخت برہمی، حیرت اور لاچاری اور اس باغی اور حوصلہ مند نوجوان سے انتقام کی کوشش، ان کے لئے الاؤ روشن کرنا اور اس کا حضرت ابراہیمؑ کے حق میں ٹھنڈا اور باعث سلامتی بن جانا، جابر بادشاہ کے سامنے حضرت ابراہیمؑ کا بلیغ مناظرہ اور سوال و جواب سب چیزیں شامل ہیں[2]۔

یہ انکار اور بغاوت اس نتیجہ تک پہونچاتی ہے کہ سارا شہر ان کا دشمن ہو جاتا ہے، پوری سوسائٹی ان سے برہم نظر آتی ہے، حکومت وقت بھی ان کا تعاقب کرتی ہے اور ایذا پہونچاتی ہے لیکن وہ ان میں سے کسی چیز کی بھی پرواہ نہیں کرتے اور اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ اس کے منتظر اور اس نتیجہ کے پہلے

---

[1] سورہ انبیاء — ۵۱ [2] اس قصہ کی تفصیل سورۂ انبیاء کی آیات (۵۱ تا ۷۰) میں بیان کی گئی ہے۔

ہی سے متوقع ہوں، وہ اپنے شہر سے ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ بہت خوش اور مطمئن ہو کر ہجرت کرتے ہیں اس لئے کہ ان کی اصل پونجی یعنی دولتِ ایمان ان کے ہاتھ میں ہوتی ہے وہ بالکل تنہا اور بے یار و مددگار سفر کرتے ہیں، ان کے ساتھ ایک آدمی بھی نہیں ہوتا اس سفر میں ان کو ہر جگہ انسانوں کا ایک ہی نمونہ نظر آتا ہے، وہی بت پرستی، شرک و جہالت اور خواہشات کی گرم بازاری جس کو چھوڑ کر چلے تھے ہر جگہ ان کو ملتی ہے، وہ مصر پہونچتے ہیں اور وہاں بڑی آزمائش اور اہانت سے دو چار ہوتے ہیں اور اپنی اہلیہ کو جن پر بادشاہ وقت کی بری نظر تھی لیکر کامیابی کے ساتھ وہاں سے نکل جاتے ہیں، اس کے بعد شام پہونچتے ہیں یہاں کی آب و ہوا ان کو راس آتی ہے اور وہیں طرح اقامت ڈال دیتے ہیں اور توحید کی دعوت اور بت پرستی کی مذمت کا کام دوبارہ شروع کر دیتے ہیں۔

شام میں جہاں سرسبزی و شادابی اور رزق کے وسائل بہت وافر تھے اور جو قدرتی حسن سے بھی مالا مال تھا ان کا جی لگتا ہے لیکن جلد ہی ان کو ایک ایسی سرزمین کی طرف جانے کا حکم ملتا ہے جو سرسبزی و شادابی میں شام کی بالکل ضد ہے، لیکن حضرت ابراہیمؑ اپنا کوئی حق نہیں سمجھتے اور کسی سرزمین اور وطن سے ان کو وابستگی نہیں، وہ حکم کے بندہ اور چشم و ابرو پر چلنے والے ہیں اور ساری دنیا کو اپنا وطن اور پوری انسانیت کو اپنا خاندان سمجھتے ہیں، ان کو اس کا حکم ملتا ہے کہ اپنی بیوی "ہاجرہ" اور شیر خوار بچہ کو لے کر یہاں سے ہجرت کر جائیں،

ایک ایسی وادی اور سرزمین میں پہونچنے کے بعد جس کے چاروں طرف جلے ہوئے پہاڑوں کے سوا کچھ نہ تھا، جہاں کی آب و ہوا اور موسم بہت سخت، پانی مفقود اور ہر طرف سناٹا تھا اور کوئی ایسا مونس و غمخوار بھی نہ تھا جس سے دل کو سکون و اطمینان ہوتا، ان کو یہ حکم ملتا ہے کہ اپنی کمزور و ناتواں بیوی اور اپنے چھوٹے بچہ کو اللہ کے بھروسہ پر اور محض اس کے حکم کی تعمیل میں چھوڑ کر یہاں سے چلے جائیں اور اس طرح کہ راضی برضا ہوں، نہ جزع فزع ہو، نہ ڈر اور گھبراہٹ، نہ بے دلی و اکتاہٹ، نہ عزیمت میں کمزوری، نہ وعدۂ الٰہی میں

شک، بلکہ اس کے بجائے انسانی تجربوں کے خلاف بغاوت، طبعی اسباب کی مخالفت، وسائل سے بے نیازی اور انقطاع کلی، ایمان بالغیب اور خدا پر اس وقت بھروسہ اور اعتماد ہو جب قدم پھسلنے لگیں اور بد گمانی پیدا ہونے لگے۔

ان کے جانے کے بعد قدرتی طور پر وہ سب باتیں پیش آتی ہیں جن کا اندیشہ تھا، بچہ پیاس سے بیتاب ہو جاتا ہے، اور ماں پر بھی پیاس کا غلبہ ہوتا ہے لیکن اس صحرا میں پانی کہاں؟ وہاں تو ان چھوٹے چھوٹے گڑھوں کا بھی وجود نہ تھا جن میں بچا کھچا پانی مل جاتا ہے، اب ماں کی ممتا جوش مارتی ہے، ان کو خطرہ کا احساس ہونے لگتا ہے اور وہ پانی کی تلاش میں یا کسی ایسے قافلہ کی جستجو میں جس کے پاس پانی مل جائے بے تاب و بے قرار ہو کر والہانہ انداز میں دو پہاڑیوں کے درمیان دوڑنے لگتی ہیں، دوسری پہاڑی کے پاس پہونچنے کے بعد فوراً بچہ کا خیال آتا ہے کہ وہ نہ جانے کس حال میں ہو اس لئے رکے بغیر پھر دوبارہ واپس آ کر اطمینان کرتی ہیں کہ وہ زندہ اور بخیریت ہے، اس کے بعد پھر رہا نہیں جاتا اور وہ دوبارہ پھر اسی پہاڑی کی طرف دوڑ جاتی ہیں کہ شاید کہیں کوئی آدمی نظر پڑ جائے یا پانی کی علامت کسی جگہ نظر آ جائے، ایک طرف ان کے اندر وہ اضطراب و بے کلی ہوتی ہے جو اس صورت حال کا قدرتی نتیجہ ہے، دوسری طرف وہ سکینت جو صرف ایمان اور اعتماد علی اللہ سے پیدا ہوتی ہے، باوجود اس کے کہ وہ نبی کی بیوی اور نبی کی ماں ہیں ظاہری اسباب اور سعی و تدبیر کو ایمان اور توکل کے منافی نہیں سمجھتیں، وہ مضطرب ضرور ہیں لیکن مایوسی کے ادنیٰ شائبہ کے بغیر خدا پر پورا بھروسہ بھی رکھتی ہیں لیکن تعطل بے عملی اور سستی کے بغیر، ایسا منظر شاید چشم فلک نے کبھی نہ دیکھا تھا، اب رحمت الٰہی جوش میں آئی اور معجزانہ طریقہ سے ایک چشمہ وہاں پھوٹ پڑا یہ وہ زمزم کا مبارک اور لافانی چشمہ ہے جو نہ کبھی خشک ہوتا ہے نہ اس میں کوئی کمی آتی ہے، وہ ساری دنیا اور تمام نسلوں کے لئے کافی ہے اور آج تک سارا عالم اس سے فیضیاب اور سیراب ہو رہا ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے شفا بھی رکھی ہے غذائیت بھی، اجر بھی اور برکت بھی۔

اللہ تعالیٰ نے اس اضطراری حرکت کو جو ایک مخلص مومنہ سے صادر ہوئی ایک اختیاری حرکت بنا دیا

اور دنیا کے بڑے سے بڑے ذہین، عبقری، اور فلسفی انسان کو اور بڑے سے بڑے فرماں روا اور بادشاہ کو اس کا پابند کر دیا، چنانچہ جب تک وہ ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان سعی نہ کرلیں ان کا حج ہی پورا نہیں ہوسکتا، یہ دونوں پہاڑیاں دراصل ہر محب ومشتاق کی منزل ہیں، اور یہ سعی اس دنیا میں مومن کے موقف کی بہترین تمثیل ہے، اس لئے کہ وہ بھی عقل اور جذبہ اور احساس اور عقیدہ دونوں کا جامع ہوتا ہے، وہ عقل سے بھی پوری طرح کام لیتا ہے اور اپنی زندگی کے مصالح وضروریات میں اس سے فائدہ اٹھاتا ہے، لیکن کبھی کبھی اپنے ان دلی جذبات کے سامنے بھی سر جھکا دیتا ہے جن کی جڑیں عقل سے بھی زیادہ گہری اور مضبوط ہوتی ہیں، وہ ایک ایسی دنیا میں رہتا ہے جو ترغیبات، جنسی خواہشات، زینت وآرائش اور مظاہر سے بھری ہوئی ہے، لیکن صفا ومروہ کے درمیان سعی کرنے والے کی طرح وہ کسی طرف نظر اٹھائے اور کسی اور چیز میں اٹکے بغیر اور کسی اور جگہ ٹھہرے بغیر تیزی کے ساتھ وہاں سے گزر جاتا ہے، اس کو سب سے زیادہ فکر اپنی منزل اور اپنے مستقبل کی ہوتی ہے، وہ اپنی زندگی کو چند گنے چنے چکروں کی طرح سمجھتا ہے جو وہ اپنے رب کی اطاعت اور اپنے اسلاف کی اقتدا میں لگاتا ہے، اس کا ایمان بحث وجستجو میں مانع نہیں ہوتا اور اس کی سعی اس کے توکل واعتماد میں کوئی خلل نہیں ڈالتی، ایک ایسی حرکت جس کی ساری قیمت، روح، اور پیام، دو لفظوں میں ادا کیا جا سکتا ہے "محبت" اور "تابعداری"۔

اب یہ بچہ کچھ سیانا ہوتا ہے اور اس عمر کو پہونچتا ہے جب باپ کو اپنے بچہ سے قدرتی طور پر زیادہ لگاؤ ہوتا ہے، وہ اپنے باپ کے ساتھ باہر جاتا ہے، ان کے ساتھ دوڑتا بھاگتا ہے، اور ان کے ساتھ ساتھ رہتا ہے، اس کے والد جن میں انسانی ہمدردی اور محبت بدرجۂ اتم موجود تھی اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک اور جگر کے ٹکڑے سے بڑا انس اور میلان محسوس کرتے ہیں، اور یہی سب سے بڑی مشکل ہے، اس لئے کہ ان کا قلب وہ قلب سلیم تھا جو محبت الٰہی کیلئے مخصوص ہے، وہ کسی عام انسان کا دل نہیں، خلیل الرحمٰن کا دل تھا، محبت کو سب کچھ گوارا ہے شرکت گوارا نہیں، وہ رقیب کو کبھی برداشت نہیں کر سکتی ہے، یہ عام انسانی محبت کا حال ہے تو محبت الٰہی کا حال کیا ہوگا،

یہ وہ موقع ہے جب حضرت ابراہیمؑ کو اپنے محبوب بیٹے کی قربانی کا اشارہ ملتا ہے، انبیاء کا خواب وحی کے برابر ہوتا ہے

اس لئے جب کئی بار ان کو یہ اشارہ ملا تو وہ سمجھ گئے کہ اللہ تعالےٰ کا یہی منشا ہے اور ان کو یہ کام انجام دینا ہے، وہ اپنے بیٹے کا امتحان لیتے ہیں اس لئے کہ یہ کام ان کی موافقت، صبر اور قوت برداشت کے بغیر انجام دینا مشکل ہے یہ بات سُن کر وہ غایت درجہ سعادت و نجابت اور امر الٰہی کے سامنے مکمل تسلیم اور رضا بقضا کا مظاہرہ کرتے ہیں اور ایسا کیوں نہ ہوتا وہ خود نبی ہیں، نبی کے بیٹے ہیں اور نبی کے دادا ہیں۔

قَالَ يَا بُنَيَّ إِنِّي أَرَىٰ فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرَىٰ ۚ قَالَ يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۖ سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ[1]

انھوں نے کہا: بیٹا! میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں، سو تم بھی سوچ لو تمہاری کیا رائے ہے وہ بولے اے میرے باپ آپ کر ڈالئے جو کچھ آپ کو حکم ملا ہے، آپ انشاء اللہ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے۔

اب وہ بات پیش آتی ہے جس کے سامنے عقل عاجز اور حیران ہے، باپ اپنے محبوب اور سعید بیٹے کو لے کر باہر نکلتے ہیں وہ خدا کے اشارہ پر اپنے بیٹے کی قربانی کرنے جا رہے ہیں اور یہ بھی اپنے رب کی اور اپنے والد کی اطاعت میں ان کے ساتھ چل رہے ہیں، دونوں کا مقصد ایک ہے، اپنے مالک کا حکم بجا لانا اور بلا چون وچرا اس کے آگے اپنا سر رکھ دینا، راستہ میں ان کو شیطان ملتا ہے جس نے انسان کو ہمیشہ سعادت سے محروم کرنے کی کوشش کی ہے، وہ ان کو اس ارادہ کی تکمیل سے روکتا ہے، خدا کی نافرمانی کو بہت ہمدردانہ اور خوبصورت طریقہ پر ان کے سامنے پیش کرتا ہے زندگی کی رغبت دلاتا ہے لیکن وہ اس کی ایک چلنے نہیں دیتے اور حکم الٰہی کی تعمیل کے لئے کمر کس لیتے ہیں، اب وہ لمحہ آتا ہے جس کو دیکھ کر فرشتے بھی مضطرب ہو جائیں اور جن و بشر بھی، وہ اپنے لڑکے کو زمین پر لٹا دیتے ہیں چھری گلے پر رکھ دیتے ہیں اور ذبح کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں، اب اللہ تعالےٰ کی مشیت بیچ میں حائل ہوتی ہے اس لئے کہ مقصود حضرت اسماعیل کا ذبح کرنا نہیں تھا، بلکہ اس محبت کو ذبح

---

[1] سورہ صافات ـ ۱۰۲

کرنا تھا جو خدا کی محبت میں شریک ہو جاتی ہے اور رقیب بننے لگتی ہے اور یہ محبت گلے پر چھری رکھتے ہی ذبح ہو چکی تھی، حضرت اسماعیلؑ تو اس لئے پیدا ہوئے تھے کہ وہ زندہ رہیں، برگ و بار لائیں ان سے نسل چلے اور سید الانبیاء و ختم المرسلین محمد صلے اللہ علیہ وسلم بھی ان ہی کی اولاد میں ہوں، اس لئے وہ اللہ تعالےٰ کی مشیت پوری ہونے سے پہلے ذبح کیسے ہو سکتے تھے، اللہ تعالےٰ نے حضرت اسماعیلؑ کے فدیہ کے طور پر جنت کا ایک مینڈھا بھیجا کہ اس کو ان کی جگہ ذبح کرو اور اس کو حضرت ابراہیمؑ کے تمام متبعین اور ان کے بعد کی تمام نسلوں کیلئے سنت بنا دیا، ایام نحر میں وہ اسی "عظیم قربانی" کی تجدید کرتے ہیں اور اللہ تعالےٰ کے راستہ میں اپنے مالوں کو خرچ کر کے قربانی دیتے ہیں۔

فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۝ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۝ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ۝ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ۝ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِى الْاٰخِرِيْنَ ۝ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ۝[1]

پھر جب دونوں نے حکم کو تسلیم کر لیا اور (باپ نے بیٹے کو) کروٹ پر لٹا دیا، اور ہم نے انھیں آواز دی کہ اے ابراہیم تم نے خواب کو سچ کر دکھایا (وہ وقت ہی عجب تھا) ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں بیشک تھا بھی کھلا ہوا امتحان، اور ہم نے ایک بڑا ذبیحہ اس کے عوض میں دیا، اور ہم نے پیچھے آنے والوں میں یہ بات رہنے دی کہ ابراہیم پر سلام ہو،

حضرت ابراہیمؑ اور شیطان کے اس قصہ کو بھی اللہ تعالےٰ نے بقا و دوام بخشا اور ان جگہوں پر جہاں شیطان ان کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا تھا اور ان کو اس فعل سے باز رکھنا چاہا تھا کنکروں سے رجم کرنے کا حکم دیا اور اس کو ایک ایسا عمل بنا دیا جو ہر سال حج کے افضل ترین ایام میں کیا جاتا ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ شیطان سے نفرت پیدا ہو، اس کی نافرمانی اور اس سے بغاوت کا اظہار ہو، یہ وہ ادا ہے جس میں ایک مومن کو بڑی لذت،

---

[1] سورہ صافات۔ ۱۰۳ تا ۱۰۹

زندگی اور کیف محسوس ہونا چاہئے بشرطیکہ اس کا ایمان پختہ ہو، فہم صحیح ہو اور امر الٰہی کی اطاعت کا جذبہ دل میں موجزن ہو، کہانی کے اس کردار کو دہراتے وقت اس کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ بدی کی طاقتوں اور شیطان اور اس کے لشکروں کے ساتھ معرکہ کارزار میں ہے، اگرچہ شیطان کو اس سے سوائے رجم اور توہین کے کچھ ملنے والا نہیں،

اب اس واقعہ پر ایک زمانہ گزر جاتا ہے، یہ بچہ اب جوان ہو چکا ہے اللہ تعالےٰ نے اس کو نبوت وسیادت سے سرفراز کیا ہے حضرت ابراہیمؑ کی دعوت بھی رنگ لائی ہے، اور اچھی طرح پھیل چکی ہے، اب اس کے لئے ایک ایسے مرکز کی ضرورت تھی جس پر پورا اعتماد کیا جا سکتا اور جس سے ایمان کو قوت و غذا حاصل ہوتی، اس دنیا میں بادشاہوں کے محل اور بتوں کے معبد تو بہت تھے جہاں خواہش نفس اور شیطان کی پرستش ہوتی تھی لیکن اللہ کی زمین پر اللہ ہی کی عبادت کیلئے اب تک کوئی گھر نہ تھا جس میں اخلاص کے ساتھ صرف اسی کی عبادت ہوتی، اور اسکو عبادت کرنے والوں اور زیارت کرنے والوں کے لئے ہر قسم کی آلودگی اور نجاست سے پاک و صاف رکھا جاتا، چنانچہ اب جبکہ دین اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا ہے اور امت مسلمہ کی بنیاد پڑ چکی ہے، حضرت ابراہیمؑ کو بیت اللہ کی تعمیر کی ہدایت کی جاتی ہے تاکہ ایک ایسا گھر جو تمام انسانیت کیلئے جائے پناہ اور گہوارۂ امن ہو، اور جہاں صرف اللہ تعالےٰ کی عبادت کی جائے، باپ بیٹے دونوں مل کر اس مبارک اور پاک گھر کی تعمیر کرتے ہیں جو ظاہری شکل کے اعتبار سے بہت سادہ اور معمولی ہے لیکن اپنی عظمت کے لحاظ سے بہت مستحکم اور بلند ہے، وہ دونوں پتھر ڈھوتے ہیں اور اس کی دیواریں اٹھاتے ہیں،

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ	اور (وہ وقت بھی یاد رکھنے کے قابل ہے) جب ابراہیم
وَاِسْمٰعِيْلُ ۭ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ	اور اسماعیل خانۂ (کعبہ) کی بنیادیں بلند کر رہے تھے لے
الْعَلِيْمُ ۝ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ	ہمارے پروردگار ہم سے (یہ) قبول کر یقیناً تو ہی
ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا	(سب کچھ) سننے والا ہے، (سب کچھ) جاننے والا ہے

وَتُبْ عَلَيْنَا ج إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ۝[1]

اے پروردگار ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار بنادے اور ہماری نسل سے ایک فرمانبردار امت پیدا کر، اور ہم کو ہمارے دینی قاعدے بتلادے، اور ہمارے حال پر توجہ رکھ یقیناً تو بڑا توجہ فرمانے والا ہے، بڑا مہربان ہے،

یہ گھر ایمان واخلاص کی ان بنیادوں پر قائم کیا گیا جس کی نظیر دنیا میں اور کہیں نہیں ہے، اللہ تعالےٰ نے اس کو خوب قبول فرمایا، نوازا، اس کے دوام کا فیصلہ فرمایا، اس کو جمال وجلال کا لباس زیبا عطا کیا، دلوں کو اس کی طرف مائل کر دیا اور اس کو تمام انسانوں کی قبلہ گاہ اور ان کے دلوں کے لئے مقناطیس کی طرح باعث کشش بنا دیا، لوگ وہاں سر کے بل بلکہ آنکھوں اور پلکوں کے بل آتے ہیں اور اس پر جان و دل نثار کرتے ہیں یہ گھر ہر قسم کے ظاہری حسن اور مصنوعی آرائش سے خالی اور محفوظ ہے اور ایک ایسے شہر میں واقع ہے جو تہذیب وتمدن کے ہنگاموں اور زندگی کے پرشور دھارے سے بہت دور ہے لیکن پھر بھی اس میں وہ کشش پائی جاتی ہے کہ لوگ اس کی طرف کھنچ کھنچ کر دیوانہ وار پہونچتے ہیں اور اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے بیتاب رہتے ہیں،

جب یہ گھر بن کر تیار ہو گیا تو غیب سے یہ صدا آئی،

وَأَذِّن فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ۝ لِّيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهِ فِي أَيَّامٍ مَّعْلُومَاتٍ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ج فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا

اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو، لوگ تمہارے پاس پیدل بھی آئیں گے اور دبلی اونٹنیوں پر بھی جو دور دراز راستوں سے پہنچی ہوں گی تاکہ اپنے فوائد کے لئے آموجود ہوں اور تاکہ ایام معلوم میں اللہ کا نام لیں ان چوپایوں پر جو اللہ نے ان کو عطا کئے ہیں، پس تم بھی اس میں سے

---

[1] سورہ بقرہ - ۱۲۷ - ۱۲۸

الْبَائِسَ الْفَقِيْرَ ○ ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ○[1]

کھاؤ اور مصیبت زدہ محتاج کو بھی کھلاؤ پھر لوگوں کو چاہیئے کہ اپنا میل کچیل دور کریں، اور اپنے واجبات کو پورا کریں، اور چاہیئے کہ (اس) قدیم گھر کا طواف کریں۔

حضرت ابراہیمؑ کے عہد میں یہ دنیا اسباب کی غلام تھی اور لوگ ان پر ضرورت سے زائد اعتماد کرنے لگے تھے، بلکہ یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ وہ مستقل بالذات قائم اور موثر ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان اسباب نے ارباب کا درجہ اختیار کر لیا اسباب کی اس درجہ تقدیس اور اعتماد نے اس بت پرستی کے پہلو بہ پہلو جس میں لوگ پہلے ہی پوری طرح ڈوبے ہوئے تھے ایک نئی بت پرستی پیدا کر دی، حضرت ابراہیمؑ کی زندگی دراصل ان ہی "بت گروں" اور "بت پرستوں" کے خلاف بغاوت تھی وہ توحید خالص اور اللہ تعالےٰ کی قدرت کاملہ اور احاطہ و وسعت پر ایمان کی دعوت تھی اور اس بات کا اعلان کہ وہی تمام چیزوں کو عدم سے وجود میں لاتا ہے، وہی اسباب پیدا کرتا ہے اور وہی ان کا مالک ہے، وہ جب چاہتا ہے اسباب کو مسببات سے جدا کرتا ہے اور اشیاء سے ان کے خواص کو سلب بھی کر لیتا ہے اور ان سے وہ چیزیں ظاہر فرماتا ہے جو اس کی ضد ہوتی ہیں اس کو جب چاہتا ہے اور جس چیز کے لئے چاہتا ہے استعمال کرتا ہے اور جس کام پر چاہتا ہے لگا دیتا ہے لوگوں نے حضرت ابراہیمؑ کے لئے آگ کی بھٹی تیار کی اور کہا کہ

حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْا آلِهَتَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ فَاعِلِيْنَ ○[2]

انھیں تو جلا دو اور اپنے ٹھاکروں کا بدلہ لو، اگر تمہیں (کچھ) کرنا ہے۔

لیکن حضرت ابراہیمؑ جانتے تھے کہ آگ اللہ تعالےٰ کے ارادہ کے تابع ہے، جلانا اس کی مستقل بالذات صفت نہیں جو کبھی اس سے جدا نہیں ہو سکتی، ایک اضافی صفت ہے جو اللہ تعالےٰ نے اس میں امانت کے طور پر رکھی ہے اس کی لگام اسی کے ہاتھ میں ہے جب چاہے ڈھیل دے دے اور جب چاہے کھینچ لے اور اسی آگ کو دیکھتے

---

[1] سورہ حج ۲۷ - ۲۸ - ۲۹ [2] سورہ انبیاء ۶۸

دیکھتے گلستان اور چمنستان بنا دے اس ایمان و یقین کے ساتھ وہ اس میں اطمینان کے ساتھ داخل ہو گئے اور وہی ہوا جو انھوں نے سوچا تھا،

قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَّسَلَامًا عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ ۝ وَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَخْسَرِينَ ۝[1]	ہم نے حکم دیا اے آگ تو ٹھنڈی اور بے گزند ہو جا ابراہیمؑ کے حق میں، اور (لوگوں نے) ان کے ساتھ برائی کرنا چاہی تھی سو ہم نے انھیں (لوگوں) کو ناکام کر دیا۔

لوگوں کا عام عقیدہ اور تجربہ یہ تھا کہ زندگی وافر پانی، زرخیز مٹی، اور کھیت و باغات پر قائم ہے چنانچہ وہ اپنے بتوں اور خاندانوں کے لئے ان شہروں اور ملکوں کی تلاش میں رہتے تھے جو وطن بنانے کے لائق ہوں اور وہاں کی زمین بہت زرخیز ہو، سرسبزی و شادابی خوب ہو، پانی وافر مقدار میں ملے، تجارت اور صنعتی کاروبار کے لئے سہولتیں حاصل ہوں، حضرت ابراہیمؑ نے اس عقیدہ و تجربہ اور دستور و رواج کے خلاف بغاوت کی اور خود عمل کر کے دکھایا انھوں نے اپنے مختصر خاندان کیلئے جو ماں بیٹے پر مشتمل تھا ایک ایسی وادی غیر ذی زرع (بے آب و گیاہ وادی) کا انتخاب کیا جس میں نہ زراعت کی صلاحیت تھی، نہ تجارت کا موقع، وہ دنیا سے منقطع، تجارتی مراکز اور شاہراہوں اور دولت اور خوشحالی کے علاقوں سے بہت دور واقع تھی، یہاں پہونچ کر انھوں نے اللہ تعالےٰ سے دعا کی کہ وہ ان کے رزق میں کشائش پیدا فرمائے، دلوں کو ان کی طرف مائل کر دے اور ہر طرح کے پھل بغیر ظاہری اسباب اور عام راستوں کے وہاں پہونچتے رہیں۔ انھوں نے یہ دعا کی۔

رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِندَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُم مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ	اے ہمارے پروردگار میں اپنی کچھ اولاد کو ایک بے زراعت میدان میں آباد کر دیا ہے تیرے معظم گھر کے قریب (یہ اس لئے) اے ہمارے پروردگار کہ وہ لوگ نماز کا اہتمام رکھیں، سو تو کچھ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے

---

[1] سورہ انبیاء - ۶۹ - ۷۰

يَشْكُرُوْنَ ٥[1]　　اور انھیں کھانے کو پھل دے جس سے یہ شکر گزار رہیں۔

اللہ تعالے نے ان کی دعا قبول فرمائی اور ایسی قبول فرمائی کہ رزق اور امن دونوں چیزوں کی ضمانت کردی اور اسکے شہر کو ہر قسم کے پھلوں اور اپنی ..... مختلف نعمتوں کا مرکز بنا دیا۔

اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ٥[2] ....

کیا ہم نے ان کو امن و امان والے حرم میں جگہ نہیں دی جہاں ہر قسم کے پھل کھنچے چلے آتے ہیں ہمارے پاس سے بطور کھانے کے، لیکن ان میں سے اکثر لوگ (اتنی بات بھی) نہیں جانتے۔

....

فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ٥ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ٥ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ٥[3]

چاہیئے تھا کہ اس خانہ (کعبہ) کے مالک کی عبادت کریں جس نے ان کو بھوک میں کھانے کو دیا۔ اور انھیں خوف سے امن دیا۔

انھوں نے اپنے گھر والوں کو ایک ایسی زمین میں لا کر چھوڑ دیا جہاں حلق تر کرنے کے لئے بھی پانی نہ تھا، لیکن ایسی ریگستانی اور پتھریلی زمین سے اللہ تعالے نے ایک چشمہ جاری فرما دیا، ریت سے پانی خود بخود ابلنے لگا اور بغیر کسی توقف کے آج تک اسی طرح جاری ہے، لوگ جی بھر کے اس کو پیتے ہیں اور پیپے بھر کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔

وہ اپنے گھر والوں کو ایک ایسی ویران و غیر آباد جگہ چھوڑ دیتے ہیں جہاں آدمی کا سایہ بھی نظر نہیں آتا لیکن دیکھتے دیکھتے وہ جگہ ایسی معمور و آباد ہو جاتی ہے کہ دنیا کے ہر علاقہ کے لوگ وہاں دیکھے جا سکتے ہیں، حضرت ابراہیمؑ کی زندگی ان کے عہد اور ان کی سوسائٹی کی حد سے بڑھی ہوئی مادیت اور اسباب کی پرستش کے خلاف ایک چیلنج تھی، اور خدا کی قدرت مطلقہ پر اعتماد کلی کا اظہار ـــــ اور یہی اللہ تعالے کی سنت جاریہ ہے

---

[1] سورہ ابراہیم ۳۷　[2] سورہ قصص ۵۷　[3] سورہ قریش ۳-۴

وہ اسباب کو ہمیشہ ایمان کے تابع بنا دیتا ہے اوران اسباب سے وہ چیزیں ظاہر فرماتا ہے جن کو سمجھنے سے مادی نگاہیں قاصر اور عاجز ہیں،

حج ابراہیمی اعمال وصفات کی یادگار اورآپ کی دعوت وتعلیم کی تجدید ہے

حج اور اس کے تمام اعمال ومناسک نیز اس سلسلہ کے تمام واقعات وحوادث جو ان اعمال کے ساتھ وابستہ ہیں، مثلاً ہر سے بے نیازی اور انانیت وخود پرستی سے رہائی وآزادی کا وہ لباس زیبا جو حاجی زیب تن کرتا ہے، اوراحرام، وقوف، افاضہ، رجم، سعی اور طواف کے تمام وہ اعمال جو وہ بجالاتا ہے، دراصل توحید، اسباب کی نفی، خدا پر توکل، اس کے راستہ میں قربانی اوراس کی اطاعت وخوشنودی کو اپنی زندگی میں موثر، پائدار اور فعال بنانے کی سعی وتدبیر ہے، وہ عادات، رسم ورواج، جھوٹے معیار اور مصنوعی قدروں کے خلاف ایک کھلی ہوئی بغاوت اور طاقتور ایمان، سچی محبت، بے نظیر قربانی اوراعلی درجہ کے ایثار وبے غرضی کی تجدید ہے، حج ان اعلیٰ مقاصد صالح جذبات، روحانی اور ایمانی قدروں نیز اس انسانی واسلامی اخوت کی بقا وترقی کا ضامن ہے جو مصنوعی قومیتوں اور نسل ووطن کے حدود اور ناقص پیمانوں سے بالاتر ہے، وہ حضرت ابراہیم ؑ کے راستہ اور مسلک پر چلنے ان کی روح کو اپنے اندر پیدا کرنے اور ہر جگہ اور ہر دور میں ان کی دعوت کے پرچم کو بلند رکھنے کی دعوت ہے

مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ ۚ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِن قَبْلُ وَفِي هَٰذَا لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ ۚ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاعْتَصِمُوا بِاللَّهِ هُوَ مَوْلَاكُمْ ۖ فَنِعْمَ الْمَوْلَىٰ وَنِعْمَ النَّصِيرُ[1]	تم اپنے باپ ابراہیم کی ملت (پر قائم رہو) اسی نے تمہیں مسلم قرار دیا، پہلے بھی اور اس (قرآن) نے بھی تاکہ رسول تمہارے اوپر گواہ ہوں، اور تم (سب) لوگوں کے مقابلہ میں گواہ ٹھہرو، سوتم لوگ نماز کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو، اور اللہ ہی کو مضبوط پکڑے

[1] سورہ حج ۷۸

. . . . رہو وہی تمہارا کارساز ہے، سو کیسا اچھا کارساز ہے اور

. . . . کیسا اچھا مددگار ۔

تاریخ کا نیا عنوان اور انسانیت کی حد فاصل

حضرت ابراہیمؑ اور ان کی دعوت اور جدوجہد کتاب انسانیت کا نیا، روشن، اور تابناک عنوان ہے، اس سے ایک تاریخ دوسری تاریخ سے جدا ہوتی ہے، پوری انسانیت دو کیمپوں اور دو محاذوں میں بٹ جاتی ہے جو زمانہ کے ساتھ ہمیشہ باقی رہتے ہیں، اور ان کی کشمکش بھی جاری رہتی ہے، اس سے پرانا دور ختم ہوتا ہے اور نیا دور شروع ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو لازوال امامت اور ابدی دعوت سے نوازا ان کی نسل کیلئے نبوت اور ولایت اور دنیا کی دینی پیشوائی اور قیادت ہمیشہ کیلئے لکھدی، اور ان کے خاندان اور متبعین کیلئے فیصلہ فرمادیا کہ حق کیلئے جہاد و سرفروشی باطل کے ساتھ مستقل کشمکش، دعوت الی اللہ، انسانیت کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو تیز و تند دھاروں اور سخت تھپیڑوں کے باوجود پار لگانے کی ذمہ داری اور ہوا کے جھونکوں سے اس چراغ زندگی کی حفاظت ہمیشہ ان ہی کے سر رہے گی جس پر انسانیت کے پورے قافلہ کی نجات کا انحصار ہے۔

انسانیت کا سہارا

حج اور اس موسم کے تمام مناسک اور ملت ابراہیمی کے فرزندوں کا مکہ میں یہ سالانہ اجتماع حضرت ابراہیمؑ اور ان کے نام لیواؤں و روحانی فرزندوں کے باہمی ارتباط اور ان معانی، عقائد اور مقاصد کی تجدید کیلئے بالکل کافی ہے اور اس میں نہ صرف اس ملت بلکہ ساری انسانیت کی بقا ہے،

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا	اللہ نے کعبہ کے مقدس گھر کو انسانوں کے باقی رہنے کا
لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَآئِدَ	مدار ٹھہرایا ہے (نیز) حرمت والے مہینہ کو اور حرم
ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي	میں قربانی کو، اور گلے میں پٹہ پڑے ہوئے جانوروں کو،

السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاَنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ[1]

یہ اس لئے کہ تم یقین جان لو کہ جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے اللہ اس سب کا علم رکھتا ہے، اور بیشک اللہ ہر چیز کا پورا علم رکھتا ہے۔

ہدایت وارشاد اور اصلاح وجہاد کا ابدی مرکز

عہد اسلامی اور رسالت محمدیؐ کے دور میں یہ گھر ہدایت وارشاد، روحانیت وللّٰہیت، دل کی غذا اور طمانیت وسکینت کا ایک مستقل اور ابدی مرکز بن گیا جہاں مناسک حج ادا کئے جاتے ہیں، روح و دل کو غذا اور قوت پہونچائی جاتی ہے، دل کے سرد خانہ کو پھر سے گرم اور روشن کیا جاتا ہے اور گویا اسکے استعمال شدہ "سیلز" کی جگہ نئے اور طاقتور "سیلز" لگائے جاتے ہیں، پوری امت یہاں سے دینی پیغام حاصل کرتی ہے سارا عالم اسلام ہر سال یہاں جمع ہو کر اپنی محبت واطاعت اور تسلیم وانقیاد کا خراج ادا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کی اس مضبوط رسی اور اس رکن رکین کے ساتھ اپنی گہری وابستگی کا ثبوت دیتا ہے، دنیا کے بڑے سے بڑے فضلاء وعلماء، بادشاہ، وامراء، اغنیاء وفقراء، سیاست داں اور حکمراں عشق ومحبت اور جوش ووارفتگی کے ساتھ اس کا طواف کرتے ہیں، لیکن فہم وبصیرت اور احساس وشعور لئے ہوئے، وہ اس کا عملی ثبوت دیتے ہیں کہ وہ اختلاف کے باوجود متحد تنوع کے باوجود ہم رنگ وہم خیال، انتشار کے باوجود شانہ بشانہ اور صف بصف، فقر کے باوجود غنی اور ضعف کے باوجود قوی ہیں، وہ اگرچہ پورے عالم اسلام میں منتشر اور اپنے مسائل اور زندگی کے مطالبات میں منہمک ہیں، مختلف نسلوں اور مختلف قوموں سے تعلق رکھتے ہیں، اور متنوع تہذیبوں اور ثقافتوں سے وابستہ ہیں تاہم ایک خاص نقطہ پر پہونچ کر وہ سب ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں اور ایک ہو جاتے ہیں، ان کی زندگی طواف وسعی، عبادت وقربانی، ایمان وعقیدہ، اور ان کے سفر کی منزلیں منیٰ اور عرفات اور حج کے مقامات ہیں، وہ ہر وقت اپنی منزل مقصود کی طرف رواں دواں رہتے ہیں مستقل پیش قدمی اور ترقی، نئی نئی ملاقاتیں اور تعارف نئی نئی منزلیں اور راہیں، یہ سفر در سفر ان کے دم واپسیں تک جاری رہتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے مالک سے

[1] سورۂ مائدہ - ۹۷

جا ملتے ہیں،

اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

یہ بات بالکل قدرتی اور فطری ہے کہ ایک مسلمان کو (خاص طور پر وہ جو بہت دور دراز مقام سے آیا ہو)

مناسک حج کی تکمیل کے بعد اس جگہ کا شوق دامنگیر ہو جو خاتم المرسلین صلے اللہ علیہ وسلم کی جائے ہجرت اور آخری آرام گاہ اور اسلام کی آغوش رحمت اور جائے پناہ ہے، اس کی نگاہیں اس مسجد کے لئے بیقرار ہوں جہاں سے روشنی کی کرنیں اس طرح پھوٹیں کہ سارا عالم اس کی روشنی سے جگمگا اٹھا، جہاں سے ہدایت، علم و روحانیت اور اسلام کی قوت و شوکت کے چشمے جاری ہوئے اور انھوں نے ساری دنیا کو گل و گلزار بنا دیا یعنی اس "مدینہ" کا شوق اس کے دل میں چٹکیاں لینے لگے جہاں اسلام نے پناہ لی جہاں تاریخ اسلام کی پہلی فصلیں مرتب ہوئیں، جہاں کی خاک پاک صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے آنسو اور خون دونوں سے تر ہے، وہ اس مسجد میں نماز ادا کرے جہاں کی ایک رکعت دوسری جگہ کی ایک ہزار رکعت کے برابر ہے[1]، ان جگہوں پر ٹھیر ٹھیر کر اور رک رک کر آگے بڑھے جہاں کبھی سابقین اولین اور شہداء و صدیقین ٹھیرا کرتے تھے، یہاں سے صدق و اخلاص عشق و محبت اور اسلام کے راستہ میں شجاعت و مردانگی اور شہادت کی دولت حاصل کرے جو یہاں کا سب سے بڑا تحفہ اور سب سے قیمتی سوغات ہے، اور اس نبیؐ پر درود بھیجے جن کی دعوت کے طفیل اس کو ظلمتوں سے روشنی میں، انسانوں کی غلامی سے اللہ تعالےٰ کی غلامی و بندگی میں، دنیا کی تنگی سے اس کی کشادگی میں پہونچنا نصیب ہوا اور اس کو پہلی بار ایمان کی حلاوت حاصل ہوئی اور انسان کی قیمت معلوم ہوئی۔

تحریف و فساد سے حفاظت کیلئے اس سالانہ اجتماع کی اہمیت

حج ملت کا ایک ایسا سالانہ اجتماع

---

[1] حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "میری مسجد میں نماز اس کے علاوہ کسی اور مسجد کی ایک ہزار نمازوں کے برابر ہے سوائے مسجد حرام کے" متفق علیہ۔

یا دوسرے الفاظ میں پڑ یڈ ہے جس کا ملت اسلامی کی سچائی و پاکیزگی اور اس کی اصلی اور حقیقی بنیادوں کی حفاظت میں بڑا اہم حصہ ہے، اس دین کو تحریف، ابہام والتباس سے محفوظ رکھنے اس امت کو اپنے حقیقی سرچشمہ اور اپنی جڑوں سے وابستہ اور پیوست رکھنے' اور ان سازشوں اور مغالطوں کا پردہ چاک کرنے ہیں (جن کا شکار گذشتہ قومیں ہو چکی ہیں) اس اجتماع سے جو مدد ملتی ہے وہ کسی اور چیز سے نہیں ملتی، اس عظیم سالانہ اجتماع اور اس کے مخصوص اعمال و مناسک کی بدولت یہ عظیم اور لافانی امت اس ابراہیمی ذوق و مزاج کی اب بھی حامل ہے (جس کو ہم پرسوز و درد مند، مومنانہ و عاشقانہ، مخلص و یکسو، اور سادہ و عمیق جیسے الفاظ سے تعبیر کرسکتے ہیں) اور اس نے اس ورثہ کو اپنی آئندہ نسلوں تک بحفاظت پہونچانے کا کام جاری رکھا ہے، اس لحاظ سے حج ایک ایسے زندہ، طاقتور اور دھڑکتے ہوئے دل کی طرح ہے جو اس امت کی رگوں میں برابر تازہ خون تقسیم کرتا رہتا ہے، اس کی وجہ سے یہ امت مجموعی طور پر ایک ہی وقت میں اور ایک ہی جگہ اپنا جائزہ لینے کے قابل ہے اور اس کے علماء و مصلحین کو اس کا موقع حاصل ہے کہ وہ اس کو اہل غلو کی تحریف، اہلِ باطل کے فریب، جاہلوں کی تاویل اور ہر قسم کے خرافات اور افسانوں سے پاک و صاف کرتے رہیں اور اس کو اس کی اصلِ ابراہیمی، شریعت محمدیؐ اور دینِ خالص کے معیار پر رکھ کر برابر جانچتے رہیں، اس کے ذریعہ سے یہ امت اپنی دینی، عقلی اور ثقافتی وحدت کی بخوبی حفاظت کرسکتی ہے، اور اس علاقائیت اور قومیت کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرسکتی ہے جو ابراہیمی وحدت اور اسلامی و محمدی رنگ و مسلک کی حریف ہے، اور جس نے گذشتہ مذاہب اور مذہبی اقوام کو بھی سخت نقصان پہونچایا تھا۔

یہ امت مختلف قسم کے ماحول اور زمین کے مختلف خطوں میں رہتی ہے اور اس کو مختلف ادوار سے گزرنا پڑتا ہے، کبھی اس میں زندگی و حرکت کے آثار نظر آتے ہیں، کبھی جمود و غفلت کے، کبھی تشدد اور سختی کے، کشمکش اور مقابلہ کے، کبھی تہذیب و تمدن کے مسائل اس کے سامنے ہوتے ہیں، کبھی مادی و سیاسی ترغیبات اس کو آزمائش میں ڈالتی ہیں، کبھی مادیت اور مال و دولت کا غلبہ ہوتا ہے، کبھی تنگ دستی و افلاس کا، کبھی اس پر

کوئی جابر بادشاہ، ظالم حکمراں یا بے رحم سیاست داں مسلط کر دیا جاتا ہے اور کبھی اس سے مختلف اور برعکس حالات سے واسطہ پڑتا ہے، لیکن ان سب حالات میں اس کو اس کی ضرورت ہمیشہ باقی رہتی ہے کہ ایمان کی اس دبی ہوئی چنگاری کو برابر بھڑکایا جائے، جذبۂ عشق و محبت کو ہوا دی جائے، اور ملت کے ہر جز اور ہر وحدت کو وفا و جان نثاری کا سبق ملے، اللہ تعالیٰ نے حج کو ایک موسم بہار بنایا ہے جس میں امت کا یہ سدابہار درخت خوب پھل پھول لاتا ہے اور مسلمانوں کا یہ عالمی خاندان اپنے پرانے لباس کو اتار کر ایک نیا اور خوشنما لباس زیب تن کرتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے جو مقاصد اسلام اور اسرار شریعت پر بڑی گہری نظر اور بصیرت رکھتے ہیں اس پہلو کی بڑی اچھی وضاحت کی ہے وہ "حجۃ اللہ البالغہ" میں لکھتے ہیں:۔

"جس طرح حکومت کو ہر تھوڑے عرصہ کے بعد ایک عام جائزہ اور معائنہ کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ اس کو معلوم ہو جائے کہ کون وفادار ہے کون باغی، کون فرض شناس ہے کون کام چور، نیز اس کے ذریعہ اس کی ایمانداری کی شہرت ہو اور اس کا نام اونچا رہے، اسکے کارندے اور باشندے ایک دوسرے سے تعارف حاصل کریں، اسی طرح ملت کو حج کی ضرورت ہے تاکہ منافق و غیر منافق میں تمیز ہو سکے، اللہ تعالیٰ کے دین میں اور اللہ تعالیٰ کے دربار میں جوق جوق جماعتیں حاضر ہوں، لوگ ایک دوسرے سے تعارف حاصل کریں اور ہر شخص اس چیز میں جو اس کے پاس نہیں ہے دوسرے سے استفادہ کرے اس لئے کہ بہترین و مرغوب اشیاء بالعموم صحبت و رفاقت سے اور ایک دوسرے کو دیکھ کر ہی حاصل ہوتی ہیں"[1]

نیز وہ فرماتے ہیں:۔

---

[1] حجۃ اللہ ج ۱ ص ۵۹، ۶۰

"حج چونکہ ایک ایسا موقع ہے جس میں سب ہی جمع ہوتے ہیں اس لئے وہ غلط قسم کی رسوم سے حفاظت کیلئے بہت مفید ہے، ملت کو اماموں اور پیشواؤں کے حالات یاد کرنے اور ان کی اتباع کا جذبہ دل میں پیدا کرنے کیلئے کوئی چیز اس درجہ کی نہیں جو اس کا مقابلہ کر سکے"[1]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:۔

"(حج کے) مقاصد میں وہ بات بھی ہے جس کے لئے حکومتیں نمائش یا سرکاری جشن کیا کرتی ہیں جس کو دیکھنے کے لئے قریب و دور ہر جگہ کے آدمی جمع ہوتے ہیں، ایک دوسرے سے ملتے ہیں، اپنی حکومت اور اپنی ملت کی تعلیمات سے آشنا ہوتے ہیں اور اس کے مقدس مقامات کی تعظیم بجالاتے ہیں اسی طرح حج مسلمانوں کی نمائش یا سرکاری جشن ہے جس میں ان کی شوکت ظاہر ہوتی ہے ان کی قوتیں مجتمع ہوتی ہیں ان کی ملت کا نام روشن ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا سورہ بقرہ ــ ۱۲۵	اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب ہم نے خانۂ کعبہ کو لوگوں کے لئے ایک مقام رجوع اور مقام امن مقرر کیا"[2]

بین الاقوامی ہدایت و رہنمائی کا ابدی مرکز

اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہے کہ اس امت کے نازک سے نازک دور اور تاریک سے تاریک زمانہ میں بھی وہ حج کو ان بابرکت ہستیوں سے کبھی محروم نہ رکھے گا جن کو ہم علماء حق، مقبولین بارگاہ، اہل دعوت و اصلاح، اور اہلِ باطن و اہل قلوب کہتے ہیں، اور جن کی وجہ سے حج کی فضا روحانیت اور نورانیت سے

---

[1] حجۃ اللہ ج ا ص ۶۰،۵۹ [2] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۴۲

اس قدر بھر جاتی ہے کہ سخت سے سخت دل بھی موم اور پتھر جیسے جگر بھی پانی ہو جاتے ہیں، باغی و نافرمان بھی توبہ وانابت کی طرف مائل ہونے لگتے ہیں، وہ آنکھیں جن سے کبھی خوف یا محبت کے دو قطرے بھی نہ ٹپکتے تھے یہاں پہونچ کر بے ساختہ اشکبار ہو جاتی ہیں، دل کی سرد انگیٹھیاں ایک بار پھر سلگ اٹھتی ہیں، رحمت الٰہی کا نزول ہوتا ہے اور سکینت پورے ماحول کو اپنے آغوش میں لے لیتی ہے اور شیطان کو منہ چھپانے کی بھی جگہ نہیں ملتی حدیث شریف میں آتا ہے کہ "شیطان عرفہ کے دن سے زیادہ حقیر و ذلیل راندۂ درگاہ اور غصہ سے جلا بھنا ہوا کبھی نہیں دیکھا گیا" اور یہ صرف اس وجہ سے کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ رحمت الٰہی نازل ہو رہی ہے اور اللہ تعالیٰ بڑے بڑے گناہوں کو معاف فرما رہا ہے[1]"

اس وقت کی فضا ایک خاص کیف رکھتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی کرنٹ نے اس کو چھو لیا ہے وہ مسلمان جو دور دراز مقامات سے یہاں آتے ہیں اپنے ویران اور خالی دلوں کو پھر سے آباد کرتے ہیں اور ایمان و محبت، جوش و حمیت اور علم و فقہ کا وہ زادِ سفر حاصل کرتے ہیں جو ان کی واپسی کے بعد بھی کام دے سکے اور اس کی مدد سے وہ ہر قسم کی ترغیب، دباؤ، لالچ، اور خوف کا مقابلہ کر سکیں، وہ اپنے اپنے ملکوں میں لوٹ کر اپنے ان بھائیوں کو بھی اس دولت یا اس تحفہ میں شریک کرتے ہیں جو ضعف یا بیماری یا کسی عذر کی وجہ سے یہاں حاضر نہیں ہو سکے، اس طریقہ سے ایمانی بجلی کا یہ کرنٹ امت مسلمہ کے پورے جسم میں دوڑ جاتا ہے، اس سے جاہلوں میں علم کا شوق پیدا ہوتا ہے، کمزوروں و پست ہمتوں کی ہمت بلند ہوتی ہے، افسردہ اور مایوس انسانوں میں گرمجوشی اور حوصلہ مندی پیدا ہوتی ہے، امت کو اپنا پیغام پہونچانے اور فریضۂ دعوت ادا کرنے کی نئی طاقت حاصل ہوتی ہے اور اس کے نئے سفر کا آغاز ہوتا ہے۔

اسلامی و انسانی اخوت، اور عالمی برادری کا مظاہرہ

حج ان وطنی، نسلی، لسانی اور علاقائی قومیتوں کے

---

[1] روایت مالک (مرسل)

خلاف اسلامی قومیت کی جیت ہے جن کے بہت سے اسلامی ممالک (مختلف عوامل اور دباؤ کے ماتحت) شکار ہیں، وہ اسلامی قومیت کا مظہر اور اعلان ہے، یہاں پہونچ کر تمام اسلامی قومیں اپنے ان قومی وملکی لباسوں سے آزاد ہو کر جو ان کی پہچان بن گئے تھے اور جن سے بہت سی قومیں تعصب کی حد تک وابستہ ہیں، اسلام کا ایک قومی لباس اختیار کر لیتی ہیں جس کو دین وفقہ اور حج وعمرہ کی اصطلاح میں "احرام" کہا جاتا ہے، سب عاجزی وانکساری احتیاج ولاچاری اور گریہ وزاری کے ساتھ ایک زبان میں ایک ترانہ اور ایک ہی نعرہ لگاتے ہیں،

لبیک اللھم لبیک، لبیک لا شریک لک لبیک، انّ الحمدَ والنعمۃَ لکَ والملکَ، لا شریکَ لکَ،	اے میرے اللہ میں حاضر ہوں، حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں، میں حاضر ہوں، ساری تعریفیں اور نعمتیں تیرے ہی لئے زیبا ہیں اور حکومت وبادشاہت بھی، تیرا کوئی شریک نہیں،

ان میں حاکم ومحکوم آقا ونوکر، امیر وفقیر اور چھوٹے بڑے کی کوئی تفریق نہیں ہوتی، ان کے لباس اور صدا دونوں میں اسلامی قومیت جلوہ گر نظر آتی ہے یہی حال حج کے دوسرے اعمال، عبادات، مناسک، اور شعائر ومقامات کا ہے، جہاں ہر قوم وملک کے لوگ دوش بدوش نظر آتے ہیں اور قریب وبعید اور عرب وعجم کے سارے فرق مٹ جاتے ہیں، صفا ومروہ کی دو پہاڑیوں کے درمیان سب ساتھ دوڑتے ہیں منیٰ ساتھ سفر کرتے ہیں، عرفات ساتھ جاتے ہیں اور جبل رحمت پر ایک ساتھ حاضر ہو کر دعا کرتے ہیں اور سب ایک ہی جگہ رات گزارتے ہیں۔

فَاِذَآ اَفَضۡتُمۡ مِّنۡ عَرَفٰتٍ فَاذۡكُرُوا اللّٰهَ عِنۡدَ الۡمَشۡعَرِ الۡحَرَامِ ص وَاذۡكُرُوۡهُ كَمَا هَدٰٮكُمۡ ج وَاِنۡ كُنۡتُمۡ مِّنۡ قَبۡلِهٖ	پھر جب تم جوق در جوق عرفات سے واپس ہونے لگو تو اللہ کا ذکر مشعر حرام کے پاس کر لیا کرو، اور ان کا ذکر اس طرح جیسا اس نے تمہیں بتایا ہے؛ اور اس سے

لَمِنَ الضَّآلِّيۡنَ ۝[1] قبل تم یقیناً محض ناواقفوں میں تھے۔

سب ایک ساتھ واپس آتے ہیں، ایک ساتھ متحرک ہوتے ہیں اور ایک ساتھ ساکن ہوتے ہیں،

ثُمَّ اَفِيۡضُوۡا مِنۡ حَيۡثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسۡتَغۡفِرُوا اللّٰهَ‌ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ۝[2]

ہاں تو تم وہاں جاکر واپس آؤ جہاں سے لوگ واپس آتے ہیں اور اللہ سے مغفرت طلب کرو، بیشک اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

منیٰ میں بھی قیام ایک ساتھ کرتے ہیں اور نحر (قربانی) حلق (سر منڈانا) اور رمی (شیطان کو پتھر مارنا) کے سارے کام ایک ساتھ انجام دیتے ہیں،

جب تک حج باقی ہے (اور وہ انشاء اللہ قیامت تک باقی رہے گا) اس وقت تک مسلمانوں کو یہ قومیتیں اور غیر اسلامی دعوتیں نگل لینے میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتیں، اور وہ ان کا لقمۂ تر نہیں بن سکتے اور اپنے اپنے ملکوں میں (جن سے ان کو اپنے فطری جذبات اور قومی عصبیت کے لحاظ سے فطری محبت ہوتی ہے) کوئی ایسا نیا کعبہ بنانے میں کامیاب نہیں ہوسکتے جو حج کی جگہ لے لے اور سارے مسلمان اس کے گرد جمع ہو جائیں، یہ قبلہ ہمیشہ ایک ہی رہے گا جہاں مشرق و مغرب اور عرب و عجم کے تمام رہنے والے اپنا رخ کریں گے، یہ بیت اللہ بھی ہمیشہ ایک رہے گا جس کے حج کے لئے ہندی و افغانی اور یورپی و امریکی مسلمان سب برابر جاتے رہیں گے،

وَاِذۡ جَعَلۡنَا الۡبَيۡتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمۡنًا ؕ وَاتَّخِذُوۡا مِنۡ مَّقَامِ اِبۡرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ[3]

اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب ہم نے خانۂ (کعبہ) کو لوگوں کے لئے ایک مقام رجوع اور مقام امن مقرر کیا اور مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ بنالو۔

روئے زمین کے ایک ایک دور افتادہ اور دشوار گزار گوشہ سے لوگ کھنچ کھنچ کر یہاں پہونچیں گے اس دن کیلئے منتیں مانیں گے اور دن گنیں گے اور اس دربار میں حاضری کو اپنی سب سے بڑی تمنا اور سب سے بڑی سعادت

---

[1] سورہ بقرہ — ۱۹۸ [2] سورہ بقرہ — ۱۹۹ [3] سورہ بقرہ — ۱۲۵

و خوش نصیبی سمجھیں گے،

حج کے منافع

حج میں اس کے علاوہ بھی بہت سے فوائد و منافع ہیں جن میں بہت سی باتوں سے ہم واقف ہیں اور بہت سی باتوں سے ناواقف، اور شاید جن چیزوں کا ہمیں علم نہیں وہ ان چیزوں سے کہیں زیادہ ہیں جن کو ہم جانتے اور سمجھتے ہیں، اور جن کی طرف حکمائے اسلام اور علمائے راسخین نے اپنی کتابوں میں توجہ دلائی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ[1] تاکہ اپنے فوائد کے لئے آموجود ہوں۔

اس موقع پر "منافع" کو مطلق بولا گیا ہے اور اس کے لئے نکرہ کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے اس بلیغ تعبیر سے منافع کے کثرت اور تنوع اور ہر دور میں اس کی بدلتی ہوئی قسموں، راستوں، طریقوں، اور پہلوؤں کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے جن کا شمار ناممکن ہے[2]،

---

[1] سورہ حج — ۲۸ [2] حج بلاشبہہ ایک ایسا موسم اور ایسی تقریب ہے جس میں پورے عالم اسلام بلکہ ساری دنیا کے مسلمان جمع ہو کر اس کے مختلف فوائد اور منافع میں حصہ لیتے ہیں وہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے اہم مسائل پر مفید تبادلہ خیال کر سکتے ہیں ایک دوسرے سے تعارف حاصل کر سکتے ہیں اور اپنے مشترک مفاد کے لئے ایک پلیٹ فارم پر جمع بھی ہو سکتے ہیں لیکن حج کی یہی حکمت سب سے بڑی افادیت نہیں ہے جیسا کہ بعض جدید اہل قلم کی تحریروں اور بیانوں سے اندازہ ہوتا ہے، وہ صرف ایک سیاسی کانفرنس بھی نہیں جیسا کہ بہت سے معاصر اہل فکر و اہل سیاست اور مسلمانوں کے رہنما اور زعماء اس کی یہی تصویر پیش کرنے کے عادی ہیں اگر حج کا مقصد یہی ہوتا تو حج میں سکون کی ایک فضا ہوتی اور زیادہ تر ایک جگہ قیام ہوتا تاکہ اس سے غور و فکر، مطالعہ و جائزہ، بحث و مباحثہ، اور تبادلۂ خیال میں سہولت ہو لیکن اس کے برعکس یہ ایک مستقل سفر اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہنے کا ایسا سلسلہ ہے جس میں ان چیزوں کا موقع ہی نہیں، اس کے علاوہ اول الذکر صورت میں حج کی یہ دعوت صرف علماء و زعماء و اہل فکر و تدبیر اور مسلمانوں کے طبقۂ خواص تک محدود ہونی چاہیئے اس لئے کہ وہی لوگ اس طرح کے مسائل حل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اس قسم کے متفرق منافع بلاشبہہ حج کے ثمرات اور

(باقی حاشیہ صفحہ ۳۳۱ پر)

اسلامی زندگی کا صحیح نمونہ پیش کرنا بلد امین کی ذمہ داری ہے

چونکہ حج ملت کا ایک ایسا سالانہ اجتماع ہے جس میں سب مسلمان ایک خاص عقیدہ، مقصد، اور جذبہ کے ساتھ بہترین دینی وروحانی فضا اور ایمانی ماحول میں ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا ہوتے ہیں اور اس سے نئی قوت اور نئی روح حاصل کرتے ہیں ان کے عقائد میں ان عجمی تہذیبوں اور اجنبی فلسفوں کے اثر سے یا اپنے پڑوسی ممالک اور قوموں کی تقلید کے نتیجہ میں جو کجی اور ان کے طرز زندگی اور عادات و اطوار میں جو فساد یا کسی قسم کی کوئی کمزوری پیدا ہو جاتی ہے وہ اس کی روشنی میں اس کی اصلاح کرتے ہیں اور ان کو اس کا موقع حاصل ہوتا ہے کہ وہ دین کو اس "چشمۂ صافی" سے اخذ کر سکیں جو ہر قسم کی آلودگی، کج روی، اور تحریف سے پاک اور محفوظ ہے، اس لئے عقل و منطق کی رو سے بھی اور اسلام کی روح اور حج کی حکمت کے لحاظ سے بھی یہ ضروری ہے کہ یہ بلد امین جس سے یہ سارا حج متعلق ہے

(باقی حاشیہ صفحہ ۳۳۰ کا) اس کی برکتوں میں سے ہیں لیکن حج محض انہی مقاصد کی تکمیل کے لئے نہیں ہے وہ عامی و جاہل ہر قسم کے مسلمان پر فرض ہے بشرطیکہ وہ استطاعت رکھتا ہو، اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے،

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا ۚ وَمَن كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ ○ (سورہ آل عمران - ۹۷)	اور لوگوں کے ذمہ ہے حج کرنا اللہ کے لئے اس مکان کا (یعنی) اس شخص کے ذمہ جو وہاں تک پہنچنے کی طاقت رکھتا ہو، اور جو کوئی کفر کرے تو اللہ سارے جہاں سے بے نیاز ہے،

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، کہ "جس کے پاس زاد راحلہ یعنی اتنا سامان سفر ہو جو بیت اللہ تک پہونچا سکے پھر بھی وہ حج نہ کرے تو وہ چاہے یہودی ہو کر مرے یا نصرانی"

اس کے علاوہ اگر حج صرف ان ہی چیزوں کے لئے ہوتا تو اس کی شکل ہی دوسری ہونی چاہیئے تھی اور اس کو ایسے دور دراز اور "صحرائی" علاقہ میں نہ ہونا چاہیئے تھا،

حقیقی، سچی، نکھری اور ڈھلی ہوئی اسلامی زندگی کی امانت ہمیشہ محفوظ رکھے اور اس کے تمام پہلوؤں اور تمام خصوصیات اور مظاہر کی تصویر اس طرح پیش کر سکے کہ ہر زائر اور حاجی (خواہ اس کو بہت محدود وقت ملا ہو) اس فرق و امتیاز کو اچھی طرح محسوس کرے بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں اس کا ذائقہ چکھ لے، اور اس کو چھو کر اور برت کر دیکھ لے، اللہ تعالیٰ نے اس مبارک شہر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حج کا مرکز بنایا ہے اور ہر مسلمان کی جائے پناہ اور مقام امن قرار دیا ہے، وہ اس شہر میں بجا طور پر یہ تصور لے کر آتے ہیں کہ وہ اس شہر میں جا رہے ہیں جو تقدیس و پاکیزگی کا سرچشمہ اور اسلام کا روحانی پایۂ تخت ہے اور اس سے دین نکل کر سارے عالم میں پھیلا ہے، ایک عام مسلمان جو مرکز اسلام سے بہت دور رہتا ہے یہاں پہونچ کر قدرتی طور پر ہر چیز کو حجت سمجھتا ہے، جو بات اس کے کان میں پڑتی ہے اور اس کی آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہی اس کے نزدیک سب سے بڑا صحیح اور آخری معیار ہے اس لئے کہ عام مسلمانوں کے لئے اہل مکہ اور اہلِ مدینہ کے عمل سے بڑھ کر اب بھی کسی کا عمل دلیل و حجت اور معیار صداقت نہیں۔

یہ انسانی فطرت ہے جو منطق و فلسفہ کی موشگافی یا خطابت و بلاغت کے زور سے بدل نہیں سکتی، کوئی مذہب یا تہذیب ہو اس کے ماننے والے ہمیشہ اس کے مرکز پر نظر رکھتے ہیں اور اسی کی بات کو حجت اور قولِ فیصل سمجھتے ہیں، تہذیب و قانون اور زبان و ادب ہر شعبہ میں بھی یہی چیز کار فرما ہے، چنانچہ لغتِ قریش اول درجہ کی قرار دی گئی، اس کے بعد اہل بادیہ کی زبان ہے جو تمام اہلِ عرب اور ان کے لہجوں، محاوروں، تعبیروں اور اسالیب کلام کے لئے حجت ہے، اسی طرح اہلِ مدینہ کا عمل مالکی مذہب میں حجت سمجھا جاتا تھا، اندلس کے علمی اور ثقافتی عروج کے زمانہ میں اہلِ قرطبہ کا عمل مغرب کے بہت سے فقہا کے نزدیک معیار تھا اور وہ علماء وقضاۃ کا مرکز بن گیا تھا، اس کے علاوہ لوگ ہمیشہ سے اپنے اپنے ملکوں کے دارالحکومت کو قابل حجت اور تہذیب کا آئیڈیل سمجھتے ہیں، اس کی پیروی و تقلید میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کو فیشن، تمدن، معاشرت کے اصول اور زندگی کے طور طریقوں کا سب سے بڑا مرکز سمجھتے ہیں،

چنانچہ دعوت و اصلاح کا کام کرنے والوں کے لئے وہ وقت سخت کشمکش اور آزمائش کا ہوتا ہے جب حاجی مرکز اسلام سے واپس آنے کے بعد یہ کہتے ہیں کہ ہم نے تو وہاں اس کے خلاف دیکھا ہے[1]،

بلدامین کو اپنی خصوصیات برقرار رکھنا چاہیئے

اس سے زیادہ نازک اور اہم پہلو یہ ہے کہ بلدامین کو (تاریخ کے ہر دور اور تہذیب و تمدن اور معیار زندگی کے نشیب و فراز میں) اس سادگی و جفاکشی اور زہد و احتیاط کو کسی نہ کسی درجہ میں ضرور برقرار رکھنا چاہیئے جو دنیا کے کونہ کونہ سے آنے والے حجاج کو اس فضا اور اس ماحول سے کچھ قریب کر دے جس فضا اور ماحول میں قرن اول کے مسلمان مناسک حج ادا کرتے تھے، اس ماحول میں آکر ان کو محسوس ہو کہ وہ ایک نئے عالم میں قدم رکھ چکے ہیں، اور ایک بالکل نئے ماحول اور نئی فضا میں سانس لے رہے ہیں، یہ احساس و شعور ان کو گذشتہ زندگی کے سایہ سے ہٹا کر کچھ نئی چیزیں اور نئی قدریں قبول کرنے اور نئی دولت حاصل کرنے پر آمادہ کر سکے گا اور ان کو وہ روحانی مسرت نصیب ہوگی جو ان کو اپنے گھر اور اپنے مستقر میں نہیں مل سکتی تھی، اب اگر بیت اللہ اور حرم شریف تو اپنی قدیم وضع پر باقی رہے اور اس کے گرد و پیش کی ہر چیز بالکل تبدیل ہو جائے اور یہ بلدامین اور اس کے قریبی شہر یورپ و امریکہ کا ایک ٹکڑہ معلوم ہونے لگیں، اور مغربی تہذیب اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں اور اپنی تمام خرافات اور آلودگیوں کے ساتھ یہاں بھی مسلط ہو جائے، اور حاجی جس کو شرع کی زبان میں (الشعث التفل) یعنی "غبار آلود اور پراگندہ بال" کہا گیا ہے، جدید تہذیب کی تن آسانی اور وسائل کی فراوانی سے دل کھول کر لطف اندوز ہونے لگے، راحت و تنعم اور آسائش و آرائش کی بھرپور زندگی گزارنے لگے، جدید سے جدید تر سہولتوں اور وسائل میں ہر وقت ڈوبا رہے تو وہ کوئی ایسی نئی اور طاقتور چیز محسوس نہ کر سکے گا جو اس کی زندگی میں انقلاب لانے کی صلاحیت رکھتی ہو اور اس کے اندر سچی روحانیت پیدا کر سکتی ہو،

---

[1] یہ اس تقریر کا اقتباس ہے جو ۱۳۸۴ھ میں رابطہ عالم اسلامی کے اجلاس منعقدہ مکہ میں مصنف نے کی تھی

اسی لئے حج کو جہاد ہی کی ایک قسم قرار دیا گیا ہے، بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ "سب سے افضل اور سب سے اچھا جہاد حج مقبول ہے" حضرت عائشہؓ ہی سے ایک اور روایت میں ہے، فرماتی ہیں کہ "میں نے کہا یا رسول اللہ ہم جہاد کو افضل عمل سمجھتے ہیں تو ہم کیوں نہ جہاد ہی کریں، آپ نے فرمایا لیکن افضل جہاد حج مبرور (مقبول) ہے" حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضورؐ سے روایت کرتے ہیں کہ "حج کا سامان اور تیاری کرو اس لئے کہ وہ بھی ایک جہاد ہے"

اس لحاظ سے اگر مکہ ہی پوری طرح بدل جائے اور مغربی تہذیب کو اس کی پوری معاشرت اور وسائل کے ساتھ قبول کرلے اور حج میں راحت و آسائش کے وہ سارے انتظام مہیا ہو جائیں جو صرف یورپ کے بڑے بڑے شہروں میں پائے جاتے ہیں تو حجاج کو بجا طور پر ایک قسم کا روحانی خلا، ایک طرح کی بے کیفی و بے لطفی اور حج کے فوائد و اثرات میں کھلا ہوا انحطاط محسوس ہوگا،

حج کو زیادہ سے زیادہ موثر اور مفید بنانے کیلئے شریعت کے حکیمانہ انتظامات

وحی الٰہی اور شریعت آسمانی نے حج کیلئے ایک ایسی سازگار فضا اور موافق ماحول فراہم کر دیا ہے جس میں سنجیدگی اور عزم خود بخود پیدا ہوتا ہے اور دل و دماغ بیدار ہونے لگتے ہیں اس نے اس کو عبادت و روحانیت اور تقدس کے حصار سے گھیر دیا ہے، حج کا سفر اکثر لوگوں کے لئے ایک طویل اور دور دراز کا سفر ہے جس میں حاجی کو مختلف ملکوں، مختلف فضاؤں اور طرح طرح کے دلفریب مناظر اور فتنہ انگیز ترغیبات سے گزرنا ہوتا ہے، مختلف مشغولیتیں اور کاروباری فکریں اس کو گھیرے رہتی ہیں، اس کی مدت کبھی کم ہوتی ہے کبھی زیادہ، وہ نئے نئے شہر میں داخل ہوتا ہے اور مختلف ملکوں کے لوگوں سے ملتا جلتا ہے ان میں مرد بھی ہوتے ہیں اور عورتیں بھی، جوان بھی اور بوڑھے بھی، کبھی وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ حج کرتا ہے اور اس کے بیوی بچے ہر جگہ اس کے ساتھ ہوتے ہیں، یہ سب چیزیں ایسی ہیں جو حج کے تقدس اور رعب اور اس کی عظمت و شان اور عبادت و جہاد کی اسپرٹ کو ختم کر سکتی تھیں اس صورت میں اس کا اندیشہ تھا کہ یہ سفر بھی ایک عام سفر یا پکنک

اور تفریح بن جاتا، جہاں حاجی سیاح کی طرح جاتا اور تاریخی مقامات کی سیر کے بعد اسی طرح خالی ہاتھ واپس آتا،

اس خطرہ کے سد باب کیلئے شریعت نے حج کو سنجیدگی اور تقدس کا ایک ایسا رنگ عطا کیا ہے جو کبھی اتر نہیں سکتا، اس نے اس کے چاروں طرف ایسی فصیل کھڑی کر دی ہے اور ایسی حفاظتی خندقیں کھود دی ہیں جن کی وجہ سے غفلت وذہول اور لایعنی اور فضول چیزوں کو اس کے اندر داخل ہونے کا موقع ہی نہیں ہے اس کے لئے اس نے ایسے حکیمانہ اور دقیق احکام دئے ہیں جو زندگی پر حج کی گرفت کو مضبوط کرنے اور اس کو اصلاح و تربیت کے ایک رکن اور تقرب الی اللہ کے ذریعہ کی حیثیت سے باقی رکھنے کے پوری طرح ضامن اور ذمہ دار ہیں،

اس نے سب سے پہلے اس کو اسلام کا چوتھا رکن قرار دیا ہے اور جو اس کی شرطیں پوری کر سکے اس کے لئے اس کو ایک ایسا فریضہ قرار دیا ہے جس سے نہ کسی حالت میں صرف نظر کیا جا سکتا ہے نہ اس کا کوئی بدل ممکن ہے،

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ	اور لوگوں کے ذمہ ہے حج کرنا اللہ کے لئے اس مکان کا (یعنی)
إِلَيْهِ سَبِيلًا ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ	اس شخص کے ذمہ جو وہاں تک پہنچنے کی طاقت رکھتا ہو،
الْعٰلَمِينَ ○[1]	اور جو کوئی کفر کرے تو اللہ سارے جہاں سے بے نیاز ہے

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جس کے پاس اس قدر زاد و راحلہ ہو جو اس کو بیت اللہ تک پہونچا سکے پھر بھی وہ حج نہ کرے تو وہ چاہے یہودی ہو کر مرے یا نصرانی"

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے" اس بات کی شہادت کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) اس کے رسول ہیں، اور نماز قائم کرنا زکوٰۃ دینا، رمضان کے روزے رکھنا، اور حج کرنا جس کو اس کی استطاعت ہو،،

لسان نبوت نے حج کی فضیلت اور اللہ تعالےٰ کے یہاں اس کے بلند درجہ کا بہت اہتمام اور تاکید

---

[1] سورہ آل عمران ۔ ۹۷

کے ساتھ ذکر کیا ہے اس لئے کہ اسی سے دل میں طلب و شوق اور ایمان و احتساب کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور جب تک یہ دونوں چیزیں کسی عمل کے ساتھ وابستہ نہ ہوں اور اس کا محرک نہ بنیں اس عمل میں اللہ کے نزدیک کوئی قیمت نہیں، حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "حج مبرور کا جنت سے کم کوئی بدلہ نہیں" حضرت ابوہریرہؓ سے ایک دوسری حدیث میں مروی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جس نے اللہ کے لئے حج کیا اور بدکلامی و بدگوئی اور فسق و فجور سے اپنے کو محفوظ رکھا تو وہ ایسا ہو جائیگا جیسا اس دن تھا جس دن ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا۔ عبداللہ بن مسعودؓ حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں آپ نے فرمایا کہ "حج اور عمرہ کے درمیان متابعت کرو اس لئے کہ یہ دونوں گناہوں کو اس طرح دور کرتے ہیں جس طرح بھٹی لوہے یا سونے چاندی کے میل کو صاف کرتی ہے اور حج مبرور کا بدلہ جنت سے کم کوئی چیز نہیں اور جب مومن احرام میں ہوتا ہے تو سورج غروب ہونے کے ساتھ اس کے تمام گناہ بھی زائل ہو جاتے ہیں" حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "کوئی دن ایسا نہیں جس میں اللہ تعالے اپنے بندوں کو اتنی بڑی تعداد میں جہنم سے آزاد کرتا ہو جتنا عرفہ کے دن[1]"

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ کون سا عمل افضل ہے، آپ نے فرمایا "اللہ اور اس کے رسول پر ایمان، عرض کیا گیا اس کے بعد کیا، فرمایا اللہ کے راستہ میں جہاد، دریافت کیا گیا اس کے بعد کون سا، فرمایا حج مبرور[2]"

ان دورس اور حکیمانہ قوانین میں میقات حج کا تعین بھی شامل ہے، اس سے حاجی میں ایک نیا شعور اور فکری و روحانی بیداری پیدا ہوتی ہے: اس کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ شاہی دربار سے قریب ہو گیا ہے اور اس کی مقدس اور محفوظ حدود میں داخل ہو گیا ہے، اگر یہ مواقیت نہ ہوں تو حجاج بیت اللہ تک بلا کسی شعور و احساس کے اس طرح پہونچ جائیں جس طرح دیہاتی اور گنوار لوگ سلاطین و امراء کے دربار میں بلا سمجھے بوجھے

---

[1] مسلم [2] متفق علیہ

گھس جاتے ہیں، اور ذلت کے ساتھ دھکے دے کر نکال دیے جاتے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ مواقیت کی حکمت اور مختلف جہات سے آنے والوں کے لئے اس کی خاص جہت کے تعین کا راز بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"مواقیت کا اصل راز یہ ہے کہ چونکہ ایک طرف مکہ میں آشفتہ حال اور پراگندہ بال حاضر ہونے کی تاکید ہے، دوسری طرف اپنے شہر سے احرام باندھ کر سفر کرنے میں کھلی ہوئی دشواری ہے، کسی کا راستہ ایک ماہ کا ہے، کسی کی مسافت دو مہینے یا اس سے بھی زیادہ کی ہے، اس لئے مکہ کے اردگرد خاص مقامات متعین کر دیئے گئے ہیں جہاں سے احرام باندھنا ضروری ہے۔ اس کا لحاظ بھی رکھا گیا ہے کہ یہ مقامات معروف ہوں اور عام گزرگاہوں کی حیثیت سے مشہور ہوں، اہل مدینہ کے لئے جو میقات (ذوالحلیفہ) ہے وہ نسبتاً سب سے زیادہ دور ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مدینہ وحی کا مرکز، ایمان کا قلعہ اور دار الہجرت ہے، اور پہلا شہر ہے جس نے اللہ اور اس کے رسول کی دعوت پر ایمان قبول کیا، اس لحاظ سے اس کے باشندے اس کے زیادہ حقدار ہیں کہ اعلاء کلمۃ اللہ میں سب سے زیادہ کوشاں اور عبادات میں سب سے آگے رہیں جو اثنا طائف اور یمامہ وغیرہ کے برعکس سب سے پہلے ایمان لانے والے اور سب سے زیادہ اخلاص کا ثبوت دینے والے شہروں اور قریوں میں اس کا شمار ہے، اس لئے اس کے میقات کی دوری میں کوئی مضائقہ نہیں"[1]

جہاں تک احرام کا تعلق ہے وہ حاجی میں شعور اور بیداری پیدا کرنے اور غفلت و ذہول دور کرنے کے لئے ہے، وہ اس کے اندر یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ وہ کسی بڑی مہم کو سر کرنے کے لئے جا رہا ہے اور سب سے مقدس شاہی دربار میں حاضر ہو رہا ہے، اس کے علاوہ اس میں مظاہر، اور مصنوعی آرائش و زیبائش سے بالکلیہ

---

[1] حجۃ اللہ ج ۲ ص ۴۲

آزادی ہے، اس لحاظ سے یہ احرام حج کے لئے وہ حیثیت رکھتا ہے جو نماز کے لئے تکبیر تحریمہ، جو نمازی کو ایک نئی فضا میں پہونچا دیتی ہے، اور آزادی سے نکال کر تھوڑی دیر کے لئے قید و پابندی میں ڈال دیتی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں:-

"حج و عمرہ میں جو احرام باندھا جاتا ہے وہ نماز کی تکبیر تحریمہ کی طرح ہے، وہ اخلاص و تعظیم اور عزیمتِ مومن کی ایک ظاہری و عملی صورت آرائی ہے، اس کا مقصد لذتوں اور عادتوں اور آرائش و زیبائش کی تمام قسموں کو ترک کر کے نفس کو حقیر اور اللہ تعالےٰ کے سامنے سجدہ ریز و سرنگوں بناتا اور اللہ تعالےٰ کے لئے آشفتہ سری، پریشان حالی اور کلفت و تعب کا مظاہرہ کرنا ہے"[1]

اسی طرح احرام سے باہر آنے اور اس کے قیود و احکام سے رہائی پانے کے لئے بھی ایک خاص طریقہ مقرر ہے جو نفس کو متنبہ اور بیدار رکھتا ہے، ایسا نہیں ہوتا کہ حاجی احرام سے بالکل اچانک باہر آجائے اور تمام چیزوں سے فوراً لطف اندوز ہونے لگے، وہ ایک خاص عمل اور نیت و ارادہ کے ساتھ احرام اتارتا ہے، وہ نماز میں سلام کے ذریعہ اس کی فضا سے باہر آتا ہے اور احرام میں حلق (یعنی سر منڈوانے) کے ذریعہ،

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں:-

"حلق کا راز یہ ہے کہ اس سے احرام سے نکلنے کا ایک ایسا طریقہ متعین ہوتا ہے جو وقار کے منافی نہیں ہے، اگر لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جاتا تو ہر شخص جو طریقہ چاہتا اختیار کر لیتا، اس کے علاوہ اس میں پراگندہ بالی اور ژولیدہ سر ہونے کی حالت کا خاتمہ ہے جو پہلے مطلوب تھی، یہ ایسا ہے جیسا نماز میں سلام پھیرنا"[2]

---

[1] حجۃ اللہ ج ۲ ص [illegible]   [2] حجۃ اللہ البالغۃ ج ۲ ص [illegible]

اس کے علاوہ حج کو مفید و موثر بنانے کے لئے جو اقدامات و انتظامات کئے گئے ہیں ان میں تلبیہ بھی داخل ہے جس کی شریعت میں بہت ترغیب آئی ہے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے زیادہ سے زیادہ بلند آواز کے ساتھ تلبیہ کو مستحسن قرار دیا ہے، آپ سے دریافت کیا گیا کہ

"کون سا حج افضل ہے"؟ آپ نے فرمایا "العج والثج"[1]

نفس کو بیدار و ہشیار اور مقاصد حج سے آشنا اور آگاہ رکھنے میں اور اس کو ایمان و محبت، ذوق و شوق اور اللہ تعالےٰ کے دربار عالی میں جبہہ سائی اور ناصیہ فرسائی کے جذبات و کیفیات سے مست و سرشار کرنے میں تلبیہ کا بڑا حصہ ہے، اس سے حاجی کے جسم و جان اور اعصاب میں ایمان و روحانیت کا کرنٹ اس طرح طاقت اور تیزی کے ساتھ دوڑ جاتا ہے جس طرح برقی لہر تاروں میں، وہ اس کو اسلام کے اس رکن عظیم (حج) کے لئے تیار کرتا ہے جس کی طلب و استعداد، احساس و شعور اور اہتمام و تیاری کا موقع اس کو بعض اوقات نہیں ملتا، جب وہ "لبیك اللھم لبیك، لبیك لا شریك لك لبیك، ان الحمد والنعمۃ لك والملك، لا شریك لك"، کی صدا لگاتا ہے تو حج کے بلند مقاصد اور اس کی روح اور اسپرٹ اس کے سامنے پوری رعنائی و دلربائی کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے، صبر و ضبط کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور محبت و شوق کا ساغر بے ساختہ چھلکنے لگتا ہے، توحید کا شعلہ اس کی رگوں میں آتش سیال کی طرح دوڑ جاتا ہے، اور اس کے سارے وجود کو بے قرار و سیماب وش بنا دیتا ہے اور وہ حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ اور سیدنا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کرام اور حاملین دعوت کے ساتھ فکری و روحانی طور پر وابستہ ہو جاتا ہے اور ان کی جماعت میں گھل مل جاتا ہے۔

اللہ تعالےٰ نے حج کو دو حرمتیں یا دو عزتیں اور خصوصیتیں عطا کی ہیں، زمان کی حرمت اور مکان کی حرمت، اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس رکن عظیم کی عظمت و جلال اور اپنی ذمہ داری اور فرض منصبی کا استحضار اور احساس

---

[1] روایت حضرت ابن عمرؓ (سنن ابن ماجہ)

حاجی کے اندر پوری قوت کے ساتھ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اپنی تمام نقل و حرکت اور قیام و سفر میں ذکی الحس، حاضر دماغ اور بیدار و ہوشیار رہتا ہے اور ایک لمحہ کے لئے بھی اس روحانی فضا سے غافل اور بے پرواہ نہیں ہوتا جو اس کے گرد و پیش میں محیط ہوتی ہے،

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِندَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ ۚ فَلَا تَظْلِمُوا فِيهِنَّ أَنفُسَكُمْ [۱]

بیشک مہینوں کا شمار اللہ کے نزدیک بارہ ہی مہینہ ہیں کتاب الٰہی میں (اس روز سے) جس روز کہ اس میں آسمان اور زمین پیدا کئے اور ان میں سے چار (مہینہ) حرمت والے ہیں یہی دین مستقیم ہے سو تم ان (مہینوں) کے باب میں اپنے اوپر ظلم نہ کرو،

دوسری جگہ ارشاد ہے،

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ ۖ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ ۚ [۲]

اور آپ سے حرمت والے مہینہ کی بابت (یعنی) اس میں قتال کی بابت دریافت کرتے ہیں آپ کہہ دیجئے کہ اس میں قتال کرنا بڑا (گناہ) ہے،

حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "بیشک زمانہ اپنی اصل شکل پر لوٹ گیا ہے جس دن اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین پیدا کئے ان میں چار حرمت والے مہینے ہیں، ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور رجب مضر جو جمادی اور شعبان کے درمیان ہے۔" [۳]

جہاں تک مکان کی حرمت کا تعلق ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے،

إِنَّمَا أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ رَبَّ هَٰذِهِ الْبَلْدَةِ

(آپ کہدیجئے) مجھے تو یہی حکم ملا ہے کہ میں عبادت کروں

---

[۱] سورہ توبہ ۳۶ [۲] سورہ بقرہ ۲۱۷ [۳] مسلم

الَّذِیْ حَرَّمَهَا وَلَهٗ كُلُّ شَیْءٍ وَّاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝[۱]

اس شہر کے مالک (حقیقی) کی جس نے اسے محترم بنایا ہے اور سب چیزیں اسی کی ملک ہیں، اور مجھے حکم ملا ہے کہ میں فرماں بردار رہوں۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر فرمایا کہ "آج سے ہجرت نہیں لیکن جہاد اور نیت باقی ہے اور جب تمہیں دین کیلئے پکارا جائے تو فوراً نکل کھڑے ہو" آپ نے فتح مکہ کے دن یہ بھی ارشاد فرمایا کہ "اس شہر کو اللہ تعالےٰ نے اسی دن سے حرمت بخشی ہے جس دن اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اس لئے اللہ تعالےٰ کی یہ حرمت اس کے ساتھ قیامت تک وابستہ ہے، مجھ سے پہلے بھی کسی کے لئے اس میں جنگ جائز نہیں ہوئی اور میرے لئے بھی صرف دن کی ایک گھڑی کے لئے اس کی رخصت ملی ہے، اب یہ قیامت تک کے لئے اللہ تعالےٰ کی حرمت کے ساتھ حرام ہے، نہ اس میں کوئی کانٹا یا تنکا توڑا جا سکتا ہے، نہ شکار ہنکایا جا سکتا ہے نہ اس کی گری ہوئی چیز اٹھائی جاسکتی ہے؛ ابن عباسؓ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ کیا اذخر[۲] بھی؟ اس لئے کہ لوگوں کے لئے اس کی ضرورت پڑتی ہے، آپ نے فرمایا کہ ہاں سوائے اذخر کے"،

حرم میں معصیت یوں بھی سخت چیز ہے لیکن بعض علماء نے یہ استدلال کیا ہے کہ حرم میں ارادۂ معصیت بھی معصیت میں داخل ہے بخلاف دوسری جگہوں کے وہ اس کے ثبوت میں یہ آیت پیش کرتے ہیں:

وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۢ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝[۳]

اور جو کوئی بھی اس کے اندر کسی بے دینی کا ارادہ ظلم سے کرے گا ہم اسے عذاب دردناک چکھائیں گے۔

ابن کثیر نے لکھا ہے کہ یہ حرم کی خصوصیت ہے کہ یہاں ظلم کا ارادہ کرنے والا بھی قابل مواخذہ اور لائق عتاب ہے خواہ وہ اس ارادہ کو عملی جامہ پہنا سکے یا نہیں۔

زمان و مکان کی حرمت کے ساتھ احرام کی حرمت کے بھی بہت سے احکام اور خصوصی آداب ہیں مثلاً

---

[۱] سورہ نمل ۹۱ [۲] ایک خوشبودار گھاس کا نام ہے، [۳] سورہ حج ۲۵

حالت احرام میں شکار کی ممانعت، اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَأَنتُمْ حُرُمٌ ؕ [ا] — اے ایمان والو شکار کو مت مارو جب کہ تم حالتِ احرام میں ہو،

دوسری جگہ آتا ہے،

أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ ۖ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ۝ [۲] — تمہارے لئے دریائی شکار اور اس کا کھانا جائز کیا گیا تمہارے نفع کے لئے اور قافلوں کے لئے اور تمہارے اوپر جب تک تم حالتِ احرام میں ہو خشکی کا شکار حرام کیا گیا، اللہ سے ڈرتے رہو جس کے پاس جمع کئے جاؤ گے،

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں :-

"ان اشیاء کی ممانعت "محرم یعنی احرام باندھنے والے کے لئے اس لئے ہے کہ تذلل، ترک تجمل، پراگندہ بال اور غبار آلود ہونے کی کیفیت حاصل ہو، اور اللہ تعالےٰ کی عظمت اور خوف کا غلبہ اور مواخذہ کا ڈر اس پر غالب رہے، اور وہ اپنی خواہشات اور دلچسپیوں میں پھنس کر نہ رہ جائے، ان ممنوعات میں شکار اس لئے شامل ہے کہ وہ بھی ایک قسم کے توسع میں داخل ہے اور دلچسپی اور تفریح خاطر کی چیز ہے۔" [۳]

حج کا سفر اکثر اوقات ایک طویل سفر ہوتا ہے، اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے۔

وَأَذِّن فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا — اور لوگوں میں حج کا اعلان کردو لوگ تمہارے پاس پیدل

[ا] سورہ مائدہ ۹۵ [۲] سورہ مائدہ ۹۶ ان دونوں آیتوں کی تفسیر سے مستنبط ہونے والے فقہی احکام و مسائل نیز اس کے اختلاف کو جاننے کے لئے تفسیر اور احکام قرآن کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے۔

[۳] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۳۲

وَعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ [۱] بھی آئیں گے اور دُبلی اونٹنیوں پر بھی، جو دور دراز راستوں سے پہنچی ہوں گی۔

اس میں انسان کو مختلف حالات پیش آتے ہیں، مختلف لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے، نئے نئے لوگوں کی طویل عرصہ تک صحبت و رفاقت رہتی ہے، طرح طرح کے معاملات سامنے آتے ہیں اور یہ سب چیزیں بہت سے ممنوعات، غلط قسم کی ترغیبات اور ایک دوسرے کے ساتھ کشمکش اور لڑائی جھگڑے کی حد تک پہونچا سکتی ہیں، حاجی اس سفر میں بہت سی چیزوں سے تنگ دل ہوتا ہے، بعض اوقات کسی ناگوار بات سے اس کی طبیعت میں سخت اشتعال پیدا ہوتا ہے، اور اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگتا ہے، اور اس کے نتیجہ میں بعض اوقات اس سے ایسی باتیں سرزد ہو جاتی ہیں جن کو وہ اپنے وطن اور اپنے گھر میں بھی برا سمجھتا تھا اور حتی الامکان ان سے بچتا تھا، وہ بعض ایسی معصیتوں اور اخلاق قبیحہ میں گرفتار ہو جاتا ہے جو حج کی روح اور مقاصد کے یکسر منافی ہیں، حج میں ان چیزوں کی ممانعت خاص طور پر اسی لئے آئی ہے کہ اس میں اس کا احتمال اور بڑھ جاتا ہے اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے:۔

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۗ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ۗ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۚ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ [۲]

ایام حج کے (چند) مہینے معلوم ہیں، جو کوئی ان میں اپنے اوپر حج مقرر کرے تو پھر حج میں نہ کوئی فحش بات ہونے پائے اور نہ کوئی بے حکمی اور نہ کوئی جھگڑا، اور جو کوئی بھی نیک کام کرو گے، اللہ کو اس کا علم ہو کر رہے گا، اور زاد راہ لیا کرو، اور بہترین زاد راہ تو تقویٰ ہے، سو اے اہل فہم! میرا ہی تقویٰ اختیار کئے رہو۔

---

[۱] سورہ حج ۲۷ [۲] ان الفاظ کی تشریح کے لئے احکام و تفسیر کی کتابیں دیکھی جائیں۔

[۲] سورہ بقرہ ۹۷۔

ان قوانین، احکام اور تعلیمات نے (جن کا تعلق قلب و جوارح، نیت و عمل اور زمان و مکان سے براہ راست ہے) حج کو تقدس و طہارت، تورع و زہد، مراقبہ و حضور، محاسبۂ نفس اور مجاہدہ و جہاد کی ایک ایسی خلعت عطا کی ہے جو دوسرے مذہبوں اور ملتوں کے اس قسم کے اعمال میں ہرگز نہیں ملتی، ان کی وجہ سے نفس انسانی، اخلاق عامہ اور نظامِ زندگی پر جو اثرات پڑتے ہیں اس کو دیکھ کر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث قدسی کی تصدیق ہوتی ہے۔

مَنْ حَجَّ لِلّٰهِ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ[1]۔

جس نے خالص اللہ کے لئے حج کیا اور پھر دوران حج نہ بری بات زبان سے نکالی نہ فسق و فجور اختیار کیا تو ایسا ہو کر لوٹا جیسا کہ اس کی ماں نے اسے جنا تھا۔

دوسرے مذاہب میں حج و زیارت اور اسلامی حج سے اس کا موازنہ

دنیا کی کوئی قوم اور ملت ایسی نہیں جو کچھ نہ کچھ مقدس مقامات نہ رکھتی ہو اور اس کے متبعین اور پیرو کسی خاص مذہبی موقع پر ایک جگہ جمع نہ ہوتے ہوں۔ ان مذہبی مقامات کی زیارت یا مذہبی سفر کے لئے کچھ اصول اور طریقے اور رسوم و روایات ہیں، اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ عمل فطرت بشری کے عین مطابق اور ضمیر کی آواز کے ساتھ ہم آہنگ ہے، انسان جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں برابر کسی ایسی چیز کی جستجو اور آرزو میں رہتا ہے جس سے قریب ہو کر وہ اپنے جذبۂ عقیدت و محبت کی تسکین کر سکے وہ ایک ایسا طویل اور بڑا عمل چاہتا ہے جس سے اس کے بڑے بڑے گناہوں اور مہلک غلطیوں کی تلافی ہو سکے اور وہ ضمیر کی چبھن، مذہبی حس کی کھٹک، اور سوسائٹی کی ملامت سے چھٹکارا پا سکے، اس کے اندر ایک ایسے عظیم اور عام دینی اجتماع کی طلب پوشیدہ ہے جہاں صرف دینی اخوت اور روحانی رشتہ کارفرما ہو، کوئی دوسری اساس اور دوسرا جذبہ اس میں شامل نہ ہو، جب ہم تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی کوئی

---

[1] صحاح ستہ باستثنائے ابوداؤد (روایت حضرت ابوہریرہؓ)

قوم اور تہذیب کا کوئی دوران مذہبی سفروں، زیارت گاہوں اور مقدس و متبرک مقامات سے خالی نہیں جہاں لوگ جمع ہو کر اللہ تعالےٰ کے حضور یا اپنے خود ساختہ معبودوں اور دیوی دیوتاؤں کے لئے قربانیاں کرتے ہیں نذریں مانتے ہیں، اور چڑھاوے چڑھاتے ہیں، اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے،

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ۗ فَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَلَهُ أَسْلِمُوا ۗ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِينَ[1]

اور ہم نے ہر ایک امت کے لئے قربانی رکھ دی تھی تاکہ وہ لوگ اللہ کا نام ان چوپایوں پر لیں، جو اس نے انھیں عطا کر رکھے ہیں، سو تمہارا خدا تو خدائے واحد ہی ہے تم اسی کے آگے جھکو، اور آپ خوشخبری سنا دیجئے گردن جھکا دینے والوں کو۔

دوسری جگہ ارشاد ہے،

لِّكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ ۖ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ ۚ وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ ۖ إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُّسْتَقِيمٍ[2]

ہم نے ہر امت کے واسطے ایک طریقہ (ذبح و عبادت کا) مقرر کر رکھا ہے کہ وہ اس پر چلنے والے ہیں، سو انھیں نہ چاہئے کہ آپ سے جھگڑا کریں (اس) امر میں، اور آپ ان کو اپنے پروردگار کی طرف بلاتے رہئے، بیشک آپ ہی سیدھے راستے پر ہیں۔

آثار قدیمہ کی دریافت اور تاریخی مقامات کی کھدائی سے دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں اور تہذیبی کھنڈرات میں بھی ایسے مذہبی مقامات کا پتہ چلا ہے، تاریخ نے اس طرح کی بہت سی چیزوں کی نشان دہی کی ہے، لیکن اسکی حقیقت تک رسائی اور اس کے قوانین و احکام، آداب و تعلیمات کا علم بہت مشکل ہے، ہمیں اس سلسلہ میں ابتک جو معلوم ہو سکا اس کی حیثیت چند قیاسات یا ان منتشر اور غیر مربوط کڑیوں سے زیادہ نہیں جن سے کوئی واضح تصویر بنانا ناممکن ہے،

---

[1] سورہ حج ۳۴ [2] ایضاً ۶۷

یہودی اور اس کے بعد مسیحی مذہب اس سلسلہ میں ہم سے سب سے زیادہ قریب ہیں، انھوں نے تاریخ اور علم کی روشنی کا ایک طویل زمانہ پایا ہے، مورخین و مصنفین نے بھی ان کے ساتھ اپنی پوری دلچسپی کا ثبوت دیا ہے اور وہ اب بھی دو ایسی بڑی اور زندہ قوموں کا مذہب ہے جو تہذیب و تمدن، علم وادب، اور سیاسی قوت تینوں چیزوں میں بہت آگے ہیں، "بیت المقدس" اور اس کے قرب و جوار کے آثار و مقامات اب بھی ان قوموں کی زیارت گاہ اور مرکز عقیدت ہیں، اس کا حج ان کے ہاں بہت قدیم زمانہ سے رائج اور معروف ہے لیکن جب اس کا مقابلہ ہم اسلامی حج سے کرتے ہیں، (جس کے احکام و تفصیلات کا ایک ایک جزئیہ مرتب اور منضبط ہے) تو ہمیں اس کی تصویر بہت دھندلی، مبہم اور ناتمام نظر آتی ہے،

اس سلسلہ میں یہودیوں کے سب سے مستند ماخذ Jewish Encyclopaedia کی دسویں جلد میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا خلاصہ یہاں پیش ہے،

"بیت المقدس کا حج جس کو (Reyiah) یعنی حاضری کہا جاتا تھا۔ تین تہواروں کے موقع پر ہوتا تھا جو عید الحصاد[1] Harvest Festival عید الفصح Easter اور عید المظال Feast of Tabernacles کے نام سے موسوم تھے، یہودی ہدایات کے مجموعہ Mishnah میں ہے کہ نابالغوں، عورتوں اندھوں اور ضعفاء اور جسمانی یا دماغی امراض میں مبتلا لوگوں کے علاوہ سب کو حاضر ہونا ضروری ہے، نابالغ سے مراد ایسا بچہ ہے جس کو اس کا باپ بیت المقدس نہ لے جا سکے،

شریعت موسوی کے بموجب ہر شخص کو کچھ نہ کچھ چڑھاوا پیش کش (offering) بھی لے جانا چاہئے لیکن اس پیش کش کا تعین نہیں کیا گیا ہے،

---

[1] جولیش انسائیکلوپیڈیا میں ہے کہ اس حج میں بیت المقدس میں تمام مردوں کی حاضری ضروری تھی، دیکھئے عنوان (Pentecos)

اگرچہ عورتوں اور چھوٹے لڑکوں کی حاضری لازمی نہ تھی، تاہم وہ اپنے شوہروں اور والدوں کے ساتھ پہونچتے ہی تھے جیسا کہ عام میلوں میں ہوتا ہے،

(Gesius Florus) نے جو کہ ۶۴ تا ۶۶ء میں وہاں رہا اس طرح کہا ہے کہ (Passover) کے ایک تیوہار کے موقع پر اس نے یہودی قربانی کے میمنوں کی تعداد ۲۵۶۵۰۰ پائی، اگر ایک میمنہ کی قربانی دس افراد کی جانب سے ہوئی ہو تو زائرین کی تعداد پچیس لاکھ پینسٹھ ہزار ہوئی (یعنی ۲۵۶۵۰۰۰)

(Toseffa) کے ذکر کے مطابق ایک موقع پر بارہ لاکھ میمنوں کی ٹانگیں کاٹی گئیں جب کہ پجاری کو ہر میمنہ کی ایک پچھلی ٹانگ کے لینے کا حکم تھا، یہ تعداد غالباً ایک مبالغہ ہے،

Temple (عبادت گاہ) کی بربادی کے بعد بھی حج کا سلسلہ بند نہیں ہوا جب ترکوں نے صلاح الدین کی سرکردگی میں ۱۱۸۷ء میں بیت المقدس کا علاقہ فتح کر لیا تو مشرقی علاقے کے یہودیوں کو بیت المقدس اور دوسرے متبرک مقامات (دمشق سے بابل اور مصر تک) کی زیارت کی سہولت حاصل ہو گئی، مشرق کے یہودیوں بالخصوص بابل اور کردستان کے یہودیوں میں چودھویں صدی سے یہ رسم رہی ہے کہ سال میں کم از کم ایک بار "حج" کو جایا جائے اور بہت سے تو یہ حج پاپیادہ کرتے تھے، صلیبی جنگوں کے زمانہ میں یورپ کے یہودیوں کی بھی حج کے لئے یورپ سے آنے کی حوصلہ افزائی ہوئی۔

۱۴۹۲ء میں جب کہ یہودیوں کو (Spain) سے نکال دیا گیا اور جلاوطن یہودی کثرت سے ترکوں کے علاقہ میں آبسے تو یہودی زائرین کی تعداد بہت بڑھ گئی، اکثر اس کا اجتماع مقام (Ramah) پر پیغمبر (Samuel) کے مزار پر ہوتا تھا جہاں ان کے سالانہ عید کے میلے ہوتے اور مذہبی رسوم ادا کی جاتیں،

یہودیوں کو شکایت ہے کہ ان کے دوسرے ملکوں میں بسنے والے ہم مذہب ذوقِ حج و زیارت سے عاری ہیں، ان کے مقابلہ میں عیسائی ارض مقدس کی زیارت کرتے ہیں، حج معینہ تاریخوں میں ہوتے ہیں، شمالی افریقہ اور مشرق کے یہودی ان دنوں کو "ایام زیارت" کہتے ہیں، ان ایام میں ایسی عظیم ہستیوں کی قبروں یا ان کی یادگاروں کی زیارت کی رسم قائم ہوگئی ہے جو یا تو کوئی بڑے بادشاہ، یا نبی، یا ولی اللہ (درویش) کی حیثیت سے مشہور ہیں،

ان ایام حج وزیارت کو دعاؤں، خوشیوں اور عام تیوہاروں کی شکل میں مناتے ہیں، بیت المقدس میں ہر جمعہ کی شام کو نیز ہر روزے کے دن کی شام کو اور "تموز" کی سترہویں کی شام کو ماہ (آب) کی نویں تک متواتر ۲۳ روز تک ہر روز یہودیوں کے گروہ ہیکل سلیمانی کی مغربی دیوار کے سامنے جمع ہوتے ہیں، موخر الذکر تاریخ (یعنی آب کی نویں تاریخ کو) یہ عبادت نصف شب کے بعد ادا کی جاتی ہے،

اسکے علاوہ بھی کچھ مقامی قسم کی زیارت گاہیں اور تیوہار ہیں جہاں تقریباً ہر ملک اور شہر میں یہودی جمع ہوتے ہیں۔[۱]

جہاں تک عیسائیوں کے حج وزیارت کا تعلق ہے اس کا خلاصہ "دائرۃ المعارف مذاہب واخلاق" سے پیش کیا جارہا ہے،

"حج ایسے سفر کو کہتے ہیں جو متبرک مقامات کی زیارت کے لئے کیا جائے، مثلاً ہمارے آقا (حضرت عیسیٰؑ) کی دنیوی زندگی کے مناظر فلسطین میں، یا رہنمایان مذہب کے آستانے روما میں یا خدارسیدہ درویشوں اور شہداء کے متبرک مقامات (آستانے)

---

[۱] دیکھئے "جویش انسائیکلوپیڈیا" عنوان (Pilgrimage)

عیسائیوں کی نسل اول نے متاخرین کے مقابلہ میں حضرت عیسیٰ (نجات دہندہ) کی زندگی کے راستوں پر چلنے (انکی زندگی سے متعلق مقامات کو دیکھنے) کی ضرورت کو زیادہ محسوس نہیں کیا، تیسری صدی (عیسوی) سے یقیناً متبرک مقامات کی زیارت ہونے لگی، بہت سے عیسائیوں کو اپنے آقائے نامدار (حضرت عیسیٰ) کے بنیا یانہ ذوق (حق جوئی) اور دفن کیے جانے کے بعد قبر سے نمودار ہونے سے متعلق مقامات سے کہیں زیادہ دلچسپی رہی ہے۔ بمقابلہ ان کی تعلیمات نبوی کے۔

تیرہویں صدی سے ارض مقدس کے مقابلہ میں روما کی زیارتیں زیادہ بڑھتی گئیں، اگرچہ ارض مقدس کی زیارت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

بیت المقدس کے بعد روما (Rome) ہی وہ شہر تھا جہاں زیادہ سے زیادہ زائرین پہونچتے تھے جن اسباب نے پاپائیت کو عروج بخشا انھیں نے روما (Rome) کو ایک زیارت کا مقام بنادیا، بالخصوص سینٹ پیٹر اور سینٹ پال کی قبروں نے تو اس کو وہ عظمت بخشی کہ یہ رومن کیتھولک عیسائیوں کا مرجع بن گیا اور وہ وہاں بکثرت جمع ہونے لگے، (Catacost) جو کہ شہداء کی ہڈیوں کے باعث متبرک مقام بن گیا ہے زائرین کی خصوصی دلچسپی کا مرکز ہے۔ زائرین نے روما کی زیارت کبھی ترک نہیں کی، گرجاؤں اور متبرک یادگاروں کی کثرت نے اسکو متواتر ایک خصوصی توجہ کا مرکز رکھا ہے۔"

یہ صرف چند زیارت گاہوں اور متبرک مقامات کا ذکر تھا، نہ صرف فلسطین بلکہ ان تمام جگہوں پر جہاں یہودی اور عیسائی آباد ہیں ان قبروں، آستانوں اور درگاہوں کی اس قدر کثرت ہے کہ آدمی گھبرا جاتا ہے اور اس کی طبیعت اکتانے لگتی ہے۔

Encyclopaedia of Religion and Ethics. اور Jewish Encyclopaedia

کے "حج و زیارت" کے مقالہ نگاروں نے ان تمام درویشوں اور اولیاء کے آستانوں اور قبروں کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے اور یورپ و ایشیا میں ایسی جتنی درگاہیں ہیں اُن کی پوری فہرست پیش کر دی ہے انھوں نے ان دنوں کا بھی ذکر کیا ہے جو زیارت کے لئے مقرر تھے نیز ان رسوم و عادات اور طور طریقوں کی تفصیل بھی بیان کی ہے جو ان تیوہاروں اور متبرک مقامات کے لئے ضروری سمجھے جاتے تھے۔

ان متبرک مقامات اور آستانوں کے ساتھ اہل کتاب (یہودیوں اور عیسائیوں) کی اس درجہ وابستگی بلکہ شیفتگی، اس کے لئے طویل سفر کرنے اور ہر طرح مشقت برداشت کرنے..... نے ان کے اندر تعظیم و تقدیس کی جو مبالغہ آمیز کیفیت پیدا کر دی تھی اور ان کے دل و دماغ اور احساسات و جذبات سب کو اس میں جکڑ لیا تھا، اور ان کو بالآخر شرک اور غیر اللہ کی پرستش تک پہونچا دیا تھا، ان سب چیزوں کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا اس سلسلہ کو شدت کے ساتھ بند کرنے کا راز یہی ہے، آپ کو اس کا اندیشہ تھا کہ کہیں یہ عادت توحید کے علمبرداروں اور دنیا کی اس آخری امت میں بھی سرایت نہ کر جائے جس پر قیامت تک پوری انسانیت کی ذمہ داری ہے، آپ نے اپنی آخری آرام گاہ کو بھی ہر قسم کے شرک و بدعت اور غلو سے پاک رکھنے کا حکم دیا، اپنے مرض وفات میں آپ کو سب سے زیادہ فکر اسی بات کی تھی،

حضرت عائشہ رضؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے،

لما نزل برسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم طفق یطرح خمیصۃً لہ علی وجہہ فاذا اغتم بہا کشفہا عن وجہہ، فقال، وھو کذلک، لعنۃ اللہ علی الیھود والنصاریٰ اتخذوا قبور انبیاءھم مساجد

جب آپ بیمار ہوئے تو اکثر چادر مبارک کو چہرے پر ڈال لیتے اور جب گھبرانے لگتے تو چہرے سے ہٹا دیتے آپ نے اس حال میں فرمایا اللہ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے جنھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا دیا آپ امت کو ان کے اعمال سے

يحذر ما صنعوا[۱] ڈرا رہے تھے۔

حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا "اللہ یہود کو ہلاک کرے، انھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو مسجدیں بنالیا" حضرت عائشہؓ راوی ہیں کہ ام سلمہؓ نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے ایک کنیسا کا ذکر کرتے ہوئے جو انھوں نے حبشہ میں دیکھا تھا اور جس کا نام ماریہ تھا ان تصویروں کا ذکر کیا جو اس کے اندر تھیں آپ نے یہ سن کر فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان میں سے اللہ کا کوئی نیک بندہ یا اچھا آدمی مرجاتا تو وہ لوگ اس کی قبر پر مسجد بنا لیتے تھے، یہ لوگ اللہ کی بدترین مخلوق میں ہیں[۲]"

آپ سے یہ حدیث بھی ثابت ہے کہ "اے اللہ میری قبر کو بت نہ بنا جس کی پوجا ہونے لگے اللہ تعالے کا ان لوگوں پر سخت غصہ ہے جنھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مسجد بنا دیا[۳]"

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مقابر اور آستانوں کی زیارت کے لئے باقاعدہ سفر کرنا اور اہتمام، تیاری اور نیت کے ساتھ متبرک مقامات اور درگاہوں میں حاضری ممنوع قرار دی ہے، مشہور حدیث ہے کہ

لا تشد الرحال إلا الى ثلاثة مساجد، المسجد الحرام ومسجد الرسول والمسجد الاقصى[۴]	اہتمام وارادہ کے ساتھ باقاعدہ سفر صرف تین مساجد کے لئے جائز ہے، مسجد حرام، مسجد الرسول اور مسجد اقصیٰ

آپ نے اس ذریعہ سے اس امت کو درگاہوں اور قبروں کے اس فتنہ سے محفوظ رکھا جس نے ان کو کھلی ہوئی بت پرستی میں مبتلا کر دیا تھا،

لیکن مسلمانوں کی بہت سی جماعتوں نے آپ کی اس اہم وصیت پر پوری طرح عمل نہیں کیا جسکو آپ نے اپنے مرض وفات میں بھی فراموش نہ فرمایا تھا، وہ بھی ان درگاہوں، آستانوں اور مزاروں کے فتنہ میں پڑ گئیں، لوگ بہت دور دور سے اور بڑی مشقتیں برداشت کر کے ان مزارات پر جانے لگے ان قبروں

---

۱ صحیح بخاری ۲ روایت حضرت ابو سعید خدریؓ و حضرت ابو ہریرہؓ (مرفوع) صحیح بخاری ۳ روایت حضرت ابو سعید خدریؓ (مرفوع) صحیح بخاری ۴ صحیح بخاری۔

کے سامنے تعظیما جھکنے لگے، منتیں ماننے اور مرادیں مانگنے لگے اور ان مزاروں کے ساتھ اس قدر شیفتگی اور تعظیم کا مظاہرہ کرنا شروع کیا جو یہود و نصاریٰ کا شعار تھا اور آپ کی یہ پیشین گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہوگئی کہ "تم اپنے پہلے لوگوں کی پوری پوری اتباع کروگے وہ ایک بالشت چلیں گے تو تم بھی ایک بالشت چلوگے وہ ایک ہاتھ چلیں گے تو تم بھی ایک ہی ہاتھ چلوگے"[1]

ان مزاروں اور آستانوں نے (جن میں بہت سے جعلی اور نقلی بھی تھے) نہ صرف مسجدوں کا حق غصب کیا بلکہ بعض اوقات انھوں نے مسجد حرام اور بیت اللہ کی جگہ لینے کی کوشش کی، بہت سے جاہلوں نے ان مزاروں اور درگاہوں کو خانہ کعبہ کی طرح اہم اور مقدس سمجھ لیا، دور دور سے کھنچ کر وہاں جمع ہونے لگے ان کا عرس ہونے لگا اور ایک میلہ سا لگ گیا۔

ابن تیمیہ نے ان جماعتوں کی تصویر ایک مختصر، بلیغ اور تاریخی جملہ میں کھینچ دی ہے وہ ان لوگوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "ان کے مزار آباد و معمور، اور مسجدیں خالی اور ویران ہیں"[2]

ایک سیاح جب عالم اسلام کا دورہ کرتا ہے تو اس کو جگہ جگہ ایسے قبے، آستانے اور ضریحیں نظر آتی ہیں جن کے ساتھ بڑی بڑی زمین اور جائدادیں وابستہ ہیں اور وہاں مشرکانہ اعمال اور بدعات مثلاً سجدہ تعظیمی، منتیں اور نذریں، چڑھاوے اور قربانیاں وغیرہ بدعتوں کا بازار گرم رہتا ہے اور صاحب مزار سے اس طرح سوال وجواب کیا جاتا ہے کہ اس کو سن کر اسلام کی پیشانی عرق آلود ہونے لگتی ہے،

جہاں تک ہندوستان کے مذاہب کا تعلق ہے (جن میں بودھ مت، جینی مذہب اور برہمن ازم

---

[1] حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اگلے لوگوں کی اتباع کروگے، بالشت بالشت اور ایک ایک ہاتھ، یہاں تک کہ اگر وہ گوہ کے بل میں گھس جائیں گے تو تم بھی اس میں گھس جاؤگے، کہا گیا کہ یا رسول اللہ کیا یہود و نصاریٰ کی؟ فرمایا اور کس کی (متفق علیہ)

[2] منہاج السنۃ ج ۱ صفحہ ۱۳۰-۱۳۱

(ہندومت) سب شامل ہیں) ان میں ایسے مندروں، معبدوں، استھانوں اور زیارت گاہوں کی بڑی کثرت ہے جو بعض تاریخی و مذہبی واقعات کی وجہ سے بابرکت سمجھے جاتے ہیں، یا جہاں ان کے رشیوں، منیوں کو الہام، معرفت، نیصان یا ان کے الفاظ میں نروان حاصل ہوا، یا ان کے عقیدہ کے مطابق ان کے دیوتاؤں نے وہاں خاص طور پر "تجلی" کی (اپرکٹ ہوئے)، ان مذاہب میں میلوں ٹھیلوں، عرسوں، اور نہان واشنان وغیرہ کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

یہ مقدس مقامات، یا متبرک مزارات زیادہ تر گنگا کے کنارے واقع ہیں، جہاں ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں لوگ اشنان کے لئے جمع ہوتے ہیں، بعض نہان سال میں صرف ایک بار، بعض سال میں کئی مرتبہ اور کچھ ہر دو سال کے بعد ہوتے ہیں، بعض نہان اور میلے ایسے ہیں جن کی نوبت کئی کئی سال کے بعد آتی ہے مثلاً کمبھ کا میلہ جو بارہ سال کے بعد آتا ہے اور جس میں لاکھوں کی تعداد میں زائرین پریاگ میں جمع ہوتے ہیں۔

مذہبی مقامات، گھاٹ، مندروں اور معبدوں کی تعداد بہت ہے اور ان سب کے رسوم و رواج بھی (مذہبی فرقوں کے اختلاف کی وجہ سے) بہت مختلف ہیں،

یہ میلے دیوی دیوتاؤں کے واقعات اور میتھالوجی اور علم الاصنام کے ساتھ ملوث ہیں، ان کو دیکھ کر قرآن مجید کا اعجاز نظر آتا ہے کہ اس نے تعمیر بیت اللہ کے وقت سب سے پہلے شرک باللہ اور افسانوی روایات پر کاری ضرب لگائی ہے جس سے دوسری قوموں کے حج و زیارت کے اعمال و رسوم پوری طرح آلودہ ہیں۔

اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے،

ذٰلِكَ ۗ وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۗ وَاُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ	یہ بات ہو چکی اور جو کوئی بھی اللہ کے محترم احکام کا ادب کرے گا سو یہ اس کے حق میں اس کے پروردگار کے پاس بہتر ہوگا، اور اللہ نے حلال کر دئے ہیں تمہارے لئے چوپائے بجز ان کے کہ جو تم کو پڑھکر سنا دیئے گئے

الزُّوْرِ ○ حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ[1] سو تم بچے رہو بتوں کی گندگی سے، اور بچے رہو جھوٹی بات سے جھکے رہو اللہ کی طرف اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرکے۔

یہ دنیا کے ان اہم اور مشہور مذاہب میں حج PILGRIME کے طریقوں اور روایات و رسوم کی ایک اجمالی تصویر تھی جن کے پیرووں کی تعداد کروڑوں تک پہونچتی ہے،

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے حج کے موضوع پر کلام کرتے ہوئے اپنی کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ:۔

"حج کی اصل بنیاد ہر ملت میں موجود ہے، ان سب کے لئے ایک ایسے مقام کی ضرورت تھی جو اللہ تعالےٰ کی نشانیوں کے طور پر اور اپنے اسلاف کی طرف منسوب قربانیوں اور اعمال و مناسک کی وجہ سے ان کی نظر میں متبرک ہوں اس لئے کہ ان سے ان مقربین اور ان کے اعمال کی یاد تازہ ہوتی ہے،

اور بیت اللہ اس کا سب سے زیادہ مستحق ہے اس لئے کہ اس میں اللہ تعالےٰ کی کھلی ہوئی نشانیاں پائی جاتی ہیں، اس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا ہے جو اکثر اقوام کے روحانی مورث ہیں، انھوں نے اللہ تعالےٰ کے حکم سے ایک غیر آباد ویران مقام پر اللہ تعالےٰ کی عبادت اور حج کے لئے یہ پہلا گھر تعمیر کیا، اب اگر اس کے علاوہ کہیں اور کچھ ہے تو اس میں شرک، بدعت اور اختراع ضرور شامل ہے جس کی کوئی اصل نہیں[2]"

اگر کوئی شخص اسلامی حج کا موازنہ اور تقابل دوسرے مذاہب کے ساتھ کرے گا تو وہ بھی

---

[1] سورہ حج ۳۰-۳۱ [2] حجۃ اللہ البالغہ ج اصفحہ ۵۹

بآسانی اسی نتیجہ تک پہونچے گا اور یہ آیت اس کی زبان پر جاری ہو جائے گی،

لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُّسْتَقِيمٍ[1]

ہم نے ہر امت کے واسطے ایک طریقہ (ذبح وعبادت کا) مقرر کر رکھا ہے وہ اس پر چلنے والے ہیں سو انھیں نہ چاہیئے کہ آپ سے جھگڑا کریں (اس) امر میں اور آپ ان کو اپنے پروردگار کی طرف بلاتے رہیئے بیشک آپ ہی سیدھے راستے پر ہیں۔

حج میں اسلام کا اصلاحی کردار

اسلام نے گزشتہ تین ارکان کی طرح حج میں بھی اپنا اصلاحی و تجدیدی کارنامہ انجام دیا ہے، اہلِ جاہلیت نے حج میں بہت سی جاہلی عادات اور بہت سی بے اساس رسمیں اور بدعتیں شامل کر دی تھیں..........

.... جو حج میں کھلی ہوئی تحریف تھی، اس نے حج کے فوائد و مقاصد کو بیحد نقصان پہونچایا، جاہلی حمیت، قبائلی نخوت، قریش کا فخر و تکبر اور امتیازی برتاؤ ان تحریفات و اضافات کا سب سے بڑا محرک تھا، قرآن مجید اور شریعت اسلامی نے اس بدعت و تحریف کا خاتمہ کیا، ایک ایک بدعت کی بیخ کنی کی، اور جاہلیت کی ایک ایک خصوصیت اور ایک ایک نشان کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا اور اس سے بہتر چیز عطا کی،

جاہلیت میں قریش حاجیوں کے ساتھ عرفات نہیں جاتے تھے بلکہ حرم ہی میں رُکے رہتے تھے وہ کہتے تھے کہ ہم اہل اللہ میں سے ہیں اور بیت اللہ کے محافظ و مجاور ہیں، ان کا منشا یہ تھا کہ وہ بقیہ لوگوں سے ممتاز رہیں، اپنی پوزیشن اور حیثیت اور جو امتیاز و فوقیت ان کے خیال میں ان کو حاصل تھی اسکو برقرار رکھ سکیں، اللہ تعالےٰ نے اس جاہلی اور نسلی امتیاز کو ختم کیا اور ان کو حکم دیا کہ جس طرح اور لوگ

---

[1] سورہ حج - ۶۷

کرتے ہیں وہی وہ بھی کریں اور عرفات میں قیام کریں۔

اللہ تعالٰے کا ارشاد ہے،

ثُمَّ اَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ[1]، پھر تم وہاں جاکر واپس آؤ جہاں سے لوگ واپس آتے ہیں۔

امام بخاری اپنی سند کے ساتھ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ قریش اور وہ لوگ جو ان کے طریقہ پر تھے مزدلفہ میں ٹھیرتے تھے اور ان کو "حُمس" کہا جاتا تھا، بقیہ سب عرب عرفات میں قیام کرتے تھے جب اسلام آیا تو اللہ تعالٰے نے اپنے نبیؐ کو حکم دیا کہ عرفات جائیں اور وہاں قیام بھی کریں پھر سب کے ساتھ وہاں سے واپس ہوں اور یہی اللہ تعالٰے کا قول ہے (من حیث افاض الناس)

ابن کثیر، ابن عباس، مجاہد، عطار، قتادہ، سدّی اور دوسرے اکابر کا یہی خیال ہے، ابن جریر سے بھی یہی مروی ہے اور سب کا اس پر اجماع ہے،

عہدِ جاہلیت میں حج کا موسم ایک دوسرے پر فخر کرنے اور مناظرہ و مقابلہ کا اسٹیج بن گیا تھا، جس طرح "عکاظ" "ذوالمجنہ" اور "ذوالمجاز" کے بازار اور میلے تھے، اہلِ جاہلیت ہر ایسی تقریب اور ایسے موقع کی تلاش میں رہتے تھے جہاں قبائل کو جمع ہو کر قصیدہ خوانی اور لن ترانی کا موقع مل سکے اور اپنے آبا، و اجداد کے کارنامے بڑھ چڑھ کر بیان کئے جائیں "منیٰ کا اجتماع" اسی جاہلی جذبہ کی تسکین کا بہترین ذریعہ تھا، اس لئے اللہ تعالٰے نے اس کو منع فرمایا اور اس کا بہترین بدل عنایت فرمایا۔

ارشاد ہوا،

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَاءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ پھر جب تم اپنے مناسک ادا کر رہے ہو، تو اللہ کی یاد کرو، اپنے باپ دادوں کی یاد کی طرح، بلکہ یہ یاد

---

[1] سورہ بقرہ - ۱۹۹

ذِكْرًا ۱ؐ اس سے بھی بڑھ کر ہو۔

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ اہل جاہلیت حج کے موسم میں ایک دوسرے سے مفاخرت کرتے تھے کوئی یہ کہتا تھا کہ میرے باپ اس طرح کھلاتے پلاتے تھے اور اس طرح دوسروں کا بوجھ اٹھاتے تھے اور دوسروں کی طرف سے خوں بہا دیدیتے تھے، اپنے آبا و اجداد کے کارناموں کی توصیف کے سوا ان کا کوئی کام نہ تھا، اس وقت اللہ تعالےٰ نے یہ آیت نازل فرمائی "فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا ۲ؐ"

حج نے مرور زمانہ کی وجہ سے اپنا تقدس، پاکیزگی اور سادگی و صفائی بڑی حد تک کھو دی تھی، اور جاہلیت کے میلوں کی طرح ایک میلہ بن کر رہ گیا تھا جس میں ہر طرح کی تفریح، کھیل، تماشے اور لڑائی جھگڑے ہونے لگے تھے، اللہ تعالےٰ نے قرآن مجید میں اس کی مذمت فرمائی اور ارشاد ہوا،

فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۳ؐ تو پھر حج میں نہ کوئی فحش بات ہونے پائے اور نہ کوئی بے حکمی اور نہ کوئی جھگڑا۔

ابن کثیر کہتے ہیں کہ عبد اللہ بن وہب نے بیان کیا وہ کہتے ہیں مالک نے کہا کہ" اللہ تعالےٰ کا یہ قول وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ" یہ تھا کہ قریش مزدلفہ میں مشعر حرام کے پاس قیام کرتے تھے اور ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے تھے، ایک گروہ کہتا تھا ہم حق پر ہیں، دوسرا کہتا تھا ہم حق پر ہیں، ہمارے خیال میں یہی بات تھی باقی صحیح علم اللہ کو ہے" محمد بن کعب کہتے ہیں کہ قریش جب منیٰ میں جمع ہوتے تھے تو ایک دوسرے سے کہتا تھا کہ ہمارا حج تم سے زیادہ مکمل ہوا، دوسرے لوگ بھی اسی طرح جواب دیتے تھے،

اسی طرح عہد جاہلیت میں جب اپنے معبودوں کے لئے قربانیاں کرتے تھے تو گوشت ان معبودوں کے سامنے رکھ دیتے تھے اور خون ان کے اوپر چھڑک دیتے تھے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی،

۱و۲ؐ سورہ بقرہ - ۲۰۰ ۳ؐ ایضاً ۱۹۷

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا[۱] — اللہ تک نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون

ابن کثیر ابن حاتم سے روایت کرتے ہیں، وہ علی بن الحسین سے، وہ محمد ابن ابی حماد سے، وہ ابراہیم بن المختار سے، وہ ابن جریج سے روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "اہل جاہلیت اونٹوں کا خون اور گوشت بیت اللہ پر ڈال دیا کرتے تھے، صحابہ کرام نے یہ دیکھ کر حضورؐ سے عرض کیا کہ ہم اس کے زیادہ حق دار ہیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا — اللہ تک نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون

وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ[۲] — البتہ اس کے پاس تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔"

عہدِ جاہلیت میں ایک رواج یہ تھا کہ جب حج کی نیت کر لیتے تھے تو گھروں میں دروازہ سے ہرگز داخل نہیں ہوتے تھے اور اس کو بہت بڑا گناہ اور حج کو مجروح کرنے کے مرادف سمجھتے تھے، جب تک حالت احرام میں رہتے پیچھے سے دیوار پھاند کر گھر آتے، اللہ تعالےٰ نے اس کی بھی نفی فرمائی اور فرمایا کہ ایسا کرنا کوئی نیکی کا کام نہیں ہے،

لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا[۳]

یہ تو (کوئی بھی) نیکی نہیں کہ تم گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے آؤ، البتہ نیکی یہ ہے کہ کوئی شخص تقویٰ اختیار کرے اور گھروں میں ان کے دروازوں ہی سے آؤ،

بخاری میں عبید اللہ بن موسیٰ سے روایت ہے وہ اسرائیل سے وہ ابو اسحٰق سے وہ براء سے روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اہل جاہلیت جب احرام میں ہوتے تو گھر کے پیچھے سے داخل ہوتے تھے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

---

[۱] و [۲] سورہ حج ۳۷ [۳] سورہ بقرہ ۱۸۹

لَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا [۱]

یہ تو (کوئی بھی) نیکی نہیں ہے کہ تم گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے آؤ، البتہ نیکی یہ ہے کہ کوئی شخص تقویٰ اختیار کرے، اور گھروں میں ان کے دروازوں ہی سے آؤ۔

ابو داؤد طیالسی نے شعبہ، ابو اسحٰق، براء سے روایت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انصار میں سے کوئی شخص جب سفر سے واپس آتا تو گھر میں دروازہ سے داخل نہ ہوتا تھا اس پر یہ آیت اتری۔

ایک رواج یہ تھا کہ بعض لوگ حج کے لئے زاد سفر کا انتظام کرنا اور اپنے ساتھ سامان لے جانا گناہ سمجھتے تھے، وہ توکل کا مظاہرہ کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم اللہ کے مہمان ہیں اس لئے ہم کو زاد سفر و راحلہ کی کیا ضرورت! البتہ سوال کرنے اور بھیک مانگ کر اپنی ضرورت پوری کرنے میں ان کو کوئی عار نہ ہوتا تھا، بلکہ اس کو وہ اللہ تعالےٰ کے راستہ کا ایک مجاہدہ سمجھتے تھے، اللہ تعالےٰ نے اس سے بھی منع فرمایا اور ارشاد ہوا۔

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى [۲]

اور زاد راہ لے لیا کرو اور بہترین زاد راہ تو تقوی ہے،

ابن کثیر عوفی سے روایت کرتے ہیں وہ ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ کچھ لوگ اپنے گھر سے اس حالت میں نکلتے کہ ان کے ساتھ کچھ بھی نہ ہوتا اور یہ کہتے کہ ہم بیت اللہ کا حج کرتے ہیں کیا اللہ ہمیں نہ کھلائے گا، تو اللہ تعالےٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (تَزَوَّدُوْا) یعنی اتنا ضرور اپنے ساتھ رکھو جس سے کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے،

---

[۱] سورہ بقرہ ۱۸۹ [۲] ایضاً ۱۹۷

بخاری میں ہے کہ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اہل یمن حج کے لئے جاتے تھے تو اپنے ساتھ زادسفر نہ لیتے تھے اور کہتے تھے ہم متوکلین میں سے ہیں اس پر یہ آیت نازل ہوئی، "وَتَزَوَّدُوا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى"

اسی طرح اہل جاہلیت اس موسم میں تجارت کرنا بھی گناہ سمجھتے تھے اور ایک حلال چیز کو حرام سمجھ بیٹھے تھے، بخاری میں ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ عکاظ، ذوالمجنہ اور ذوالمجاز جاہلیت کے مشہور بازار تھے، لیکن حج کے موسم میں تجارت جرم تھی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی،

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ[1] — تمہیں اس باب میں کوئی مضائقہ نہیں کہ تم اپنے پروردگار کے ہاں سے تلاش معاش کرو،

مجاہد ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ اہل عرب حج کے ایام میں بیع وشرا اور تجارت وکاروبار سے پرہیز کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ ذکر الٰہی کے دن ہیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی "لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ"

ایک بہت برا رواج یہ تھا کہ بیت اللہ کا طواف بعض لوگ برہنہ کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم ان کپڑوں میں طواف نہیں کرتے جن میں ہم معصیت کرتے ہیں، یہ فساد عظیم کا دروازہ اور خالص جاہلی عادت تھی اس پر یہ آیت نازل ہوئی،

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ[2] — اے اولاد آدم ہر نماز کے وقت اپنا لباس پہن لیا کرو،

مسلم اور نسائی میں ابن جریر سے روایت ہے وہ اپنے الفاظ میں ابن عباسؓ سے روایت کرتے

---

[1] سورہ بقرہ - ۱۹۸ [2] سورہ اعراف - ۳۱

اہلِ جاہلیت کعبہ کا طواف برہنہ ہو کر کرتے تھے، مرد دن میں، عورتیں رات میں، عورتیں یہ شعر پڑھتی تھیں،

الیوم یبدو بعضہ او کلہ

وما بدا منہ فلا احلہ

اس پر یہ آیت نازل ہوئی "خُذُوا زِینَتَکُمْ عِندَ کُلِّ مَسْجِدٍ"

عوفی ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ (خذو ا زینتکم عند کل مسجد) کا مطلب یہ ہے کہ کچھ لوگ کعبہ کا طواف عریانی کی حالت میں کرتے تھے، اللہ تعالےٰ نے ان کو زینت کا حکم دیا، زینت وہ لباس ہے جو جسم کے قابل ستر حصوں کو چھپائے اور اس سے خوش پوشاکی بھی نمایاں ہو،

ابن کثیر لکھتے ہیں کہ مجاہد، عطاء، ابراہیم نخعی، سعید بن جبیر، قتادہ، سدّی، ضحاک، مالک اور زہری نے اس آیت کی تفسیر میں یہی مسلک اختیار کیا ہے اور ان سب کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ آیت مشرکین کے ان طبقوں کے لئے نازل ہوئی جو کعبہ کا طواف برہنہ کرتے تھے،

اس کے ساتھ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے عملی طور پر اس کو ختم فرمایا اور حجۃ الوداع سے ایک سال قبل حضرت ابو بکرؓ کو وہاں بھیجا کہ وہ اس بات کا اعلان کریں کہ کوئی برہنہ شخص کعبہ کا طواف نہ کرے۔

بخاری اپنی سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ "حجۃ الوداع سے ایک سال قبل جس وفد پر حضرت ابو بکرؓ کو آپؐ نے امیر بنا کر بھیجا اس کو یہ ہدایت کردی کہ قربانی کے روز یہ اعلان کردے کہ اس سال کے بعد اب کوئی مشرک حج نہ کرے اور کوئی برہنہ شخص بیت اللہ کا طواف نہ کرے[1]"

---

[1] صحیح بخاری کتاب (باب حج ابی بکرؓ رضی اللہ عنہ بالناس)

بعض اہل جاہلیت کا عقیدہ یہ تھا کہ صفا و مروہ کا طواف نہ کرنا چاہیئے اس پر یہ آیت نازل ہوئی،

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ[1]

صفا و مروہ بیشک اللہ کی یادگاروں میں سے ہیں سو جو کوئی بیت (اللہ) کا حج کرے یا عمرہ کرے اس پر (ذرا بھی) گناہ نہیں کہ ان دونوں کے درمیان آمدورفت کرے۔

عروہؒ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے ایک مرتبہ ان سے پوچھا کہ آیت "اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا" کا مطلب کیا ہے؟ میں نے کہا کہ اس کا مطلب یہی ہے کہ جو ان کا طواف کرے اس پر کوئی گناہ نہیں، حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ میرے بھانجے تم نے بالکل غلط کہا، اگر اس کو اس مفہوم پر محمول کیا جائے جو تم کہہ رہے ہو تو آیت کو اس طرح ہونا چاہیئے تھا" فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ لَّا يَطَّوَّفَ بِهِمَا) یہ آیت اس طرح نازل ہوئی کہ انصار اسلام سے پہلے اس (مناۃ) کے لئے تہلیل کرتے تھے، جو (مشلل) کے پاس واقع ہے جو اس کی تہلیل کرتا تھا صفا و مروہ کے طواف کو بُرا سمجھتا تھا پھر انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارہ میں دریافت کیا اور کہا ہم جاہلیت میں صفا و مروہ کا طواف کرنا برا سمجھتے تھے اس پر یہ آیت نازل ہوئی (ان الصفا والمروۃ من شعائر اللہ فمن حج البیت او اعتمر فلا جناح علیہ ان یطوف بہما)، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے طواف کی سنت جاری فرمائی اب کوئی اس کو ترک نہیں کرسکتا (صحیحین) امام بخاری محمد بن یوسف سے وہ سفیان سے وہ عاصم بن سلیمان سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے انسؓ سے صفا و مروہ کے بارہ میں دریافت کیا، انھوں نے جواب دیا کہ ہم اس کو پہلے جاہلیت کی نشانیوں میں سمجھتے تھے جب اسلام آیا

---

[1] سورہ بقرہ - ۱۵۸

توہم نے اس کو جاہلیت کی بات سمجھ کر ترک کر دیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی (اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ)

شریعت اسلامی نے ان دوررس اور اہم اصلاحات کے ذریعہ اس عظیم رکن کو وہ ابراہیمی اصل اور حقیقی و پاکیزہ شکل درحقیقت دوبارہ عطا کی ہے جو ہر قسم کی تاویل و تحریف، آمیزش، ملاوٹ اور فریب کی دسترس سے دور اور ہر طرح مکمل اور محفوظ ہے[1]،

---

[1] حج کی اسلامی اصلاحات کے باب میں "سیرۃ النبی جلد پنجم" سے استفادہ کیا گیا ہے،

اشاریہ

(انڈکس)

مرتبہ
محمد غیاث الدین ندوی

اشخاص

س

ش

کتابیات

(الف)

(سنن) ابن ماجہ ــــ ۸۰، ۱۹۲، ۳۰۲، ۳۳۹

(سنن) ابی داؤد ــــ ۲۹، ۳۶، ۳۷، ۵۳، ۵۹، ۶۴، ۷۰، ۷۱، ۷۷، ۷۹، ۸۰، ۹۹، ۱۱۰، ۱۱۵، ۱۴۲، ۱۴۹، ۱۹۲، ۲۰۴، ۲۴۶، ۲۵۵، ۲۶۹، ۲۷۵، ۳۰۷، ۳۴۴

الآثار الباقیہ عن القرون الخالیہ ــــ ۲۴۴، ۲۴۵

احکام القرآن (ابن العربی) ــــ ۱۳۸، ۱۴۰، ۱۸۷

احکام القرآن (جصاص) ــــ ۱۳۸

احیاء العلوم ــــ ۲۰۷، ۲۳۲، ۲۷۳، ۲۹۷، ۳۰۲، ۳۰۵

احبار ملاحظہ ہو سفر احبار

الأدب المفرد ــــ ۲۰۷، ۲۰۸

ازالۃ الخفا ــــ ۱۹۱

اشتراکیۃ الاسلام ــــ ۲۰۸

اصحاح ــــ ۲۵۰

انجیل ــــ ۸۹، ۹۰، ۱۸۰

انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر ــــ ۲۲۹

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ــــ ۱۷۳، ۲۳۵

انسائیکلوپیڈیا مذاہب و اخلاق ــــ ۸۶، ۹۶، ۱۶۴، ۱۷۵، ۱۸۱، ۲۳۹، ۳۴۸

اوسط طبرانی ــــ ۱۶۱، ۲۶۹

(ب)

البحر المحیط ــــ ۱۵۶

(صحیح) بخاری ــــ ۲۵، ۲۹، ۶۰، ۶۷، ۶۹، ۷۰، ۷۳، ۸۱، ۱۰۳، ۱۰۷، ۱۰۹، ۱۱۱، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۳۰، ۱۷۴، ۱۹۰، ۱۹۱، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۵، ۲۰۷، ۲۴۳، ۲۴۸، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۴، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۴، ۳۳۴، ۳۵۱، ۳۵۸، ۳۶۰، ۳۶۱

البدائع والصنائع ــــ ۱۹۷

البدایہ والنہایہ ــــ ۴۴، ۱۰۵، ۲۰۶

مقامات

ادارے

INDEX